

پروانہ

علیم الحق حق



حسب معمول ناشتے سے فارغ ہو کر سجاد نے دفتر جانے کی تیاری شروع کی۔ لباس تبدیل کر کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹائی کی ٹاٹ لگاتے ہوئے اس نے اپنا جائزہ لیا۔ خود ستائی کئے بغیر وہ خود کو نہایت آسٹائی سے خوب رو اور وجہ کہہ سکتا تھا۔ 32، 33 کی عمر کے بلوجود وہ ابھی تک نوجوان لگتا تھا۔ چاہنے کے باوجود لباس کے معاملے میں وہ اہتمام نہیں کرتا تھا۔ وہی عام سا سوٹ جو دفتری ایگزیکٹوز کا مروجہ لباس ہے۔ روز وہ اسی طرح کا کوئی سوٹ پہن کر دفتر جاتا تھا۔ بس سوٹ کا رنگ بدلتا رہتا تھا۔ گرمیاں آتیں تو کوٹ جسم سے جدا ہو جاتا مگر ٹائی سے چھٹکارا نہ ملتا۔ انگریز اپنے پیچھے کیسی کیسی لعنتیں چھوڑ گئے ہیں۔

لباس کے معاملے میں جو وہ اہتمام نہیں کرتا تھا تو اس لئے کہ وہ عقل مند تھا۔ جانتا تھا کہ بیویاں بہت شکلی ہوتی ہیں۔ اور قدسیہ تو اس معاملے میں عام بیویوں سے بھی دس ہاتھ آگے تھی۔ اس لئے وہ بہت محتاط رہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ ادھر شیطان کا نام لو اور ادھر وہ حاضر۔ آئینے میں قدسیہ کا عکس ابھر آیا۔ وہ اسے پتہ نہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”ہو گئے تیار؟“ اس نے پوچھا۔ ”ارے ہماری تیاری کیل۔ دس منٹ لگتے ہیں تیاری میں۔“ سجاد نے آہ بھر کے کہا۔

”تو زیادہ دیر لگا لیا کریں۔ اتنی حسرت سے کیوں کہہ رہے ہیں۔“ قدسیہ شوخ لہجے میں بولی۔

”تمہاری صحت بہت عزیز ہے مجھے۔“

”میری صحت سے اس کا کیا تعلق؟“

”میں اہتمام سے تیار ہونے لگا تو تم دن میں بلڈ پریشر کی رات میں بے خوابی کی مریض بن جاؤ گی۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ کو جانتی ہوں میں۔ آپ کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔“ قدیرہ کے لمبے میں غر تھا۔

”جیسی اس روز شادی میں بے چاری روئینہ سے الجھنے لگی تھیں۔“ سجاد نے اسے یاد دلایا۔

قدیرہ کھیا گئی۔ ”وہ اور بات ہے۔ وہ ریشہ عظمیٰ ہوئی جاری تھی آپ پر۔ تو کیا میں تماشا دیکھتی رہتی۔ مجھے ایسی عورتیں ابھی نہیں لگتیں۔ اور اس روز بھی آپ پر شک تو نہیں تھا مجھے۔ آپ پر تو بڑا اعتبار ہے مجھے۔“

”تو ہونے دیتیں اسے ریشہ عظمیٰ مجھ پر۔ یک طرفہ ایفیر میں کیا حرج ہے۔“

”آدی کو نہکتے دیے نہیں لگتی۔ ترغیب ہوئی ہی نہیں چاہئے۔“

”بس یہی اعتبار ہے مجھ پر؟“ سجاد نے شکایت کی۔

”اعتبار اپنی جگہ۔ میں تدبیر کی قائل ہوں۔ میں نے تو ایسا بندوبست کیا ہے کہ آپ عبر بھر مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔ گنجائش ہی نہیں ہے آپ کے پاس۔“

”سب تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں وقت آنے پر۔“ سجاد نے اسے اکسانے کی کوشش کی۔

”چھوڑیں اس باتوں کو۔ فریوم کیوں نہیں لگاتے آپ۔“

”تمہارے ڈر سے۔ فریوم لگاؤں گا تو کس کوگی.... کسے پیسے کی بو سے پچھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

قدیرہ کھیا ہی نہی ہنسنے لگی۔ پھر اس نے فریوم کی ایک شیشی نکال کر خود سجاد کے لگائی۔

”اور اب خود ہی کسی کو پیسے کی بو سے پچھانے کی کوشش کر رہی ہو۔“ سجاد نے اسے اچھیڑا۔

”جی نہیں۔ یہ خاص قسم کی خوشبو ہے۔“

”کیا خاصیت ہے اس میں بھلا؟“

”اسے میں لگائی بھائی کئی دلی خوشبو کتے ہوں۔“ قدیرہ نے بے حد تنجیدگی سے کہا ”اب آپ کسی کے قریب جائیں گے تو یہ اس کی خوشبو جذب کر لے گی اور جب

آپ واپس آئیں گے تو اسے مجھ تک پہنچا دے گی۔ اور اس کے بعد تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اس چیز کی خیر نہیں۔“

”اس چیز کی تو خیر ہی خیر ہے۔“ سجاد نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”وہ ہے ہی ایسی۔“



وہ مڑا تو قدیرہ نے اس کا کونٹ ایک جگہ سے مسکا ہوا دیکھا۔ ”تائیس اسے۔ میں استری پھیر دیتی ہوں ایک منٹ میں۔“

”رہنے دو۔ دیر ہو رہی ہے۔“ سجاد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”تائیس۔ مردوں کا حلیہ دیکھ کر ہی لوگ ان کی بیویوں اور ازودواجی زندگی کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں بلاوجہ کیوں خود کو بدنام ہونے دوں۔“

اس کے اصرار پر سجاد نے کوٹ اتار دیا لیکن وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات تو بتائیں۔“ قدیرہ نے استری کرتے کرتے کہا۔ ”آپ اپنے کاروبار کے مالک ہیں۔ دفتر میں سب آپ کو جواب دہ ہیں۔ آپ کسی کو جواب دہ نہیں۔ پھر وقت کی پابندی کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے آپ کو؟“

”دوسروں سے عمل کروانے کے لئے پہلے خود عمل کر کے دکھانا پڑتا ہے۔ کام لینے کے لئے کام کرنا ضروری ہے۔ ویسے بھی میں ڈپلن کا آدی ہوں۔ زندگی میں بے ترتیبی اور بے قاعدگی مجھے پسند نہیں۔ زندگی کو ہموار اور پرسکون ہونا چاہئے۔۔۔“

”اور اچانک پن اور قہرل سے محروم۔“ قدیرہ نے جلدی سے نکلا لگایا۔ پھر اس کی طرف کوٹ بوسھا دیا۔ ”یہ لیجئے۔ دو منٹ کی بات تھی۔“

”تمہاری خاطر اتنا تو بدل لیا خود کو۔“ سجاد نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

”شکریہ جناب۔ اور ہم نے جو خود کو اس سے زیادہ بدل لیا.... صرف آپ کے لئے۔“

”میں بہت شکرگزار ہوں۔“

قدیرہ نے بریف کیس اٹھا کر اسے دیا۔ بریف کیس اٹھانے وہ دروازے کی طرف بوسھا۔ اچانک منہی مریم اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ ”کیا بات ہے گریزا۔“ اس نے جبکہ اس کا سر تھپتھپایا۔

سجاول نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ”ہو جائے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”پہلے ہم اپنی بیارائی کو تھوڑی سی سیر کرا لائیں۔“

”بس یہی تو حماقتیں ہیں۔ آپ کا بس پلے تو دو دن میں بچوں کو بگاڑ کر رکھ دیں۔“ قدسیہ کے لیے میں بھیجا ہوا تھی آنکھوں میں فاطمہ چمک تھی۔ ”ابھی کتبہ رہے تھے کہ بے قاعدگی پسند نہیں۔ اور اب۔۔۔“

”نتیجہ ہے قاعدگی میری زندگی کا ضابطہ ہے۔“ سجاول نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ ”میں ابھی آیا۔“



لوسی تقریباً بھاگ رہی تھی۔ رہنا کے لئے اس کا ساتھ دینا مشکل تھا۔ ”اے لوسی۔۔۔ اتنا بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔“ اس نے پکارا۔

لیکن لوسی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اسی طرح چلتی رہی۔ نہ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نہ کوئی جواب دیا۔

”پاگل ہے۔ ایک دم پاگل۔“ رہنا کھائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی ”اب طیر لوکل نہیں ملے گا۔ چاہے اولہک سمجھ کر دوڑ لے۔“ اس نے اپنے قدم اور ست کر لئے۔ تیز چلنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ لاندھی لوکل کو 45 منٹ بعد آنا تھا۔

پھر اس نے آگے ہی آگے بھاگی ہوئی لوسی کو ایک دم رکے دیکھا۔ کہاں تو وہ بھاگ رہی تھی اور کہاں بت بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اچانک طیر لوکل کا انجن اور اس کے پیچھے بوگیاں جاتی نظر آئیں۔ زین ٹھیک وقت پر اسٹیشن سے نکلی تھی۔

رہنا اپنے معمول کی رفتار سے چلتی اس تک پہنچی۔ ”خالی پہلی بھاگی تھی تو۔ اپن گھر سے ہی لیٹ چلے تھے۔“ اس نے لوسی کو دلاسا دیا۔ جو ابھی تک بت بنی کھڑی تھی۔

”اب ٹیکسی کینی پڑے گی۔“ لوسی نے خود کھائی کے انداز میں کہا پھر رہنا کی طرف مڑی۔ ”او کے۔ ٹیکسی کریں گے۔ فنی فنی۔ او کے؟“

”ارے کیسا فنی فنی۔ میں پونے نو والی لوکل سے جاؤں گی۔ میرے کو لیٹ

”ابو۔۔۔ میں بھی نکلوں دی آپ تے تھا تھ۔“ مریم نے تلتاے ہوئے کہا۔

سجاول نے بڑی بے بسی سے قدسیہ کو دیکھا۔ بچوں کے معاملے میں وہ بے حد نرم تھا۔ ان کی نفی مٹی، معصوم سی اور نامکمل العمل خواہشوں کو بھی رد نہیں کر سکتا تھا۔ بچوں کو نفی میں جواب دینا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ قدسیہ یہ بات خوب سمجھتی تھی۔ اس لئے ایک اچھی پیوی کی طرح اس نے ڈانٹ ڈپٹ کا شعبہ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ کبھی کبھار اپنے اس اختیار کا مظاہرہ وہ سجاول پر بھی کر دیتی تھی۔

اس وقت بھی قدسیہ اس کی مدد کو آگے بڑھی۔ ”مریم۔“ اس نے آنکھیں نکالنے ہوئے سخت لیے میں کہا۔ ”تمہیں پتہ ہے ابو دفتر جا رہے ہیں۔“

”کم از کم تم کو مجھے ابو نہ کما کرو۔“ سجاول نے شرر نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

قدسیہ بری طرح جھینپ گئی۔ اس کے رخسار دپکنے لگے۔ ایسے میں سجاول کو وہ بیشہ بے حد حسین لگتی تھی۔

”میں بھی دفتر آؤں دی۔“ مریم نے ضد کی۔

قدسیہ کو غصہ آگیا۔ ”فضول باتیں نہ کیا کریں بچوں کے سامنے۔ میری بات کا اثر زائل کر دیا۔ اب خود جھٹکتیں۔“

سجاول نے سر جھکا کر دیکھا۔ مریم نے اس کی چیٹ کے پانچے چھوڑ دیئے تھے۔ لیکن وہ سر اٹھا کر امید بھری نگاہوں سے اسے تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں معصوم التجائیں چمک رہی تھیں۔ سجاول کو بے ساختہ اس پر پیار آگیا۔ اس نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ ”بیٹا۔۔۔ آپ دفتر تو نہیں جا سکتیں۔ ہاں ہم آپ کو سیر کرا کر لاسکتے ہیں۔ تو ایک شرط ہے۔“

”تیا ابو۔“

”تو ہم آپ دفتر جانے کی ضد نہیں کریں گی۔“

”نہیں۔۔۔ میں ہی ابو۔“

”مریم! کو، میں لئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔“ ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ کہاں لئے جا رہے ہیں اسے۔ دفتر کو دیر ہو جائے گی۔“ قدسیہ نے اسے پکارا۔

میز پر ہے۔ چاکلیٹی میو ہے وہ تو ذرا غور سے دیکھ لو تو یہاں کچھ ہونے لگے۔ "لوسی نے دل پر ہاتھ رکھ کر دکھایا۔

"تو پھر ڈانٹا ہوت ہوئیں گے۔"

"بالکل نہیں۔ اس نے تو کسی سے کبھی سخت بات بھی نہیں کی۔ ہنس کر مٹا ہے۔۔۔ خوش اخلاق ہے۔"

"تو پھر تو اتنا کائے کو ذرتی اس سے۔"

"اے ڈسٹن پسند ہے۔ خود عمل کر کے دکھاتا ہے۔ ٹھیک نو بجے دفتر آ جاتا ہے۔ تو پھر ہم لوگ لیٹ کیسے ہوں۔"

"مکھوورت بھی ہے، پیسے والا بھی ہے۔ اتنے بڑے کاروبار کا مالک بھی ہے۔" رٹا نے پر خیال لہجے میں کہا۔ "اور تو اس کی سکرٹری ہے۔ اور تیرے مالک حسین لڑکی اپن نے دیکھی نہیں۔۔۔"

"میرے دفتر میں دس لڑکیاں ہیں اور سب مجھ سے بڑھ کر حسین۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔" لوسی کے لیے میں ہلکی سی تضحکی تھی۔

"پر سکرٹری تو قوی ہے۔ تیرے کو لین ماری تیرے پاس نے کبھی؟"

لوسی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کبھی نہیں۔"

"اور تو نے؟" رٹا نے اسے بت غور سے دیکھا۔

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ ج بن کے جاتی ہوں۔ اسٹائل دیتی ہوں۔۔۔ لک دیتی

ہوں۔ پر وہ تو پھر ہے پتھر۔ پتھر۔ He has a stone in place of his heart" لوسی نے اواسی سے کہا۔ "میں نے پچھلی نوکری اس لئے چھوڑی کہ پاس کہتا تھا، سکرٹری آدمی وانف ہوتی ہے۔۔۔ فل ٹائم سکرٹری، پارٹ ٹائم وانف۔ اب یہ نوکری دل نوٹنے کی وجہ سے چھوڑ دوں گی۔"

"پاس اتنی لڑکیوں میں کسی کو بھی لین نہیں مارتا؟" رٹا نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ سب لڑکیاں اسے لائن مارتی ہیں۔ پر وہ کسی کو دیکھتا بھی نہیں۔"

"میریارہ لڑکیاں۔ سب تجھ سے مکھوورت۔ ایک سے بڑھ کر ایک اور کسی کا دال نہیں گھٹ۔ تیرا پاس پھرشت ہوئیں گا سالا۔"

ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"مجھے تو پڑتا ہے۔ میرا پاس۔۔۔"

"تو پھر تو ٹیکسی میں جا۔ میرے کو ٹیکسی میں جانا ہی نہیں۔ اکھا بھارتو دے تو چلتی ہوں۔"

"نور۔۔۔ لوسی نے پاؤں پٹختے۔

"دیکھ نا۔ تجھے جلدی پہنچتا ہے۔ ٹیکسی میں تو اکیلی جائے یا میں بھی جاؤں، تیرے کو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا نا۔ بھارتو اتنا ہی بنے گا۔" رٹا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اکیلی جاؤں گی۔ تم تجس نکھی چوس۔"

"دیکھ ٹیکسی ساڑھے آٹھ سے پہلے ہی پہنچا دینے کا۔ اپن واں کینے نیویارک میں تجھ کو کافی چائے گا۔۔۔ گرما گرم کافی۔ اوکے۔"

لوسی نے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور سے بات کرنے کے بعد اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ رٹا دوبہری طرف کا دروازہ کھول کر اس سے پہلے ہی ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی۔ "یو۔۔۔ آؤٹ۔" لوسی نے مٹھیاں ہنچتے ہوئے کہا۔

"گرما گرم کافی، اوکے۔" رٹا نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا پھر ڈرائیور پر برس پڑی "اے میں، چلانے کا کرت نہیں۔ گولی کا مالک چلاؤ۔ ہم لوگ آٹھ بجائیں پر دفتر پہنچنا

ماگنا۔ ہائی ایکسی لیٹر۔"

ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی بات اتنی بری لگی کہ اس نے گاڑی کو ہوائی جاز بنا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آٹھ بج کر میں منٹ پر وہ دونوں کینے نیویارک میں بیٹھی تھیں۔ بھاپ اڑاتی کافی کی پیالیاں ان کے سامنے رکھی تھیں۔ لوسی بار بار گھڑی دیکھے جا رہی تھی "اے۔۔۔۔۔ ای تو بہت ٹیم پڑا ہے۔" رٹا نے تقریباً اُسے ڈانٹا۔ "وہ سامنے ای تو دفتر ہے تیرا۔"

"ہا ہے مجھے۔" لوسی نے چڑ کر کہا۔

"اے لوسی۔۔۔ ایک بات بول۔ تیرا پاس بوت ڈراؤنا ہے۔ جالم ہے۔"

"ارے نہیں۔" لوسی نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ "وہ تو بہت پنڈ سم اور ویل

سن کے دفاتر تھے۔



اگلی صبح مریم سب کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ سجاد کا معمول تھا کہ وہ اپنے بیٹے راشد کو اسکول چھوڑ کر آتا تھا اس کے بعد ناشتہ کر کے لباس تبدیل کرتا تھا۔ راشد کے اسکول کا وقت ساڑھے سات بجے کا تھا۔
کار کی چابی سجاد کے ہاتھ میں دیکھ کر مریم مچل گئی۔ ”ابو... میں بھی داؤدی احول۔“ اس نے ضدی پن سے کہا۔
”تم نہیں جاسکتیں اسکول۔ ابھی بہت چھوٹی ہو۔“ تدریس نے اسے سمجھایا۔
”بھائی بھی تو تھوڑے ہیں۔ پھر وہ تین داتے ہیں احول۔“ ننھی مریم نے اعتراض کیا۔

”بھائی چھوٹے نہیں، تم سے چار سال بڑے ہیں۔“
سجاد نے جبکہ کر مریم کو گود میں اٹھالیا۔ ”نکریا... نکریا... تم ہماری طرح اسکول جایا کرو۔ ہمارے ساتھ۔ دیکھو، ہم جاتے ہیں۔ اسکول گائیڈ دیکھتے ہیں اور واپس جاتے ہیں۔ ایسے ہی تم بھی کرنا۔“
”قیمت ہے ابو۔“

اسی وقت کمرے کی طرف سے راشد نمودار ہوا۔ ”ابو... میں تیار ہو گیا۔“ اس کی نظر سجاد کی گود میں لدی مریم پر پڑی تو وہ ہنرک کر بولا۔ ”تائیں اس چڑیل کو۔“
”چڑیل نہیں، یہ تو میری پری ہے۔“ سجاد نے کہا۔ ”اور میرے ساتھ اسکول جا رہی ہے۔“

”ہنس... بڑی آئی اسکول جانے والی۔ جاہل ہے۔ اسے تو الف ب بھی نہیں آتی۔“
”جاہل نہیں، ہاں ان بڑھ ہے ابھی۔“ سجاد نے ہنستے ہوئے تھجج کی۔ ”اور وہ بھی اس لئے کہ ابھی صرف ڈھائی سال کی ہے۔ اگلے سال سے یہ بھی اسکول جانے لگے گی۔ اچھا اب چلو۔“

وہ چلے گئے۔ راشد کو اسکول چھوڑ کر وہ واپس آیا تو مریم اس کے کندھے پر

”نہیں۔“ لوسی نے سر ہلایا۔ ”کیس ایک جگر تو اس نے چلایا ہوا ہے... دفتر سے باہر۔“

”تیرے کو کیسے مالوم پڑا؟“
”ہفتے میں ایک دن ڈینچن کا پابند ماس سب اصول توڑ دیتا ہے۔ اس روز دفتر آتا ہے تو صبح ہی سے ایکسائٹ ہو جاتا ہے۔ ہر کام ہائینڈل کرتا ہے۔ ساڑھے بارہ بجے دفتر سے نکلتا ہے... لڑکوں جیسے شرخ کپڑوں میں۔ حالانکہ دفتر پرنس مین والے سوٹ میں آتا ہے۔ پھر وہ چار بجے واپس آتا ہے... کوئی ٹیوننگ لگتا ہوا... آپ ہی آپ مسکراتا ہوا۔ مجھے پتہ ہے، کسی سے چھپ کر مٹا ہے وہ۔ اس دن وہ ٹھیک وقت پر دفتر سے اٹھ جاتا ہے گھر جانے کے لئے۔ چاہے کتنا ہی کام پڑا ہو۔ بیوی چار بجے فون کر کے پوچھتی ہے۔ کبھی کام زیادہ ہو تو بول دیتا ہے... آج لیٹ ہو جاؤں گا۔ پر جس دن بن سنور کر واپس جاتا ہے اس دن بیوی کو بولتا ہے... نہیں جان... ساڑھے پانچ بجے گھر پہنچ جاؤں گا۔ مکاری کرتا ہے کہ نہیں چوری پکڑی نہ جائے۔“ اب لوسی سوچ رہی تھی کہ اس روز وہ بریف کیس میں اپنے وہ کپڑے لانا ہو گا۔

”تب تو ٹھیک ہے۔ اچھا آئی ہے... ہومن... ہمن ہومن۔“ رٹا نے طمانیت سے کہا۔ فرشتے اسے بہت بڑے لگتے تھے۔ اچانک اس کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔ ”اے لوسی، تو اسکی دانف کو انعام کر دے نا۔“

”میں کیوں کروں۔ انکو مجھے نہیں ملتا تو کیا۔ جس کے نصیب میں ہے، اسے ملتا ہے۔ تو میں کیوں کھنا کروں۔“

”اے لوسی... تو اپنا نام نہ بتانا۔ پر کال تو کر اس کی بیوی کو۔ بجا آئے گا۔“
لوسی سوچ میں پڑ گئی۔ بات سکرٹری شپ کے اصول کے خلاف تھی۔ باس کو پتہ پتا تو نہ لڑی جانی ہی جانی ہے۔ مگر کلام کال تو کی جاسکتی ہے۔ اچانک اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ وہ ہلکا کر اٹھ گئی۔ ”لو کال... اے۔ از ایٹ ففٹی فائیو۔“

”اے سن تو...“

”پے منٹ تھیں کرنی ہے۔ آر دینک میں چلی۔ بائے۔“ لوسی پر س بھلائی ہوئی ریپورٹ سے نفی اور خیر قدموں سے اس نے عمارت کی طرف بڑھ گئی جس میں فواد ایٹم

خوشی اور شرارت تھی۔

قدیر نے جلدی سے اسے گود میں لے لیا۔ ”تم ابو کو تنگ کرتی ہو گزلیا؟“ اس نے مریم کا رخسار چومتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ مریم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بڑی مصویت سے کہا۔

قدیر مریم کو گود میں لئے لئے پورچ تک آئی۔ سجاو کار میں بیٹھنے لگا تو اس نے پوچھا ”شام کو جلدی آئیں گے؟“

سجاو نے اٹھتے ہی سر ہلا دیا۔ ا



کار کو گیسٹ سے گزارتے ہوئے سجاو نے سرگھما کر دیکھ لیا۔ بیوی اور بیٹی دونوں ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ خدا حافظ کہتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے ایک لمحے کو گاڑی روکی۔ مریم کا ننھا منا ہاتھ ہلنے دیکھ کر اس کے دل میں عجیب سی خوشی پھیلنے لگی۔ زندگی کس قدر خوب صورت تحفہ ہے خدا کا۔ اس نے بے حد سرشار ہو کر سوچا۔ پھر اس نے جواباً ہاتھ ہلایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

تمام راستے پر سکون انداز میں، مخصوص رفتار سے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ بڑی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ بہت سرشار تھا وہ۔ خوشگوار ازدواجی زندگی کتنی بڑی نعمت ہے۔ محبت کرنے والی بیوی۔ پیارے پیارے بچے اور پرسکون گھر۔ اور کیا چاہئے آدمی کو۔ اس کا دل شکر گزاری سے معمور ہو کر چمک اٹھا۔

لیکن دفتر والی بلڈنگ میں قدم رکھتے ہی وہ تکریدیل گیڈ۔ اب اس کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی تھی۔ آفس میں داخل ہونے کے بعد لوگوں کے سلام کا جواب دیتا وہ ادا اپنے کمرے کی طرف بڑھتا رہا۔ آؤڑ روم میں اس کی سکرٹری لوسی اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لگھوٹ بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری۔ ”گڈ مارننگ سر۔“ لگھوٹ اس کے لمبے سر بھیجی تھی۔

”مارننگ۔“ سجاو نے خشک لمبے میں کہا اور اسے دیکھے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے بیٹھے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ”تم ان پلیز۔“ اس نے پکارا۔

چڑھی ہوئی تھی۔ ”چلو۔۔۔ اب ہاشتا کرتے ہیں۔“ اس نے مریم کو کندھے سے اتارا۔ مریم کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں، جیسے چندا ماموں اس کی جھولی میں اتر آئے ہوں۔“

سجاو نے گود میں اٹھا کر اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ ”اب تو خوش ہے میری شہزادی؟“ مریم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کی آنکھوں کی جگہ لگات اور بڑھ گئی۔ اور جب سجاو برابر والی کرسی پر بیٹھا تو مریم نے کرسی پر کھڑے ہو کر اس کی پیشانی چوم لی۔ ”آپ بہت اچھے ہیں ابو۔“

قدیر پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔ ”سچ آپ بہت بگاڑتے ہیں بچوں کو۔“ اس نے خفگی سے کہا لیکن اس کی آنکھیں کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔ سجاو ان آنکھوں کی زبان خوب سمجھتا تھا۔

”بچوں کے سامنے ایسی نظروں سے نہ دیکھا کرو۔“ وہ بولا اور قدیر جھینپ گئی۔ ہاشتا کرتے ہوئے قدیر نے کہا۔ ”مریم کے جلدی اٹھ جانے سے آج تک کی مرتب زندگی بے ترتیب ہونے سے بچ گئی۔ اب یہ آپ کو تنگ نہیں کرے گی۔“

”یہ خود سے نہیں اٹھی ہے۔ میں نے بگایا ہے اسے۔“ سجاو نے کہا۔

”اوہ۔ اور کل جب آپ دفتر لٹ بیٹھے تو کیا ہوا؟“

”میں لیٹ پچھا ہی نہیں۔ دو شارٹ کٹ لگائے اور اپنی مقرر کردہ تیز رفتاری کی حد سے تجاوز کیا۔ پچھا میں وقت پر۔“

”گویا زندگی میں قہر آگیا چند منٹ کو۔“ قدیر نے خوشی سے کہا۔ ”مگر ایک بے قصدی کی سوزندہ ہوئی آپ سے۔ ڈسپلن تو ٹوٹا۔“

”ہاں۔ بچوں کی خاطر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور سچے اس معاملے میں اپنی ماں پر گئے ہیں۔ انہیں بھی میرے ڈسپلن سے دشمنی ہے۔“

”یہ بات نہیں۔ میں تو خود آپ کے ڈسپلن کی پابندی کرتی ہوں۔“

”سو سنار کی ہماری اور ایک لوبار کی تمہاری۔“ سجاو نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔“

مریم پھر اس کی گود میں لٹک گئی۔ ”آپ آد نہیں دائیں ابو۔“ اس کے لمبے میں

بھی بن سکتی ہوں۔“

جلو نے بڑی کڑی نگاہوں سے اسے گھورا۔ ”وائف وائف ہوتی ہے۔ یا ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ہے۔ وہ کوئی چکن یا کھانے کی پلیٹ نہیں ہوتی کہ کہہ دیا کہ کوائرز لے آؤ یا ہٹ لے آؤ۔“

”سوری سر۔“ لوسی کی پیشانی پر ہلینہ پھرت پڑا۔

”اور اس کے لئے تمہیں یہ جاب چھوڑ کر کسی ڈھنگ کے دفتر میں جاب تلاش کرنا ہوگی۔“ جلو نے سرد لہجے میں کہا۔

مگر وہاں محبت نہیں ہوگی۔ لوسی نے دل میں کہا مگر پاس سے کچھ اور کہا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا سر۔ وہ آپ نے اتنا آل آف سٹن پوچھا۔۔۔“

”فریو۔۔۔ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے سامنے لاکھوں کیا کروڑوں کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ اچھا یہ بتاؤ، لپائنٹ منٹ کس وقت کا ہے؟“

”دو بجے کا سر۔“ لوسی نے خطرہ مٹ جانے پر سکون کی سانس لی۔

”میں رحمن صاحب سے بات کروں گا۔ وہ دیکھ لیں گے۔ اور کچھ۔“

”اور کچھ ضروری خط ہیں سر۔ آپ نے کہا تھا آج ڈکٹیشن دیں گے۔“

”ممکن ہوا تو میں مشین پر ریکارڈ کر دوں گا۔ نہیں تو کل دیکھا جائے گا۔ اب جاؤ۔“ جلو نے کہا۔ ”اور ہاں، میں کوئی کل بھی ریسو نہیں کروں گا۔“

کمرے سے نکل کر دروازہ بند کرتے ہی لوسی نے ہاتھ کی چیزیں میز پر پھینیں اور ہینڈ بیگ سے ردھل نکل کر چرے کا ہلینہ پونچھے لگی۔ کیسا اندھا باس ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ کاش اتنا ہینڈ سم نہ ہوتا۔ اور ہینڈ سم تھا تو اتنا پھر دل نہ ہوتا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ پتھر پگھلتا بھی ہے۔ بلکہ آج پگھلا ہوا ہے۔ پیوی سے بے وفائی کرنے والا ہے۔ وہ اس خوش نصیب کے بارے میں سوچنے لگی جس کے لئے پاس کا دل پگھلتا ہے۔ لاکھوں کے نقصان کی پرواہ بھی نہیں کرتا۔

کیا وہ میں نہیں ہو سکتی؟ اس نے حسرت سے سوچا۔



ہیش کی طرح اس روز بھی جلو کی عجیب کیفیت تھی۔ ایک عجیب سا اضطراب تھا۔

لوسی اسٹے سے لیس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں لپائنٹ منٹ ڈائری، نوٹس لینے والا پیڈ اور چنسل تھی۔

”میٹھو مس لوسی۔“

لوسی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے سر اٹھا کر ہاں کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا اور جسمانی حرکت و سکنت سے وہ نزل لگ رہا تھا۔ لوسی یہ علامات خوب پہچانتی تھی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہاں کے بریف کیس کو غور سے دیکھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے کھول کر دیکھتی کہ آج کے لئے وہ کون سا لباس لایا ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔

”لیس مس لوسی؟“

لوسی نے لپائنٹ منٹ ڈائری کھولی۔ اچانک ہاں نے کہا۔ ”مس لوسی، آج کے تمام لپائنٹ منٹ کینسل کر دو۔“

”لیکن سر۔۔۔“

”میں نے کہا تھا تمام لپائنٹ منٹ کینسل کر دو۔“

”لیکن سر آپ کو یہ یاد دلانا میرا فرض ہے کہ آج آپ کا ایک بے حد اہم لپائنٹ منٹ ہے۔ آپ اسے کینسل نہیں کرنا چاہیں گے۔“

”از ویٹ سو؟“ سٹالو نے اسے گھورا۔

”لیس سر۔ لاکھوں کا لائٹریکٹ ہے۔“

”مس لوسی، تم نے کبھی محبت کی ہے؟“

سوال اتنا اچانک تھا کہ لوسی گڑبڑا گئی۔ ”لیس سر۔۔۔ نو سر۔“

”یعنی کی بھی ہے اور نہیں بھی کی۔“

لوسی نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ ”لیس سر۔ میں نے کی نہیں۔ خود بخود ہو گئی۔“

”ایسا ہی ہوتا ہے۔“ سٹالو نے مریمینڈ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ محبت کے لئے کیا کر سکتی ہو؟“

لوسی پھر گڑبڑا گئی۔ ”میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ میرا مطلب ہے، ہٹ وائف

اک خوف تھا۔ کچھ غڈھے تھے۔ مگر ان سب سے بلا تر ایک بیچان تھا جو اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ عام طور پر آدمی کی یہ کیفیت نین اناج میں ہوتی ہے، جب کوئی محبت کی منہ زور ندی اسے حشر کھکے کی طرح بہائے لئے جاری ہو۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھ کر صرف سو نا بوجے تھے۔ اس کا ہاتھ اضطرابی طور پر ڈائریکٹ لائن والے ٹیلی فون کی طرف بڑھا مگر اس نے اسے روک لیا۔ ابھی یہ مناسب نہیں تھا۔ اس نے سوچا اتنی دیر کچھ کام ہی نہ پایا جائے۔

اس نے میز پر رکھی فائلیں اپنی طرف گھمٹ لیں۔ اوپر والی فائل کھول کر اس نے گفتات کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن اس وقت وہ اس کے لئے بے معنی تھے۔ ساری معنویت تو اس مسکراتے ہوئے حسین چہرے میں تھی جو ان گفتات کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں تھی جو اپنے اندر بلا دے چائے اسے اشارے کر رہی تھیں۔ پکار رہی تھیں۔

اس کا ہاتھ پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھنے لگا لیکن اس نے فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ بے صبر پن اور جلدی بازی اچھی نہیں۔ اس نے ہمیشہ کی طرح خود کو سمجھایا۔ احتیاط بہت ضروری ہے۔

اور احتیاط واقعی بہت ضروری تھی۔ وہ جلتی پر تیل کا کام کرتی تھی۔ وجود میں ایسا بیچان اٹھائی۔ ایسی سنسنی جگاتی تھی کہ لطف دوہلا ہو جاتا تھا۔ بے قراری سے نہ مگرز جاتے تو تلنے کا کیا مزہ۔ اس نے جان لیا تھا کہ محبت کا مزہ بھی ہے، جب وجود میں دھیمی دھیمی آگ ہو وقت جلتی رہے۔

اس نے فائلیں پیچھے دھکیل دیں۔ اس وقت وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ہاں خطوط نمٹانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ اس نے خطوط اٹھائے اور اپنی توجہ کام پر مرکوز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دشواری تو ہوئی مگر جیسے جیسے خطوط پڑھ کر اس نے ان پر لوی کی لئے پڑتی نوٹ لکھے۔ جواب طلب خطوط اس نے ایک طرف رکھ دیئے۔ اس وقت وہ جواب لکھوانے کے قائل ہی نہیں تھا۔ اس نے جواب طلب خطوط کو گزشتہ روز کے خطوط کے ساتھ رکھ دیا۔

اس دوران میں وہ بار بار بے تلی سے گھڑی کو دیکھتا رہا تھا۔ سوئیوں کی حرکت

اتنی ست تھی کہ اسے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ وقت کا بھی عجیب مزاج ہے۔ بس آدمی کو ستاتا ہے۔ tease کرتا ہے۔ انتظار کو تو گزرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اور بے خودی ہو تو یوں گزرتا ہے کہ گھڑی ایک بل کی بھی نہیں رہتی۔

اضطراب تھا کہ پھرے ہوئے سمندر کی طرح اسے اچھاں ہوا بہائے لئے جا رہا تھا۔

اس نے بڑ دے کر لوی کو بلایا اور نوٹ لکھے ہوئے خطوط اس کے حوالے کر دیئے۔ پھر ”بے کار مباحث کچھ کیا کر“ کے مصداق ایک فائل کے کر بیٹھ گیا۔ لیکن اس کی نظریں گفتات کے نیچے سے جھانکتے ہوئے اسی چہرے میں ابھی رہیں۔ ”وقتی“ ”وقت“ بے تاب نظریں گھڑی کی طرف اٹھیں۔

بلا خوس پنج گئے۔ اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ پانچ منٹ اور انتظار کر لیا جائے۔ احتیاط کے بڑے قائدے ہیں اور وہ تھا بھی محتاط آدمی۔

لیکن دس بج کر پانچ منٹ تک وہ ٹائم بم کی طرح ہو گیا۔ اب ایک لمبے کی تاخیر بھی ہوتی تو وہ دھماکے سے پھٹ جاتا۔ اس نے ڈائریکٹ لائن والا ٹیلی فون اپنی طرف کھینچا۔ ریسپور اٹھایا اور وہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جو اس کے دل پر نقش تھا اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ اب کچھ جاہل آتا ہے۔ اب کچھ جاہل آتا ہے۔ پھر دل کو قرار آ گیا۔ دوسری طرف سے ریسپور اٹھایا گیا۔ ”ہیلو؟“ جانی پہچانی حترم آواز سنائی دی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح یہ خاص کل ریسپو کرتے وقت اس آواز کی کلنک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے وہ دلکش سریا لہرا گیا۔ پھولوں سے لدی ہوئی وہ نرم و نازک شرف۔ ”سیباب!“ اس نے جھلکتی آواز میں پکارا۔ یہ نام وہ جب بھی پکارتا، نوک زبں پر ہر بار ایک نیا ذائقہ محسوس ہوتا۔ ہر بار سانسوں میں ایک نئی خوشبو بکھورے لینے لگتی۔ ”میں سچا بول رہا ہوں۔“ ذرا توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔

”جیسے میں تمہاری آواز پہچانتی نہیں۔“ سیباب نے چوٹ کرنے والے انداز میں

ہر بار گفتگو اسی انداز میں شروع ہوتی تھی۔ ہر بار سیلاب کا یہ جملہ اسے ایک بہت بڑے اعزاز کا احساس دلاتا تھا جیسے وہ کچھ اور مستبر ہو گیا ہو۔ ”سیلاب... آج آ رہی ہو نا؟“ اس کے لیے میں بے تلبی تھی... چلتی ہوئی آرزوئیں تھیں۔ سیلاب کا جواب بھی اسے معلوم تھا بلکہ طرزِ پیشہ تبدیل ہوتے رہتے تھے۔

”اوہ سجاد۔ نہیں بھی“ آج تو مشکل ہے۔“ دوسری طرف سے سیلاب نے کہا۔
”کیا مشکل ہے؟“ وہ جھپٹا گیا۔

”تم بھول جاتے ہو کہ مجھے بچوں کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ انہیں اس طرح چھوڑ کر آنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”انہیں چند گھنٹوں کے لئے آیا کے پاس چھوڑنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔“ اس نے دلیل دی۔

”نہیں سجاد۔ آج میرا آنا مشکل ہے۔ کچھ ضروری کام بھی ہیں۔“

”سیلاب... پلیز سیلاب۔“ وہ بری طرح کڑکڑانے لگا۔

”بچوں کی طرح خند نہ کیا کرو۔“ سیلاب کے لیے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

”دیکھو سیلاب... تمہیں میری قسم۔ تمہیں آنا پڑے گا ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔“

”خیر... تمہاری قسم کی تو اتنی اہمیت نہیں۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔“

”سنو سیلاب... تمہیں آنا ہی ہو گا۔“ وہ اچانک ہی ہجر گیا۔

”کیوں؟ نہیں آئی تو تم کیا کر لو گے؟“ سیلاب کے لیے میں چٹختی تھا۔

”میں... میں...“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی... وہ کب بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن وہ سیلاب کو جانتا تھا۔ اس کے سامنے کمزوری دکھانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ آپ اس کے رستے میں بچہ جایے تو یا تو وہ آپ کی طرف دیکھے بغیر راستہ بدل کر گزر جائے گی یا آپ کے اوپر قدم رکھتی ہوئی یوں گزر جائے گی، جیسے آپ ہموار زمین ہوں۔ ایسی ہی اہمیت تھی اس میں۔ اور وہ دوسروں میں بھی اہمیت تلاش کرتی تھی۔

ذرا دیر سوچنے کے بعد سجاد نے راستہ نکالا۔ ”میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر تم آج نہ آئیں تو آئندہ تم سے کبھی نہیں ملوں گا۔“

”بچتے ہو تم۔ مجھ سے نہیں ملو گے تو تمہارا گزارہ کیسے ہو گا۔“

اب کے سجاد بری طرح ہلک گیا۔ ”میری سکرینری لوسی کو دیکھا ہے تم نے؟“ وہ میرے ایک اشارے کی منتظر ہے۔ تمہیں کچھ؟“

ریسیور پر چند لمبے خاموشی رہی۔ یقیناً وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اور یہ اچھی علامت تھی۔ پھر بھی سجاد کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ امید و بیم کی کیفیت میں ریسیور ہاتھ میں تھا۔ کانوں سے لگے بیضا تھا۔

”ٹھیک ہے سجاد۔“ بالآخر ریسیور پر سیلاب کی آواز ابھری۔ ”میں آ جاؤں گی۔ لیکن ڈیڑھ“ ذرا وقفوں کا بھی خیال رکھو۔ میرا خیال ہے، ہم اوپر چلے کر رہے ہیں۔ اتنی جلدی جلدی ملنا تو کوئی اچھی بات نہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو؟“

سجاد کو اس کی نصیحتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ پھر وہ بولا تو اس کی آواز بھی مسرت اور سستی کے پوچھ سے لرز رہی تھی۔ ”تو پھر تم آ رہی ہو نا؟“

”ہاں۔ لیکن کب اور کہاں؟“

”ایک بجے سہلی چوک سے میں تمہیں پک کر لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔“

دوسری طرف ریسیور رکھ دیا گیا۔ سجاد نے ریسیور ہاتھ میں تھا۔ بت بنا بیٹھا رہا۔ بچان پہلے سے سوار ہو گیا تھا۔ سستی موج در موج جسم کی دیواروں سے سر عکراتی پھر رہی تھی۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اب بھی ایک مسئلہ تھا اسے ڈھائی گھنٹے گزارنے تھے۔ پہاڑ پیسے ڈھائی گھنٹے۔ کاش... کاش وہ اس سے گیارہ بجے مل سکتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ اسی لئے اس نے خود ایک بجے کا وقت طے کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اسکول سے خود واپس لاتی ہے اور یہ وہ معمول تھا جسے وہ اس کی ناراضی کی قیمت پر بھی نہیں مل سکتی تھی۔

چند لمبے دو یونی بیٹھا رہا۔ انٹرکام پر لوسی کو ہدایت دی کہ وہ رمن صاحب کو

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج کر بائیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا اسے ابھی دو گھنٹے سے کچھ زائد وقت گزارنا تھا۔ اس نے بڑی بیزاری سے سامنے رکھی فائل کھول لی۔ لیکن فائل سے اسے سروکار نہیں تھا۔ وہ سیلاب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب وہ پہلی بار سیلاب سے ملا تو وہ سات سال کی تھی اور وہ خود نو سال کا تھا۔۔۔



رافعہ خالد پانچ سال بعد یو کے سے واپس آئی تھیں۔ وہ اہی اور ابو کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا۔ ان کے اور اپنے بچکے میں ویسے تو کوئی فرق نہیں تھا مگر وہیں سوئٹنگ پول دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ اہی اور ابو کے بھی یہی تاثرات تھے۔ خالد نے ان کے تاثرات دیکھ کر وضاحت کی۔ ”اسر تو بس پھمکی ہیں۔ پھمکی۔ پانی کے بغیر وہ ہی نہیں سکتے۔ سوئٹنگ پول کے بغیر مگر مکمل ہی نہیں ہوتا ان کا۔“
 اپنی بات ہوئی تھی کہ سیلاب وہیں سے کھسک گئی۔ چند منٹ بعد پانی میں چھپا کے کی آواز سن کر وہ سب چنگے کو پتہ چلا کہ وہ سوئٹنگ سوٹ پہنے پیر کی کے جوہر دکھا رہی ہے۔ یہ اسے گوارا نہیں تھا کہ بلیا کی تعریف کی جائے اور اس کے متعلق بتایا ہی نہ جائے۔

خالد نے بھی ہنسی بات کی۔ ”میں نے اپنی جمل پری کی تعریف نہیں کی تھی نہ۔“ وہ بولیں۔ ”اب یہ عملی مظاہرہ کر کے دکھا رہی ہے۔“
 سجاو پانی میں اس کے کتب دیکھ کر اشک کرتا رہا۔ وہ اسے بہت اچھی لگی۔ اسی لمحے وہ اس کے دل میں کھب گئی۔ حالانکہ وہ اس وقت محبت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا تھا۔

”بڑی زبردست ہے میری بیٹی۔“ اسفر خالو نے فخر سے کہا۔
 ”اس کے زبردست ہونے سے ہی ڈر لگتا ہے مجھے۔“ خالد زیر لب بولیں۔
 یہ اس زبردست سے پہلا تعارف تھا اس کا۔ خالد اور اہی میں بڑی محبت تھی۔ آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ کبھی وہ آ جاتیں اور کبھی یہ لوگ چلے جاتے۔ سیلاب کے ساتھ سجاو کی اچھی کھٹنے لگی تھی۔

اس روز وہ خالد کے ہاں گیا ہوا تھا اور اس وقت سوئٹنگ پول کے پاس کھڑا تھا۔

اس کے پاس بیچ دے۔ دو منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی اور رحمان صاحب اندر آ گئے۔ وہ فواد ایڈ سن کے جرنل مینجر تھے۔ ان کی عمر 45 برس کے قریب تھی۔

”تعریف رکھئے۔“ سجاو نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

رحمان صاحب بیٹھ گئے اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”مجھے آج ایک ضروری کام سے جانا ہے۔۔۔ ساڑھے بارہ بجے۔“ سجاو نے کہا۔

رحمان صاحب کے ہونٹوں پر ایک ٹانے کے لئے معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

”اور دو بجے ایک اہم میٹنگ تھی میری۔“ سجاو نے مزید کہا۔ ”فرحان ایسوسی ایٹس والوں سے؟“

”جی ہاں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ لاکھوں کا کنٹریکٹ ہے۔ اب آپ ہی ان سے ڈیل کر لیں۔ آپ کے لئے اس ڈیل میں تین اضافی بونس ہیں۔“

”لیکن جناب، آپ کی بات اور ہے۔ آپ زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سی شرائط۔۔۔“

سجاو نے ان کی بات کٹ دی۔ ”میں آپ کو مکمل اختیار دے رہا ہوں۔ ویسے بھی آپ جرنل مینجر ہیں۔“

”جی بہتر۔ میں ڈیل کر لوں گا انشاء اللہ۔ اور کوشش کروں گا کہ آپ کی توقع پر پورا اتروں۔“

”جانتے وقت اس ڈیل کی فائل مس لوسی سے لے لیجئے گا۔ اس میں میرے ریمارکس اور نوٹ بھی ہیں۔ گڈ لک۔“

رحمان صاحب چلے گئے۔ ان کی معنی خیز مسکراہٹ اس کی نظروں سے چھپی نہیں رہی تھی۔ شروع میں اس طرح کی مسکراہٹ اسے حد توہین آمیز لگتی تھی۔ لیکن اب وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ رحمان صاحب کیا دفتر کے بھی لوگ جانتے تھے کہ ہفتہ دس دن میں ایک بار اس کی غیر ضابطی سرگرمیوں کا دن آتا ہے۔ وہ دن مقرر نہیں تھا۔ توقع برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو اسے خود بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ یہ پروگرام کب بنے گا۔

پول اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس پر سحر سٹاری ہو جاتا تھا۔ پانی کے باہر رہ کر پانی اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن پانی کے اندر جانے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پانی کی قوت سے اسے خوف آتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ایک دن ساحل سمندر پر وہ ابو کا ہاتھ تھامے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑا تھا کہ ایک اونچی موج سر کے اوپر سے گزر گئی۔ اس لمحے کی گھبراہٹ وہ کبھی نہیں بھولا۔ پانی کے اندر اندر ہوا تھا اس نے گھبرا کر چیخنے کی کوشش کی تو منہ اور ناک میں بہت سارا پانی چلا گیا۔ اس وقت تو اسے پتہ نہیں چلا مگر بعد میں بہت دیر تک جلتی رہی۔ اس نے حلتا رہا۔ موج اتنی تیز تھی کہ پانی چھڑا کر پیچھے ریت کی طرف بھاگتا ہوا کہتے رہے کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ مگر وہ دیکھ چکا تھا کہ ڈرنے کی بات ہے۔ اس دن سے اس کے دل میں پانی کی بات بیٹھ گئی۔

وہ پول کے پاس کھڑا تھا کہ سیلاب آگئی۔ ”تمہیں بھی پانی بہت اچھا لگتا ہے؟“ اس نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں۔ بہت اچھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہمارا پول خوب صورت ہے نا؟“

”بہت خوب صورت ہے۔“

”تو تم تیرے کیوں نہیں؟“

”سچو بھر بھری لے کر رہ گیا۔“ مجھے تیرا نہیں آتا۔“

”جو تیرے نہیں سکتا وہ زندگی کا لطف بھی نہیں اٹھا سکتا۔“

”سچو نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ جملہ اس نے خلو جان کے منہ سے

نہا تھا مگر سیلاب کے منہ سے وہ بہت بڑا لگ رہا تھا۔

”تو تم تیرا سیکھ لو۔“ سیلاب نے کہا۔

”نہیں سیکھ سکتا۔“ سچو بے بسی سے بولا۔

”کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ میں سکھا دوں گی۔“

”مجھے پانی کے اندر جانے سے ڈر لگتا ہے۔“

”ڈر لگتا ہے!“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسنے لگی۔ ”پانی اچھا لگتا ہے اور

پانی سے ڈر بھی لگتا ہے۔ ہے نا بے وقوفی کی بات۔“

”سچو کو طرارہ آگیا۔“ سناپ بہت خوب صورت لگتے ہیں۔ لیکن سناپوں سے کھینا تو کوئی نہیں۔“

”مجھے سناپ خوب صورت لگیں گے تو میں ان سے ہرگز نہیں ڈروں گی۔ میں تو

ان سے کھیلوں گی۔“ سیلاب نے ایک ہل جھجکے بغیر کہا۔

”کننے کی بات ہے۔ سناپ کو اپنے قریب دیکھ کر دم کل جائے گا۔“ سچو کے لیے

میں حقاقت تھی۔

سیلاب نے اسے بہت غور سے دیکھا پھر بولی۔ ”میں رکوہ میں ابھی آتی ہوں۔“

”سچو وہیں کھڑا ہل میں بلکھوڑے لیتے پانی کو حذر وہ ساکتا رہا۔ اسے پتہ بھی نہیں

چلا کہ سیلاب کب گئی اور کب واپس آئی۔ اسے تو ہلکا سا دھکا لگنے کا پتا بھی نہیں چلا۔

اس کی محبت تو اس وقت ٹوٹی، جب اس نے خود کو پانی میں پلایا۔ وہ ڈبکیاں لگتے ہی اس

نے چلانا شروع کر دیا۔

پھر اسے مگر پر کھڑی سیلاب نظر آئی۔ نظر کیا آئی۔ ایک لمحے کو اس کی نظر سے

مکڑی۔ کیونکہ وہ اس وقت نظر بجا کر کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ سیلاب کھڑی

اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دلچسپی بھی تھی اور

ملاست بھی۔ ”اے یوں بیٹے کے بل لیٹو اور ہاتھ چلاؤ۔ اور پاؤں سے پانی کو دھکیلو

یوں۔“ اس نے مظاہرہ کر کے دکھایا۔

”میں۔۔۔ میں ڈوب رہا ہوں۔۔۔ میں مرجاؤں گا۔“ سچو بڑی طرح چلا رہا تھا۔ وہ

کچھ سننے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھا۔

”تم بڑل بھی ہو اور اترتی بھی۔“ سیلاب نے سخت لیے میں کہا۔

”سچو بدستور چلا رہا تھا۔ اسے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس

نے سیلاب کے ہاتھ میں وہ رنگین ٹیوب بھی نہیں دیکھی تھی، جس میں ہوا بھری ہوئی

تھی۔ سیلاب نے وہ ٹیوب اس کی طرف اچھل دی۔ ”وہ اسے پکڑ لو۔ اب ڈوبو گے

نہیں۔ بڑل۔“

اس لمحے سچو کو نہ اس کی حقاقت کا احساس تھا نہ اپنی توہین کا۔ اس کے چھوٹے

سے ذہن کے نزدیک مسئلہ اس کی بقا کا تھا۔ اس نے جلدی سے ٹیوب کو جھپٹ لیا۔

بعد میں سہلو اس بارے میں سوچتا تو متعلقہ جذبات کا شکار ہو جاتا۔ کبھی اسے غصہ آتا اور کبھی پیار۔ احسن مندی کا جذبہ امنڈنا کہ سیلاب نے اسے مرنے سے بچالیا۔ مگر پھر غصہ آنا کہ موت کے منہ میں دھکا بھی تو اسی نے دیا تھا۔ وہ مرعوب بھی ہوا۔ سیلاب اس سے چھوٹی جھٹی پھر بھی اس نے خود اس کی مدد کی۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو مدد لینے کے لئے گھر کی طرف بھاگتی اور اتنی دیر میں وہ ڈوب جاتا۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سہلو نے ہیرا کی سیکھ لی۔ ۵۵۵۵
دو ہفتے بعد وہ لوگ پھر خانہ کے ہاں گئی۔ ذرا دیر بعد سیلاب نے کہا۔ ”سہلو۔۔۔ ادر آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھاؤں گی۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اوپری منزل کے بڑے کمرے میں لے گئی۔ وہاں اس نے اسے شیشے کے چند بڑے کیسوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ سہلو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ شیشے کے ہر کیس میں ایک سانپ موجود تھا۔

”کیسے لگے؟“ سیلاب نے پوچھا۔
”جی جی کے ہیں؟“ سہلو نے پوچھا۔
”تو اور کیلہ ریڈ کے ہوتے تو یہ گھر کیوں بنواتے ان کے لئے۔“ سیلاب نے کہا پھر پوچھا ”کیسے ہیں؟ خوب صورت ہیں؟“
”ہاں، بہت خوبصورت ہیں۔ اب خود ہی دیکھ لو، اتنے اور خوب صورت لگنے کے باوجود ان سے کھیل تو نہیں کتے ہم۔“

”کیوں نہیں۔ میرا تو جب بی چلتا ہے، ان سے کھیلتی ہوں۔“
”جھوٹی۔“ سہلو نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔
سیلاب نے برا نہیں باند کبھی کبھی سہلو کو وہ خود سے بڑی گنتی تھی۔ بڑے تعلقات تھے اس میں اور وہ کم عمر ہونے کے باوجود انہیں سمجھتا اور ان کے بارے میں الجھتا تھا۔ مثلاً وہ بت اٹھتی تھی اور بت گمری بھی۔ بہت اتار پرست بھی تھی اور کبھی بڑی سے بڑی توہین کو بھی لپی جاتی تھی۔ کچھ بھی تھا، اس کی کشش اس کے لئے ناقابل تردید تھی۔ وہ اس کی طرف یوں کھینچتا تھا جیسے لوہا مٹاٹیس کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔

ثوب کو تھام کر پانی کی سطح پر رہنا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ پول سے کیسے نکلے۔ اس کے ہاتھ پاؤں مارنے کی وجہ سے پانی تلاطم ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی مگر ایک ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کرتا، تلاطم پانی اسے پیچھے دھکیل دیتا۔ ثوب کو چھوڑنے کا خطرہ تو وہ مول لے ہی نہیں سکتا تھا۔
”نکلے کیوں ہو۔ اب ثوب پکڑ کر تیرنا کیسو۔“ سیلاب نے کہا۔

وہ ہدایات دیتی رہی اور وہ عمل کرتا رہا۔ لطف بھی آ لگا اور خود اٹھتی بھی پیدا ہونے لگی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ ثوب چھوٹی۔ پتلی ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا پھر وہ چلايا۔ ”اس کی ہوا نکل رہی ہے۔“ اور یہ کہتے کہتے ثوب جھلکا سی ہو گئی اور وہ ڈبکیں کھانے لگا۔ اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

”اب تم تیرنا سیکھ چکے ہو۔ تیرنا۔“ سیلاب نے کہا۔
”مجھے نہیں آتا۔“ اس نے ہشکل کہا۔
”اچھا۔ پانی کے اندر چیخنا مت۔ سانس روک لینا۔ کچھ بھی نہیں ہو گا تمہیں۔“
سیلاب نے اسے دلاسا دیا۔

لیکن اب کہ وہ پانی میں زیادہ دیر رہا تو سیلاب گھبرا گئی۔ وہ چلانے لگی ”ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ جلدی آئیں۔ سہلو ڈوب رہا ہے۔“
مگر شاید گھر تک آواز نہیں سن گئی۔ یا تمام بڑے باتوں میں منہمک تھے۔ کسی نے سنا نہیں۔ اب تو سہلو چلتا بھی بھول گیا تھا۔ سیلاب بھی پریشان ہوئی۔ وہ پانی میں کودی اور تیری ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ ڈبکی کھا کر ابرا تو سیلاب نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ہاتھ پاؤں نہیں چلاؤ۔ خود کو دھملا چھوڑ دو۔“

جیسے تیسے وہ اسے اوپر لے آئی۔ خود باہر نکل کر اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
وقت اندر سے سب لوگ نکل آئے۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ خالو جان نے کہا۔
”سہلو پانی میں گر گیا تھا۔ میں نے اسے نکالا ہے۔“ سیلاب نے کہا۔ سجاد تو کچھ کہنے کے قتل ہی نہیں تھا۔
”میری بھلار بچی۔“ خالو نے بے حد فخر سے کہا۔

ناممکن کام بھی کر سکتی ہے۔

لیکن اتنے خطرناک تجربوں کے باوجود وہ اس سے بھاگا نہیں بلکہ اس کی طرف اور زیادہ کھینچا۔ دونوں طرف سے آتا چلن لگا ہی رہتا تھا۔ اس کے باوجود کبھی اسی اور ابو کو اس کی ضد کی وجہ سے بھی غلطی کی طرف جانا پڑتا تھا۔

ایک مہینے میں وہ دونوں بہت قریب ہو گئے۔ وہ عجیب بچی تھی۔ ایک طرف لڑکیوں کی طرح نرم و نازک... گڑبڑوں سے کھیلنے والی۔ بات بات پر رونے والی۔ دوسری طرف لڑکوں سے زیادہ سخت۔ کرکٹ کھیلنے کو وہ تیار، زور آزمائی پر بھی آمادہ۔ دونوں میں لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔ سیماب ضدی بھی بہت تھی۔ جبکہ سجا بہت صلح جو اور امن پسند تھا۔ مگر جب ضد کرتا تو کسی قیمت پر پیچھے نہ ہٹتا۔ دونوں میں لڑائی ہوتی تو 100 میں سے 99 مرتبہ وہی صلح کرتا۔ اسے منانا۔ لیکن ایک بار ایسا ہوتا تو وہ ڈٹ جاتا۔ تب سیماب ہی اسے مٹاتی۔

”میں ایسی ہوں نہیں۔“ ایک دن اس نے سجا سے کہہ کر کہا۔ ”میں کسی کو مناتی نہ ہوں۔“

”مجھے پرواہ نہیں ہوتی، کوئی روکھتا ہے تو روکھے۔“

”تو مجھے کیوں مناتی ہو۔“ سجا نے کہہ

”پتا نہیں کیوں۔ تم مجھے پورے نہیں لگتے۔ پھر بھی۔ تم میں کوئی کمی ہے۔“

سجا نے سوچا، مجھے اس میں کوئی چیز زیادہ لگتی ہے۔ اسے مجھ میں کوئی چیز کم لگتی ہے۔ ”کیا کی ہے، بتاؤ۔“

سیماب کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ”بھاری کی۔۔۔ تم ڈر پوک ہو۔“

سجا کی سمجھ میں آگیا۔ سیماب میں بھاری کی زیادتی تھی۔

دو ماہ بعد سیماب والدین کے ساتھ لندن والپس چلی گئی۔ تب سجا کو پتا چلا کہ وہ اسے کتنی اچھی لگتی تھی۔ وہ اسے بہت یاد کرتا تھا۔ اسکول کی کلاس میں بدلتی رہیں، زندگی گزرتی رہی۔ وہ بڑھتا رہا۔ لیکن ایک بہت بڑی کمی کے احساس کے ساتھ جیسے وہ باطل ہو۔ کوئی بھی دوست سیماب کے چھوڑے ہوئے اسے غلطی نہیں بھرسکا تھا۔ اس نے کم عمری میں ہی باطنی کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔

ٹرن۔۔۔ ٹرن۔۔۔ ٹرن۔۔۔

”جہیں ان میں سے کون سا اچھا لگتا ہے؟“ سیماب نے اس سے پوچھا۔

اب اس نے انہیں غور سے دیکھ دہل چار کیس تھے اور چار سانپ تھے۔ اس کے رنگ، ان کی کھالوں کے ڈیزائن بلاشبہ بہت پرکشش تھے۔ ”چاروں ہی خوب صورت ہیں۔“ وہ بولا۔

”سب سے اچھا کون سا لگ رہا ہے؟“

ذرا غور کرنے کے بعد سجا نے ایک کیس کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں جو سانپ تھا، وہ سرخ رنگ کا تھا اور جا بجا سیاہ دائرے بنے تھے۔

”تو اس سے کھیلو۔“

”مبلغ خراب ہو گیا ہے۔“ سجا بری طرح بھڑکا۔

”چلو۔۔۔ دونوں مل کر اس سے کھیتے ہیں۔ مجھے بھی یہ بہت اچھا لگتا ہے۔“ یہ کہہ کر سیماب نے شیشہ سرکایا اور ہاتھ بڑھا کر اس سانپ کو پکڑ لیا۔ سجا کی تو گھمکی بندھ گئی۔ وہ بت نہ کر رہ گیا۔ لیکن جب سیماب سانپ کو لے کر اس کی طرف بڑھی اور قریب پہنچ کر سانپ کو اس کی طرف بڑھایا تو وہ دہشت سے چلا یا اور اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ سیماب سانپ لے ہوئے اس کے پیچھے تھی۔ اور اسے کچھ نظری نہیں آ رہا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ بیٹھا ہوا اوپر کمر میں پکڑ لگا رہا۔ اتفاق سے زینے نظر آئے تو وہ نیچے اتار ڈرا۔ رنگ روم میں سب لوگ موجود تھے۔ وہاں بھی وہ اس حال میں پہنچے کہ وہ آگے آگے تھا اور سیماب پیچھے پیچھے۔

اسی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”کیا ہوا؟“ انہوں نے اسے پوچھا۔ وہ ان سے لپٹ گیا۔ اسی وقت اس کی نظر سانپ پر پڑی اور وہ بھی چیخنے لگیں۔

غلا جان بیٹھے جتنے رہے۔ ان کی سمجھ میں سب کچھ آگیا تھا۔ ”اس سانپ سے ڈر رہے ہو سجا بیٹے۔“ انہوں نے شفقت سے کہہ کر کہا۔ ”ارے میاں، یہ تو بے ضرر ہے۔۔۔ بے ضرر نہ ہوتا تو یہ سیماب اسے ہاتھ لگا سکتی تھی۔“

سجا کی سمجھ میں بھی بات آگئی۔ یہ بات تو اسے بھی سوچنی چاہیے تھی۔ لیکن اس نے نہیں سوچی۔ چھوٹا ہونے کے باوجود اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اس پر سیماب کا رعب پوری طرح بیٹھ چکا ہے۔ اس حد تک کہ اس کے خیال میں وہ ہر

رہیور اٹھانے سے پہلے اس نے اپنی جنگی حکمت عملی مرتب کی۔ اگر سیلاب ملاقات منسوخ کرنے کا کہے گی تو وہ کیا کرے گا کیسے اسے مجبور کرے گا کون سے حربے ہیں اس کے پاس؟ کچھ بھی نہیں، سوائے اس کے کہ آئندہ وہ اس سے کبھی نہیں ملے گا محروم جانتا تھا کہ یہ کونکلی دھمکی ہے۔ یہ اس کے لئے ممکن ہی نہیں۔ اگر سیلاب اس پر بھی نہ ملتی تو؟ تو کچھ نہیں ہو سکتا مگر اس ایئر کی تاریخ گواہ تھی کہ اس دھمکی کے بعد سیلاب ہتھیار ڈال دیتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر رہیور اٹھالیا کیونکہ گھنٹی ابھی تک نہیں بھنی تھی۔ ”میں پلینز۔۔۔ جھوٹا پسک۔۔۔“ اس نے بلوکار لیے میں کھد

دوسری طرف سے جالی پچھانی آواز سنتے ہی اس کے وجود سے ٹینشن یوں نکل گئی، جیسے غبارے سے ہوا۔ اس نے سکون کی گہری سانس لی۔

”کھل تھے آپ؟ اتنی دیر سے گھنٹی بج رہی تھی۔ میں تو اب فون رکھنے ہی والی تھی۔“

”جس فون رکھ ہی رہا جانتے تھا۔“ سیلو نے دل ہی دل میں کہا۔ پھر وہ ایک دم پریٹشن ہو گیا ”قدیس۔۔۔ کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟“

”جی ہاں۔ خیریت ہے۔“

”تو پھر اس وقت فون کرنے کا کیا مطلب؟“

”کیوں بھی۔ میں تو کسی بھی وقت فون کر سکتی ہوں آپ کو۔“

”صرف امیر جی میں۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ دفتر میں تو میں ڈسٹن میں ذرا بھی فرق نہیں آنے دیتا۔“

”تو اسے بھی امیر جی سمجھ لیں۔“

”کچھ بتاؤ تو۔“

”آپ کو شاید یاد نہیں، آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔“

”مجھے یاد ہے۔ میں تاریخیں کبھی نہیں بھولتا۔“ جھوٹا جھجھکیا۔

”میں نے سوچا ممکن ہے آپ کو یاد نہ ہو۔ آج شام جلدی آئیں گے ٹ۔“

”ہاں۔ یقیناً۔۔۔“

جھوٹوں چونکا جیسے کسی نے اسے جھجھکا دیا ہو۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ مگر ٹیلی فون کی گھنٹی کی بھی یہ عجیب حاکمیت ہے۔ یوں شروع کرتی ہے کہ کسی طرح چپ ہی نہیں ہوتی۔ جب تک کہ ٹیلی فون انڈیز نہ کر لو۔ عورت کی طرح۔

پھر بھی اس کا ہاتھ فوراً رہیور کی طرف نہیں بڑھتا اسے لوسی پر بری طرح غصہ آیا۔ جب وہ کہہ چکا ہے کہ اسے ہرگز ڈسٹر نہ کرے۔ تمام پائنٹ منٹ تک کینسل کر دینے اس نے۔۔۔ ایسے میں کوئی کل انڈر دینے کا کیا مطلب ہے۔ اسے لوسی کی خبر لینی پڑے گی اچھی طرح۔

مگر پھلا مسئلہ لوسی نہیں تھی، ٹیلی فون کی گھنٹی تھی جو اب بھی بج رہی تھی۔ اس نے رہیور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسی لمحے احساس ہوا کہ لوسی کا کوئی قصور نہیں۔ ڈائریکٹ لائن والے ٹیلی فون کا تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔

اس کا ہاتھ رہیور سے جھوٹا تھا کہ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ڈائریکٹ لائن! یہ فون کس کا ہو سکتا ہے۔ یہ نہ تو اس نے زیادہ لوگوں کو دیا بھی نہیں ہے۔ کیسے ایسا تو نہیں کہ یہ سیلاب کا فون ہو۔ مگر سیلاب اب فون کیوں کرے گی؟ ملاقات کینسل کرنے کے لئے۔ اس کے اندر سے ایک آواز نے جواب دیا۔ نہیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ سیلاب کا معاملہ ہو تو کچھ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ تاہم کچھ بھی نہیں رہتا۔

تب تو اسے یہ فون رہیور نہیں کرنا چاہیے۔ نہ وہ فون رہیور کرے گا، نہ ملاقات خطرے میں پڑے گی۔ نہ رہے گا پائسن نہ بیچے گی ہانسی۔

لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی کسی خدی بچے کی طرح۔۔۔ بلکہ سیلاب کی طرح اڑی ہوئی تھی۔ مسلسل بچے جا رہی تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق کم از کم پندرہ گھنٹیں بچ چکی تھیں۔ عام طور پر لوگ اتنی کوشش سے پہلے ہی مان لیتے ہیں کہ ان کا مطلوبہ فرد فون رہیور کرنے کے لئے موجود نہیں ہے مگر یہ گھنٹی اب بھی بج رہی تھی۔ بچے جا رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ سیلاب کا ہی فون ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ فون اسے رہیور کرنا پڑے گا۔ ورنہ گھنٹی بجتی رہے گی۔ سیلاب تو پہلا ہونے والی نہیں۔



وہ ریسور رکھنے والا تھا کہ قدس نے کہا۔ ”ایک بات اور۔“

”وہ بھی کدہ دلدلی سے۔ میں بت مصروف ہوں۔“

”آپ بت یاد آ رہے تھے۔ آپ کی آواز سننے کو دل چاہ رہا تھا۔“

”جب سامنے ہوتا ہوں تو تمام وقت بولی رہتی ہوں۔ تو پھر آواز سننے کو ترنا ہی ہے۔ آج شام کے بعد سن لیتا میری آواز۔“

”کاش۔۔۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اڑ کر آپ تک پہنچ جاتی۔۔۔“ قدس کی آواز جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”مگر فلائٹ واپس ہو جاتی۔ کیونکہ یہاں لینڈنگ کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ اچھا۔۔۔ خدا حافظ۔“ سچو نے کہا اور ریسور رکھ دیا۔

اس نے دراز کھول کر سیلاب کی فریم شدہ تصویر نکالی اور اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ ہلہ بابا اس کا جی چاہا تھا کہ اس فریم کو میز پر سجائے۔ لیکن دراز میں چھپا کر رکھی گئی تصویر جو بھیاں جگاتی ہے، وہ میز پر بھی کوئی تصویر نہیں جگا سکتی۔ اس نے تصویر کو دوبارہ دراز میں رکھ دیا۔ اس کا تصور کسی تصویر کا محتاج نہیں تھا۔ تصویر تو بس سننے کے لئے تھی۔

اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ آج اس کی شادی کی سالگرہ تھی۔ سچ یہ ہے کہ اسے یہ بات یاد ہی نہیں تھی۔ ورنہ شاید وہ۔۔۔ نہیں، سیلاب کو تب تو وہ ضرور فون کرتا۔ کیسی تھراکٹ بات ہے۔ شادی کی ساتویں سالگرہ۔ اور بے وفائی۔۔۔ توڑی سی بے وفائی! اور شام کو پیوی کے ساتھ سیلی بریشن۔ ایک ٹکٹ میں دو حزمے۔ کیسے زندگی میں رنگ ہی رنگ بھر جاتے ہیں۔ خوشی اور سنسنی ایک دوسرے سے لپٹ کر رنگوں میں دوڑتی۔۔۔ جتنی چلتی پھرتی ہیں۔

اس نے سوچا، ”اٹھ کر، جلنے کی تیاری کرے۔ مگر گھڑی دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ دس بج کر تینتیس منٹ۔ صرف گیارہ منٹ گزرے ہیں جب سے۔ اتنا عرصہ زندگی کا دوبارہ جی لیا، اتنی باتیں کر لیں اور اتنا سوچ لیا۔۔۔ صرف گیارہ منٹ! وقت کتنا ست رہا ہے۔

وہ پھر اسی دلکش چہرے کی کہانی میں کھو گیا!

خالد اور خالو سات سال بعد سیلاب کو لے کر پھر پاکستان واپس آئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ سچو کی میس بھیجنے کی تھیں۔ سیلاب کی یادوں کا، اس کی کئی محسوس کرنے کا مفہوم کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آئے لگا تھا یہی وجہ تھی کہ سیلاب سے ملنے ہوئے اس کے انداز میں بھجک تھی۔

لیکن سیلاب کے تو انداز ہی اور تھے۔ وہ تو آتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ وہ بوکھلا گیا۔۔۔ ارے۔۔۔ ارے ہو۔ کیا کرتی ہو۔“

”یار اسنے سالوں کے بعد مل رہے ہو۔ اچھی طرح ملو۔“ وہ اور چپک گئی۔

سچو نے گھبرا کر خالد اور خالو کو دیکھا۔ خالد بھینپ رہی تھیں۔ نظریں چرا رہی تھیں مگر خالو بے پروائی سے ابو سے باتیں کر رہے تھے۔

بڑے باتوں میں مصروف تھے۔ سیلاب نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر لان کی طرف چل دی۔ سچو چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا اور جو اسے نظر آیا، وہ واپس کن تھا۔ سیلاب ایک دم لمبی ہو گئی تھی اور بالکل لڑاکا لگ رہی تھی۔ انداز تو اس کے پہلے ہی سے لڑکوں والے تھے۔ لیکن عجیب تربیت یہ تھی کہ اس کی کشش کا وہی عالم تھا بلکہ وہ پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ جب وہ اس سے لپٹی تو اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ اب بھی وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی اور وہ عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

ایک درخت کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے۔ ”چلو۔۔۔ یہاں بیٹھتے ہیں۔“ سیلاب نے کہا۔

دونوں بیٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد سیلاب نے کہا۔ ”ذرا پرے ہوں۔۔۔ تمہیں ٹھیک سے دیکھ لوں۔“

وہ دیکھنے لگی۔ سچو کو عجیب سا لگا۔ وہ کھیانے لگا۔ ”کیسے بے ڈھب اور لمبے ہو گئے ہو۔“ بلاخر سیلاب نے تبصرہ کیا۔ ”اور یہ بال کتنے برے لگ رہے ہیں چہرے پر۔

پونزے اور مرنے کے درمیان کی چیز لگ رہے ہو۔“

”نہینہ بھی دیکھ لیا کرو کبھی؟“ سچو نے چڑ کر کہا۔

”اور آواز کو سے جیسی ہو گئی ہے۔“ سیلاب نے سنی ان سنی کر دی۔ ”واہ کیا

آئینہ دیکھ کر وہ اور پرمردہ ہو گیا مگر پھر دل میں امید کی نغمی سی کرن پھوٹی۔ اس کرن کی روشنی میں اسے ابو کا کلین شیو، تر و تازہ چہرہ نظر آیا۔ وہ بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ ابو سے بہت ملتا ہے۔ تو پھر وہ اتنا گندہ کیوں لگے۔۔۔ کیوں رہے کہ دوسروں کو بھی برا لگے اور خود کو بھی۔

اس نے جلدی سے ہاتھ روم کا دروازہ اندر سے بند کیا اور کینٹ میں سے ابو کا شیو کا سالن نکل لیا۔ ابو کو شیو کرتے ہوئے وہ ہمیشہ غور سے دیکھتا تھا۔ ان کی نقل کرنا کچھ مشکل نہیں تھا وہ تو شیو کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ ریزر اس کی نرم جلد کے لئے حد بد عالم ثابت ہو رہا تھا۔ جا بجا کٹ لگ گئے اور خون کی نغمی نغمی پوندیں ابھر آئیں جو دیکھنے ہی دیکھتے پھوٹے پھوٹے کنوئیں سے بن گئے۔ اس نے آفر شیو لوش لگایا تو تاج ہی اٹھ۔ خراشوں میں جیسے مریچیں سی بھر گئیں۔ روٹی موجود تھی۔ اس نے وہ لگائی اور لمحوں میں چہرہ کیس کا کھیت بن کر رہ گیا۔

آخر میں اس نے آئینے میں نتیجہ دیکھا جو خاصا یوس کن تھا۔ اب وہ اور طرح سے برا لگ رہا تھا۔ مگر میرا پہلے سے بہت بصر تھا۔ دن بھر خراشوں میں جلن ہوتی رہی۔ ایسا کھٹا تھا کہ لگتا تھا چہرہ اتنا ہی بڑا ہے مگر جلد کم ہو گئی ہے۔

اگلے روز حالہ آئیں۔ وہ انہیں چپکے سے سلام کر کے باہر نکل گیا۔ وہ لان کے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ ذرا پر بعد سیلاب وہاں آگئی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے بری طرح ہنس رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آ بیٹھی مگر ہنسی روکنے کی کوشش میں اس کا پورا جسم مل رہا تھا۔

سجلا کو اس کا ہنسا بہت برا لگ رہا تھا۔ وہ منہ بتائے بیٹھا رہا۔ اس نے ہنسنے کی وجہ بھی نہیں پوچھی۔ ذرا دیر میں سیلاب نے اپنی ہنسی پر تھو پٹا لیا اور گئے گئے لبو میں بولی ”چاہتا تھا اب تم سے بھی بات نہیں کر سکتی۔“

”تو نہ کرو۔“ سجلا نے ہنسا کر کہا۔

”کیسے نہ کروں۔ تم حرکتیں ہی ایسی کرتے ہو۔“

کامی نیشن ہے۔ صبح اور نوے کل۔“

سجلا اپنی آواز کی تبدیلی پر خود بھی پریشان تھا۔ وہ بھاری ہوتی ہوئی آواز اسے خود بھی اجنبی لگتی تھی۔ لڑکے جب جوانی کی سرحد میں قدم رکھتے گتے ہیں تو انہیں اس مرحلے سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ اور کھیا گیا۔ ”تو مت کرو مجھ سے بہت۔“ اس نے براہ راست ہوئے کہا۔

”میں تو نہیں ہو سکتا۔ یہاں بہت کرنے کو کوئی اور ہے ہی نہیں۔“

”تو واپس چلی جاؤ۔“ سجلا اٹھ کھڑا ہوا اور ناراض ہو کر چل دیا۔ سیلاب نے اسے مٹانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

ناراض ہونے کو تو وہ ہو گیا مگر اس امید پر کہ وہ اسے مٹا لے گی۔ اس لئے کہ یہاں ایک وی اس کا دوست ہے۔ وہ اس کی ضرورت ہے۔ مگر دو دن بعد ابو اور امی ان لوگوں سے ملنے گئے تو اسے یہ دیکھ کر پلوی ہوئی کہ سیلاب اپنے دو بچا زاد بھائیوں کے درمیان تحریک رہی تھی۔ وہ دونوں ہی اس پر والد و شیدا ہو رہے تھے۔ سیلاب نے اسے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ بہت تک نہیں کی۔

تب سجلا کو یہ پتا چلا کہ اس بار ان لوگوں کا قیام خالو کے چھوٹے بھائی کے گھر تھا۔

وہاں سے واپس آیا تو وہ بہت اداس اور پرمردہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بہت قیمتی چیز اس سے چھین گئی ہے۔ سچ یہ تھا کہ سیلاب کی بے رحمی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ”بھیا“ وہ بہت خود دار اور ناگ واد تھا۔ اس کے باوجود کئی بار اس کا جی چلا کہ سیلاب سے خود ہی بات کر لے۔ لیکن سیلاب نے اپنے ہر انداز سے واضح کر دیا تھا کہ اس کی سننے کی بھی نہیں۔ اب وہ اس بات پر بھی جھنجھلا رہا تھا کہ سیلاب کے معاملے میں وہ اتنا کمزور کیوں ہو گیا ہے۔

گھر آ کر وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا۔ سیلاب ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنے عکس کو دیکھتے ہی سوچا کہ رخساروں پر، غھوڑی پر، ہونٹوں کے اوپر نرم، مڑے ہوئے لمبے بال۔۔۔ واقعی مرنے جیسی ہیئت ہو رہی تھی اس کی۔ اپنا آپ خود اسے بھی برا لگ رہا تھا۔

”فرق پڑ بھی سکتا ہے بائی۔ مگر خیر۔ دیکھا جائے گا۔“

”سنو زکس۔“ اہی ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔ ”میں پہلے سے تمہارے کان میں ڈال رہی ہوں۔ میں سیلاب کو ہو بنانا چاہتی ہوں۔ وقت آنے پر اسے مانگوں گی سیلاب کے لئے۔“

”اس سے اچھا کیا ہے بائی۔ آپ سے بڑھ کر کون ہے۔“

سیلاب آگے بڑھ گیا۔

اسے آج بھی یاد تھا۔ اس وقت اس نے ماتھے کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر اس کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئی تھیں کہ سیلاب اب لندن واپس نہیں جائے گی۔ یہیں رہے گی۔ اس بات پر اسے افسوس بھی ہوا کہ وہ اپنے بچا کے ہاں رہے گی۔ کاش... وہ اہی کے ہاں رہتی۔
اس نے چونک کر گھڑی کو دیکھا۔ وقت ریک ریک کر گزر رہا تھا۔
دس بج کر انتالیس منٹ!



بعد میں اسے یہ افسوس بھی نہیں رہا۔ اس نے سمجھ لیا کہ سیلاب ہواؤں کی طرح آزاد لڑی ہے۔ وہ جہاں بھی رہے گی، آزاد ہی رہے گی۔ بتاؤ اب اس سے ملتی تھی، اس کے گھر میں رہ کر بھی اس سے زیادہ نہیں ملتی بلکہ اس کے لئے یہ اچھا ہی تھا کہ وہ اپنے بچا کے گھر غصی تھی۔ وہ اس سے ملتی تھی تو اسے خوش ہوتی تھی۔ لیکن وہ ان کے ہاں ٹھہری ہوتی اور اسی طرح اپنے بچا کا زور بھانپوں عامر اور عاطر سے ملنے جایا کرتی تو وہ کڑھتا۔ اسے افسوس ہوتا کہ وہ ان کے گھر میں ہوتے ہوئے بھی اس سے انہیں طرح نہیں ملتی۔ اب وہ جانتا تھا کہ عامر اور عاطر کے یہی جذبات ہوں گے۔ وہ ”اے رہے ہوں گے۔“

سیلاب کا اسکول میں داخلہ ہو گیا تھا اور وہ اسکول جانے لگی تھی لیکن اس سلسلے میں وہ خت بور تھی۔ ”یہی اور جگہ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔“ وہ اکثر کہتی۔ ”بھی تو اچھا لگتا ہے کہ دم گھٹ جائے گا میرا۔ میں جہاں کی۔“

”کیوں... ایسی کیا بات ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ وہ بہت اچھا اسکول ہے۔“ سیلاب

”کیسی حرکتیں؟“

”اب بھی دیکھ لو۔ پہلے مرنا تھے اور اب ابلا ہوا انڈیا بن گئے۔“ سیلاب نے اور پھر ہنسنے لگی۔

”تمہیں اس سے کیا؟“

”بس تم برے لگتے ہو تو برا لگتا ہے۔“

”تمہیں تو اپنے بچا کے بیٹے اچھے لگتے ہیں۔“

”تم اپنی جگہ اور وہ اپنی جگہ۔“ سیلاب نے بے نیازی سے کہا۔

ذرا دیر بعد وہ پھر ہنسنے پونے لگے۔

یوں قبل از وقت شیور کے سیلاب نے خود کو وقت سے پہلے بردا کر لیا۔

ایک روز غلام اکیلی آئی ہوئی تھیں۔ وہ اہی سے بات کر رہی تھیں۔ سیلاب گزرتے ہوئے سیلاب کا تذکرہ سنا تو دروازے پر رک کر سننے لگا۔

”میں تو بائی ہر وقت سیلاب کی طرف سے پریشان رہتی ہوں۔“ غلام کہہ رہی تھیں۔

”کیوں بھئی۔ اتنی پیاری بیٹی ہے تمہاری۔“ اہی نے کہا۔

”بہت آزاد خیال ہے بائی۔ مجھے تو ڈر لگا رہتا ہے۔“

”بچی ہے ابھی۔ نا سمجھ ہے۔ تجھ دار ہو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تمہیں بائی۔ میں جانتی ہوں۔ وہ اندر سے آدمی مغربی ہے، آدمی مشرقی۔ کبھی تو

مجھے لگتا ہے، وہ لڑکیاں ٹھہری ہوئی ہیں اس میں۔ میں فیصلہ کر کے آئی ہوں کہ اب اسے لندن نہیں لے کر جاؤں گی۔ میں تو اب خود بھی نہیں رہنا چاہتی مگر افسر کہتے ہیں، کاروبار سنبھالنے میں دو سال لگیں گے۔“

”تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔“ اہی نے کہا۔ ”اور سوچا کیا ہے اس سلسلے میں؟“

”میں تو آپ کے پاس چھوڑ کر جاتی اسے۔ لیکن افسر نہیں مانتے۔ وہ اسے اختر کے ہاں چھوڑنے پر راضی ہیں۔“

”چلو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ عاطر کے لیے میں چیخا تھا۔
 ”فطرت یہی ہے کہ مرد کو عورت کی اور عورت کو مرد کی کپہنی اچھی لگتی ہے۔
 اور جو لوگ فطرت کے خلاف عمل کریں وہ ایب نارمل ہوتے ہیں۔“
 ”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔“ عاطر نے کہا۔ ”تم انگلیٹنڈ میں رہ کر انگریزوں جیسی
 بے شرم ہو گئی ہو۔ کوئی پاکستانی لڑکی یہ بات نہیں کہہ سکتی۔“
 ”میرے خیال میں سیلاب ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ سہلو نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”تمہارا کیا ہے۔ تم تو سیلاب کے چچے ہو۔“ عاطر نے ہنسنے دیا۔
 بات بڑھی اور اتنی بڑھی کہ ان کی لڑائی ہو گئی۔

اس کا فائدہ سہلو کو ہوا۔ سیلاب کی اس سے دوستی ہو گئی۔ جو کچھ سہلو نے
 سوچا اور کہا وہ محض سیلاب کو خوش کرنے کے لئے نہیں تھا۔ اس کا مزاج ہی ایسا تھا۔
 ”بھلا“ وہ بہت معقولیت پسند تھا۔ معقول بات اس کی سمجھ میں آتی تھی او وہ اسے کشادہ
 دلی سے قبول بھی کر لیتا تھا۔
 سیلاب کو وہ اچھا تو لگتا تھا لیکن اسے اس کی یہ بات بہت بھائی۔ اس کے بعد
 دونوں میں گاڑھی چھٹنے لگی۔

اس عمر میں لڑائیاں بھی نہیں ہوتیں۔ عاطر اور عاطر نے بھی اپنی غلطی مانی اور ان
 کے درمیان صلح ہو گئی۔ لیکن ترجیحات کا تعین ہو چکا تھا۔
 آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کبھی سہلو بھی اختر چچا کے گھر چلا جاتا۔ اور سیلاب تو تھی ہی
 من مومن۔ بیٹھے میں دو تین بار تو وہ آتی ہی تھی۔ کبھی ویک اینڈ پر آتی تو رات کو رک
 بھی جاتی۔ اسی اس پر جان چھڑتی تھیں۔ ان کے خیال میں وہ ان کی ہونے والی بہو
 تھی۔
 ان قربوں کے نتیجے میں عاطر اور سہلو کی دوستی ہو گئی لیکن سہلو کی عاطر سے کبھی
 نہیں ملتی۔



دس بج کر چھپالیس منٹ!

ایک سال گزر گیا۔ اب سہلو نے مرزا تھا نہ ابا اور انڈا۔ وہ بے حد وجہ د کلکیل

نے کہا۔
 ”خاک اچھا ہے۔ جس دل نہ لگے اس جگہ کو اچھا کہا جا سکتا ہے؟“ سیلاب
 خدارت سے بولی۔

”اسکول پڑھنے کی جگہ ہے۔ دل لگانے کی تو نہیں۔“ سہلو نے اعتراض کیا۔
 اس وقت عاطر اور عاطر بھی سیلاب کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ عاطر نے ہنس کر
 کہا۔ ”یہ تو ہر جگہ دل لگانا چاہتی ہے۔“
 ”ذرا علوی ہو جائے گی تو اسکول میں بھی دل لگ جائے گا۔“ سہلو بولا۔
 ”نہیں لگے گا۔“ عاطر نے منہ پٹاتے ہوئے کہا۔ ”وہ گرو اسکول ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“ سہلو کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔
 ”وہاں صرف لڑکیاں ہوتی ہیں۔“ عاطر نے وضاحت کی۔ ”اور سیلاب کا دل صرف
 لڑکوں میں لگتا ہے۔“

”اسی لئے یہاں تم تینوں کے درمیان بیٹھی ہوں۔“ سیلاب نے ترخ کر کہا۔
 ورنہ میں لڑکیوں میں ہوتی اور تم تینوں الگ الگ ہو رہے ہوتے۔“
 ”ہماری طبیعت تمہارے جیسی نہیں ہے۔“ عاطر بولا۔
 ”جھوٹے ہو۔ جس بات کو برا سمجھتے ہو اسے کرنے سے باز نہیں آتے۔ مگر اسے
 چھپا کر رکھ لیتے ہو۔ میں جو بات جیسے ہو ویسے ہی کہہ دیتی ہوں۔“
 ”اسی کوئی بات نہیں۔“ عاطر اور عاطر نے بیک آواز کہا۔

سہلو چند لمبے سوچا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ سیلاب ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اسے اس لئے
 سیلاب اور اچھی لگی۔ وہ دیر تھی بولت تھی، منافق نہیں تھی۔ ”نہیں بھئی۔“ اس نے
 گہری سانس لے کر کہا۔ ”میں مانتا ہوں کہ سیلاب ٹھیک کہہ رہی ہے۔ نہ ماننے سے
 حقیقت تو نہیں بدلے گی۔“

”اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔“ عاطر نے کہا۔ ”تم اس معاملے میں سیلاب کے
 مزاج کے ہو گے لیکن میں نہیں ہوں۔“
 ”میں بھی نہیں ہوں۔“ عاطر بولا۔

”اگرچہ کہہ رہے ہو تو تم دونوں ایب نارمل ہو۔“ سیلاب نے کہا۔

لڑاکا قتلہ میٹرک کے بعد اس نے کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں لڑکیاں بھی تھیں۔ قہور وقت گزرا تو وہ کئی لڑکیوں کی دلچسپی کا محور بن گیا۔ لیکن خود اس نے کبھی کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی۔ ایک تو وہ بچہ "شریلا قتلہ" دوسرے اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ایک لڑکی میں دلچسپی لیتا ہے۔ بلکہ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ اسے سیلاب سے محبت ہے۔ لیکن یہ بات کالج کی کئی لڑکیوں کے اظہار محبت کے بعد اس کی سمجھ میں آئی۔

کبھی وہ کالج کی لڑکیوں سے سیلاب کا موازنہ کرتا تو اسے ایک پل کا میو سی ہوتی۔ کالج کی لڑکیوں میں عجیب سی خوب صورتی تھی جسے وہ محسوس تو کر لیتا تھا، سمجھ نہیں پاتا قتلہ جبکہ سیلاب میں وہ بات نہیں تھی۔ وہ غور سے دیکھتا تو اسے اعتراف کرنا پڑتا کہ چہرے کی خوب صورتی کے اعتبار سے سیلاب کالج کی لڑکیوں سے بہت حسین ہے مگر کہیں کوئی کی تھی اس میں۔ شاید وہ دلی پتلی بہت تھی۔ اور شاید وہ لمبی بھی بہت تھی۔ تاؤ کی طرح۔ اس میں شاید توازن کی۔۔۔ تناسب کی کمی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کبھی کچھ سمجھ نہیں سکتا۔

مگر ایک دن بات اس کی سمجھ میں آگئی!

سیلاب لڑکی سے زیادہ لڑاکا لگتی تھی۔ یہ بات سمجھنے میں اسے اتنی دیر اس لئے گئی کہ سیلاب کی تمام حرکتیں لڑکوں والی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتی، فٹ بال کھیلتی۔ ہاتھ پائی اور دھبہ شستی سے بھی وہ کبھی نہیں بچپاتی تھی۔ یہاں رہتے ہوئے ایک سال ہوا تو وہ بات بھی لڑکوں کی طرح کرنے لگی۔ اسے "عامر اور عاطر کو یاد کہہ کر مطالبہ کرتی۔ بس یہی غنیمت تھا کہ خود اپنے لئے وہ تائبہ کا میو استعمال کرتی تھی۔ اس کے لڑاکا پن کا یہ پہلو اتنا نمایاں تھا، اتنی سامنے کی بات تھی کہ اس کے پیچھے چھپی ایک اور سامنے کی حقیقت نہ نہ دیکھ سکتا اور وہ حقیقت یہ تھی کہ دلی پتلی ہونے کے باوجود سیلاب اس نزاکت سے محروم تھی، جو لڑکیوں کا بہت اہم اہم ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں "چہرے سے قطع نظر" بلکہ اعتبار سے وہ لڑاکا لگتی تھی۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس بات کے ادراک کے بعد وہ اس سے دور ہو جاتا۔ بہت حسین لڑکیوں کا اظہار اسے مہر تھا۔ لیکن بہت اکیلا طور پر سیلاب اس کے لئے پیلے ہی کی طرح پرکشش رہی۔ بلکہ شاہ اس کی "نش اور بھگنی۔

دوسری طرف عامر اور عاطر بھی سیلاب کی طرح کالج میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں بھی سیلاب کی صورت حال سے واسطہ پڑا قتلہ لیکن ایک فرق تھا۔ انہیں جو موقع مل رہا تھا، وہ اس سے استفادہ کر رہے تھے۔ کالج میں پہنچتے ہی انہوں نے پر پزے ٹھل لئے تھے۔ ان کے پتھر چلنے ہی رہتے تھے۔

اور شاید ان دونوں نے بھی کالج کی لڑکیوں سے سیلاب کا موازنہ کیا تھا۔ یہاں بھی وہی فرق سامنے آیا۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا، اسکے نتیجے میں ان کی سیلاب میں دلچسپی ختم ہو گئی۔ سیلاب سے انہیں لگاؤ تھا تو صرف اس لئے کہ اس کا تعلق صنف مخالف سے تھا۔ اور اسکول کے دنوں تک ان کے ارد گرد کوئی لڑکی تھی ہی نہیں۔ مگر اب انہیں لڑکیوں کی قربت بھی میسر تھی اور الفتات بھی۔ اور وہ بھی حسین لڑکیوں کا۔ اس لئے لڑاکا نما سیلاب ان کے لئے غیر اہم ہو کر رہ گئی۔

سیلاب کو اگر ان کے رویے سے دیکھا لگا تو اس نے کسی کو اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اس کی خود احمادی کا اب بھی وہی عالم تھا۔ لیکن وہ واضح طور پر سیلاب سے قریب تر ہو گئی۔

ایک سال گزرا اور اسکول کی دوسم گریڈ کی چھٹیاں ہو گئیں۔ لڑکے فرسٹ ایئر میں تھے۔ ان پر دھائی کا بوجھ بڑھ گیا تھا کیونکہ وہ دہ بعد امتحان ہونے والے تھے۔ پھر بھی انہوں نے شروع میں ایک ماہ کی چھٹیوں میں سیلاب کا خوب ساتھ دیا۔ کبھی سیلاب، آخر بچا کے ہاں چلا جاتا اور کبھی وہ لوگ ان کے ہاں آجاتے۔ خوب دھما پوزی جیتی۔ گانے گائے جاتے، ٹیلیئے غنائے جاتے، کسٹنی کھیلی جاتی۔ کرکٹ اور فٹ بال کی بھی شامت آتی۔ کبھی وقت پر سکون ہوتا تو وہ لوگ کیرم یا تاش کھیلتے۔

ایک اور مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ پہلے ہمیشہ اس بات پر جھگڑا ہوتا تھا کہ سیلاب کا پارٹنر کون بنے گا۔ اس سلسلے میں سیلاب کے سوا کبھی کوئی لڑاکا منافقت پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ ہاں سیلاب فیصلہ سیلاب پر چھوڑ کر الگ ہو جاتا تھا۔ مگر عاطر اور عامر بعض اوقات سیلاب کا فیصلہ بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کھیل ہی نہ پاتے۔ اس لئے وہ بے حد غیر متوازن چوکری تھی۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ تین ماہوں میں صرفی حرام ہو رہی تھی۔

جنگ تو یہ ہے کہ سہلو نے سیلاب کی بہت خدمت کی۔ وہ ہر وقت اس کا دل بسلانے کی کوشش کرتا۔ وہ نہ ہوتا تو سیلاب دوسرے ہی دن سے چلنا شروع کر دیتی اور اس کا نتیجہ یقیناً خراب نکلتا۔ ہر بار وہ اسے کسی کھیل میں الجھا لیتا۔ یا دی سی آر پر کوئی فلم لگا دیتا۔

اس عرصے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے سیلاب کو بہت قریب سے دیکھا اور اسے سمجھ کر اندازہ تو اسے تھا کہ وہ بہت دشوار لڑائی ہے۔ لیکن مسلسل اتنا عرصہ قریب رہنے کے بعد اس نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ وہ مشکل... بہت ہی مشکل لڑائی ہے۔ ابتدا میں اسے حیرت بھی ہوئی اور تکلیف بھی۔ مگر حقیقت جان لینا بلاخر بہتری ہوتا ہے۔

وہ سیلاب کے پیر کی موج کا تیسرا دن تھا۔ وہ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ اچانک سیلاب نے غصے سے چپے ایک طرف پھینک دیئے۔ سہلو حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ ”کیا ہوا؟ کیا تمہارے خیال میں میں بے اہلی کی رہا ہوں؟“ بلاخر اس نے سنبھل کر پوچھا۔

”جی نہیں۔ بے اہلی کرنے دوں گی تمہیں۔“ سیلاب نے چیلنج کیا۔

”تو پھر؟“

”یہ کیا معیت ہے۔ کیا تاش کھیلنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے؟“ وہ غصے سے بولی۔

”کیوں نہیں۔“ سہلو نے حد بطنی سے کلمہ ”چلو کوئی کھیلتے ہیں۔“

”میں بور ہو گئی ہوں یہ سب کر کے۔“ سیلاب نے کلمہ پھر زنجبیلی لہجے میں بولی۔

”اور خیرا فلم دیکھنے کی بات بھی نہ کرنا۔ میں فلمیں دیکھ کر تنگ آ چکی ہوں۔“

سہلو حیران تھا۔ ابھی تیسرا دن ختم نہیں ہوا تھا۔ یعنی ڈھائی دن میں وہ اپنے تمام مشاغل سے آگیا چکی تھی، جن کی تعداد بہر حال کم نہیں، بلکہ اچھی خاصی تھی۔ کم از کم اسے آنکھٹ کا بالکل احساس نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اسے یقین تھا کہ وہ ان مصروفیات میں کئی مہینے بور ہوئے بغیر گزار سکتا ہے۔ اس کے لئے تو سیلاب کی قرہت ہی بہت تھی۔ وہ اگر آنکھیں بند کئے لیٹی رہتی اور وہ اسے تنگ رہتا تو بھی اسے وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا۔ یہ سوچ کر اس کے دل پر چوٹ سی گئی کہ سیلاب کے لئے اس کی اتنی

مگر لڑکوں کے کالج پہنچنے ہی یہ مسئلہ نہیں رہا۔ اب پارنٹر کے انتخاب کا مسئلہ سیلاب پر چھوڑ دیا جانتا۔ عاقل اور عامر اب اس مسئلے پر کبھی نہ الجھتے۔ سیلاب ہر بار سہلو کے حق میں فیصلہ کرتی اور کبھی بد مزگی نہیں ہوتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ یہ مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔ سہلو مستقل طور پر سیلاب کا پارنٹر بن گیا اور تسلیم کر لیا گیا۔ مگر سہلو نے سیلاب کے چہرے پر ٹھکر کا سایہ دیکھ لیا تھا۔ پہلے جب اس کو پارنٹر بنانے کے لئے جھگڑے ہوتے تھے تو اس کا چہرہ خوشی سے تتھرا رہا ہوتا تھا۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ وہ اس کے لئے لڑ رہے ہیں۔ لہذا یہ غمروئی اسے بہت ناگوار تھی۔ تاہم اس کا بشت نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا کھیل بہتر سے بہتر ہوتا گیا۔ وہ جج کا بشت اچھا کھیلنے لگی۔

سہلو کے لئے یہ سب فائدہ مند تھا۔ سیلاب اب اس کی مستقل پارنٹر تھی... اور کیرم ہو گیا تاش، زیادہ ترجیح اس کے اور سیلاب ہی کے حصے میں آتی تھی۔

چھیڑوں کا ایک ماہ باقی تھا کہ ایک دن سیلاب ناشپاتی کے درخت پر چڑھ کر ناشپاتیاں توڑ رہی تھی۔ اچانک وہ بہت بے تکے پن سے گری۔ اس کے پائین پاؤں پر بہت زیادہ زور پڑا تھا اور وہ مڑ گیا تھا۔ اسی نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا لیکن بلاخر اسے اسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ احتیاط اور تعذیب ضروری ہے۔ کہیں فریکچر نہ ہو۔ بہر حال انیسرے سے یہ معلوم ہو گیا کہ ہڈی نہیں ٹوٹی ہے لیکن موج بہت شدید تھی۔ ڈاکٹر نے دوایں دیں۔ لیکن واضح طور پر خبردار کیا کہ احتیاط اور آرام بہت ضروری ہے۔ ورنہ چوٹ بہت تکلیف دہ ثابت ہوگی۔

انتہی چچا اور چچی سیلاب کی عیادت کے لئے آئے۔ انہوں نے مگر چلنے کو اصرار کیا لیکن سیلاب نے منع کر دیا کہ ڈاکٹر نے نقل و حرکت کو سختی سے منع کیا ہے۔ چنانچہ وہ بالکل نخواستہ اسے وہاں چھوڑنے پر رضامند ہو گئے۔ یوں سیلاب اسکول کی باقی چھیڑوں تک وہیں رہی۔

سہلو سیرا... کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن خود اس نے وہ وقت بہت اچھا گزارا۔ وہ اس کے لئے یادگار دن تھے۔ سیلاب بلا شرکت غیرے اس کی تھی۔ وہ تمام وقت اس کا سایہ بنا تھا۔ حالانکہ امتحان سر پر آگئے تھے مگر یہ بھی تھا کہ فرسٹ ایئر اتنا اہم نہیں ہوتا۔ اگلے سال ہر کی کی خلائی کی جا سکتی ہے۔

اہمیت نہیں ہے۔ ورنہ وہ بور نہیں ہو سکتی تھی۔
 اس نے نظریں اٹھا کر دیکھ کر سیلاب نگاہوں میں سختی لئے اسے گھور رہی تھی۔
 جیسے وہی اس کی بورت کا اسے وار ہو۔ ”تو پھر کیا کریں؟“ اس نے گہرا کر پوچھا۔
 ”سوچو۔۔۔ کچھ ایسا ہو جو ہم نے اب تک نہیں کیا ہو۔ بالکل نیا۔“
 سبلا سوچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے ایسا کچھ نہیں سونچے گا۔
 ایسا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔
 ”تم بہت بور آدمی ہو۔ ذرا بھی creative نہیں ہو۔ تمہاری کمپنی میں کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔“ سیلاب نے غصے سے کہا۔
 ”میں کوشش کر رہا ہوں سوچنے کی۔“
 ”کوئی ضرورت نہیں۔ یہ کلام تمہارے بس کا نہیں۔ مجھ پر چھوڑ دو۔ اچھا چلو“
 باغیچے میں چل کر سوچتے ہیں۔
 ”ہرگز نہیں۔ میں تمہیں اٹھنے نہیں دوں گا۔“
 ”تہہ۔۔۔ تم کیسے تیرے روک سکتے ہو مجھے۔“ سیلاب کے لیے میں حقارت تھی۔
 ”تمہاری ٹانگ کی پڑی توڑ دوں گا۔ پھر تم چلنے کے قتل ہی نہیں رہو گی۔“
 سیلاب نے اسے تولے والی نظروں سے دیکھا مگر اس کے انداز میں سنجیدگی دیکھ کر
 سکرا دی۔ ”یہ بات اچھی لگی مجھے۔ آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔۔۔ مضبوط اور زور
 آور۔ لیکن تم پر تو بس یہ دورہ سا پڑنا ہے کبھی کبھی۔ اس کے بعد ویسے ہی کمزور اور
 لچکے ہو جاتے ہو۔“
 اور سبلا فوراً ہی کمزور اور لچکا ہو گیا۔ مسئلہ وقتی طور پر حل ہو گیا تھا۔
 سیلاب کچھ سوچ رہی تھی۔ ذرا بعد اس نے سر اٹھایا۔ ”اور یہ تم اسی طرح
 میرے ساتھ کھیلتے رہو گے تو فیصل نہیں ہو جاؤ گے امتحان میں؟“
 ”ہوئے دو۔ اگلے سال دیکھ لیں گے۔“
 ”نہیں“ یہ کوئی بات نہیں۔ الزام تو مجھ پر ہی آئے گا اور یہ میں پسند نہیں کروں
 گی۔“
 ”تو پھر؟“

وہ پھر سوچنے لگی۔ ”اچھا‘ فرض کر لو‘ میں بچا جان کے ہاں چلی جاؤں تو۔۔۔؟“
 ”کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ میں وہاں بھی روز آیا کروں گا۔ اس حال میں تمہیں
 اکیلا تو نہیں چھوڑوں گا میں۔“
 سیلاب نے اسے ایسی جی نظروں سے دیکھا پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ ”تم میرا
 مطلب نہیں سمجھے۔ میں یہ جانتا چاہتی ہوں کہ عام حالات میں تم امتحان کی تیاری کیسے
 کرتے۔ کیا شیڈول ہوتا تھا؟ دیکھو نا کوئی بھی چوبیس گھنٹے تو نہیں پڑھ سکتا۔ پڑھے
 تو اس کا کچھ فائدہ بھی نہیں۔ تفریح بھی ضروری ہوتی ہے۔ اب یہ سوچ کر بتاؤ کہ میں
 انگلینڈ میں ہوتی تو تم کیا ٹائم ٹیبل بناتے۔“
 ”میں۔۔۔“
 ”ایک منٹ۔“ سیلاب نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس کی بات کٹ دی۔ ”بتاؤ
 نہیں۔ لکھ کہ۔۔۔ ٹائم ٹیبل بنا کر دکھاؤ مجھے۔“
 پانچ منٹ بعد سبلا نے کلفٹن اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کلفٹن کا جائزہ لیا اور
 بڑوں کے انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ”گھنٹہ دیری لگے۔ آج سے اس پر عمل ہو گا۔“
 سبلا کو غصہ آ گیا۔ وہ اسی کے انداز میں بول رہی تھی۔ اور وہ مذاق بھی نہیں
 تھا کیونکہ وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ”مگر تم بور ہو جاؤ گی۔“ اس نے اپنے بے
 سود غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں ہوں گی۔ ہم ایک بالکل نیا کام کر رہے ہوں گے جو ہم نے اب تک
 نہیں کیا ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“ سبلا حیران رہ گیا۔
 ”ہم مل کر پڑھیں گے۔“
 ”یہ کیسے ممکن ہے۔ تم مجھ سے بہت پیچھے ہو۔“
 ”ہوں۔ لیکن ضروری نہیں کہ میں بھی۔ تم جو پڑھو گے‘ زور سے پڑھو گے۔
 میں سنوں گی۔ پھر میں وہی پڑھوں گی‘ تم سنو گے۔ اس کے بعد ہم اس پر ڈسکشن کریں
 گے۔“

سبلا کو وہ نامکن معلوم ہو رہا تھا مگر کرنے میں کچھ خرچ بھی نہیں تھا۔ سیلاب کے

لے تو وہ ایک طرح کا نیا اور انوکھا کھیل تھا۔ جب تک اس سے دل نہ بھر جاتا، وہ خوش رہتی۔ اور سچو کا اپنا نقصان بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ امتحان پر پہلے ہی صبر کر چکا تھا۔ چنانچہ اس کے بنائے ہوئے ٹائم نیل پر عمل در آمد شروع ہو گیا۔

لیکن تین دن میں سچو کو اندازہ ہو گیا کہ اس پروگرام سے اسے بہت زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ سیلاب واقعی غیر معمولی لڑی تھی۔ اس کا حافظہ غضب کا تھا اور وہ بے حد جہیم بھی تھی۔ وہ تو کسی لیکچرار کے سے اعتماد سے اسے سمجھاتی تھی۔ یوں کھیل ہی کھیل میں امتحان کی تیاری بہت اچھی طرح ہونے لگی۔

چوتھے دن سیلاب پر آکٹاہٹ طاری ہونے لگی۔ نگے بندھے معمولات کے مطابق وقت گزارنا اس کے مزاج میں تھا ہی نہیں۔ لیکن وہ ٹائم نیل کی اہمیت کو خوب سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس کی ایک اور ترکیب نکال لی۔ ٹائم نیل کو بے حد مرتب انداز میں بے ترتیب کیا جانے لگا۔ کیمسٹری کے وقت وہ لوڈو کھیلنے، لوڈو کھیلنے کے وقت میں ریاضی پڑھا جاتا اور ریاضی کے وقت میں فزکس ہوتی۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ خود انہیں بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کب کیا ہو گا۔ سب کام ہوتے۔ تمام مضامین کی سٹڈی ہوتی۔ کھیل بھی سارے کھیلے جاتے۔ بس کسی کے بھی وقت کا تعین نہیں تھا۔

اس عرصے میں سچو نے سیلاب کو خاصی حد تک سمجھ لیا۔ یہ بھی جان لیا کہ وہ اسے پوری طرح کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے مزاج میں کون بہت تھا۔ وہ بے حد عصب پسند تھی۔ زندگی میں مسلسل نئے پن، انوکھے پن کی تلاش تھی۔ اس میں اضطراب بہت تھا۔ وہ ظاہری طور پر ہی نہیں، باطنی طور پر بھی بے حد متحرک تھی۔ عام طور پر ملکوں مزاج لوگ قوت ارادی کے پکے نہیں ہوتے مگر سیلاب جو ٹھان لیتی وہ کر کے رہتی تھی۔

دیکھنے میں تو وہ ایسی نہیں لگتی تھی لیکن ایک دن سچو کو پتا چلا کہ سیلاب حساس بھی ہے۔ شاید اس روز وہ کوئی کڑور لمحہ تھا، جو اس پر آیا تھا۔ اس نے بے حد اداس لہجے میں بڑی دل گرفتگی سے کہا۔ ”عامر اور عاطر نے کیسے مجھے چھوڑ دیا۔“

سچو نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس وقت وہ اسے کسی زخمی پر بندے کی طرح لگی۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”وہ بھی امتحان کی تیاری میں اچھے

ہوئے ہیں۔“

”نہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ انہوں نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔“ سیلاب کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔

سچو کو حیرت ہوئی۔ اب تک سیلاب نے یہ ظاہر ہی نہیں ہوئے دیا کہ اسے اس بات کی کوئی پروا ہے۔ یہ تو اب اچانک پتا چلا تھا کہ اسے ان کی بے رخی کا دکھ ہے۔ اسے احساس ہوا کہ سیلاب اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ ”تم بہت اچھے ہو۔۔۔۔۔۔ سچے اور قہص۔۔۔۔۔۔ اسی لئے میں تمہاری قدر کرتی ہوں۔“

سچو اس کے تغلوتات پر حیران ہوتا۔ کبھی کبھی تو اسے واضح طور پر محسوس ہوتا کہ سیلاب کے ایک وجود میں دو شخصیتیں ہیں۔۔۔۔۔۔ اور وہ ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہیں اور یہ بھی تھا کہ ان میں سے ایک شخصیت دہلی ہوئی تھی اور دوسری بہت زیادہ ابھری ہوئی تھی۔ سچو کو بیش اس کی دہلی ہوئی شخصیت نے بہت اہمیل کیا، جو بس کبھی کبھار ہی ابھرتی تھی۔ اس سیلاب میں نزاکت، نوسائیت اور غمراہی تھا۔ وہ شریلی تھی۔ وہ دوسروں کا ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنے والی تھی۔ لیکن بولڈ اور آزاد رو سیلاب اسے ابھرنے کا موقع کم ہی دیتی تھی۔

ادھر سچو کے امتحان شروع ہوئے اور ادھر اسکولوں کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔

ایک سال گزر چکا تھا!



سچو نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ وہ پھر سیلاب کی یادوں میں کھو گیا!

اس کے اور سیلاب کے درمیان دو سال کا فاصلہ تھا۔۔۔۔۔۔ عمر کا بھی اور تعلیم کا بھی۔ مگر کا فرق تو کبھی نہیں ختم۔ لیکن وقت نے عجیب انداز میں اس کی تعلیمی برتری کو نصف کر دیا۔ اگلے سال سیلاب نے میٹرک کا امتحان دیا۔ اسے انٹر، سینئر ایئر کا امتحان دینا تھا۔ لیکن بین امتحان کے دنوں میں وہ بیمار پڑ گیا۔ اسے ٹائی فائیڈ ہو گیا تھا۔

یہی وہ عرصہ تھا، جب خانہ مستقل طور پر پاکستان آگئیں۔ سیلاب بچا کے گھر سے اپنے ہاں منتقل ہو گئی۔ بیماری کے اس عرصے میں سیلاب نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ وہ

یہ سب نظر نہ آتے۔ وہ تو بس یہ سوچ کر کڑھتا کہ سیلاب نے اسے کبھی پارنٹر نہ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

اس محرومی کا ایک مثبت نتیجہ بھی نکلا۔ سہلو سیلاب پر اپنی الہیت ثابت کرنے کی کوششوں میں معصوم ہو گیا۔ وہ اس پر ثابت کر دیتا چاہتا تھا کہ عاطر اور عامر کے مقابلے میں وہ اس پارنٹر بننے کا کہیں زیادہ مستحق ہے۔ چنانچہ اس نے کھیل پر دھیان دینا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں اس کا کھیل گھبرا چلا گیا۔ کیرم میں تو یہ صورت حال ہوئی کہ وہ اکیلا بھی ان تینوں کو ہرا سکتا تھا۔

اس روز عاطر اور عامر نہیں تھے۔ وہ اور سیلاب سنگل میں کھیل رہے تھے۔ سیلاب نے nll ہارنے کے بعد بے بسی سے کندھے جھٹکے اور بولی۔ ”تم سے کیرم کھیلنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہیں کوفت ہوتی ہو گی مجھ سے کھیل کر۔ بے جواز مقابلے میں کھل مڑ آتا ہے۔“

”ایسا بھی نہیں۔“ سہلو نے انکساری سے کلمہ ”تمہارا کھیل بھی اچھا ہے۔“
 ”میں جانتی ہوں لیکن تم سے کوئی مقابلہ نہیں۔ تمہارا کھیل بہت اچھا ہے۔“
 ”اس کے بلجود تم مجھے اپنا پارنٹر نہیں بناتیں۔“ دل کی بات اچانک زبان پر آئی۔
 ”جی۔“

سیلاب نے چونک کر اسے دیکھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ بخور دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”تو اس لئے منہ لٹکائے رہتے ہو؟“
 ”تو اور کیا مجھے تم نے دودھ میں سے کھسی کی طرح نکل دیا۔“ وہ باقاعدہ شکایت پر اتر آیا۔

سیلاب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ سہلو جھجھکا گیا۔
 ”سوچ رہی ہوں کہ بہت ذہین لوگ بھی کسی معاملے میں کتنے بے وقوف ہو جاتے ہیں۔“

سہلو اور چڑ گیا۔ ”کھل کی ہانک رہی ہو؟“
 ”جج کہہ رہی ہوں۔ تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہئے تھا۔ اس پر....“

زیادہ تر انہی کے ہاں رہی۔ شاید وہ اپنی سوچ والے عرصے میں اس کی تیار داری کا حساب چکا رہی تھی۔

اور پھر ایک دن سہلو نے جو پوری آنکھیں کھول کر دیکھا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔
 شاید یہ نفرت کا اصول ہے کہ عرصہ ہمار میں جن درختوں پر دیر سے ہمار آتی ہے تو ایسی ہمار آتی ہے کہ پورے جن کی نظریں ان کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ یہی کچھ سیلاب کے ساتھ بھی ہوا۔ کھل تو وہ سوکھی ٹہنی کی طرح تھی۔ کھل ایک دم پھولوں اور پھلوں سے لدی شاخ بن گئی۔ یہ بھی طے ہے کہ ایسی شاخوں پر بھنورے بھی بڑی کثرت سے منزل لاتے ہیں۔ اور پرانے بھنورے تو ٹوٹ کر آتے ہی ہیں۔
 پرانے بھنورے لوٹ کر آئے تو پھر مسائل سر اٹھانے لگے۔

اب پھر سیلاب کا پارنٹر بننے کے سلسلے میں جھگڑے ہونے لگے مگر ایک فرق تھا۔ سیلاب نے خود ہی سہلو کو اس مقابلے سے باہر کر دیا۔ ”بھئی سہلو کوچ میں مت لاؤ۔“ اس نے ابتدا ہی میں فیصلہ سنا دیا۔ ”تم دونوں آپس میں فیصلہ کر لو کہ کون میرا پارنٹر بنے گا۔“

رقابت تو بھائیوں کے دلوں میں بھی فرق ڈال دیتی ہے۔ پھر بھی بھائیوں میں اگر محبت ہو تو وہ کوئی درمیانی راہ نکل ہی لیتے ہیں۔ دونوں خوش تھے کہ اصل کٹنا یعنی سہلو مقابلے سے نکل گیا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ لڑنا بے وقوفی ہے۔ دونوں باری باری سیلاب کے پارنٹر بننے رہیں گے۔

سہلو کو اس صورت حال پر بہت رنج ہوا۔ وہ عاطر اور عامر کے بدلے ہوئے رویوں پر سیلاب کی دل گرفتگی دیکھ چکا تھا۔ اس کے خیال میں تو سیلاب کو ان دونوں کو منہ ہی نہیں لگانا چاہئے تھا مگر وہ تو ان کے ساتھ پہلے جیسی ہو گئی تھی۔ اور مقابلے سے خارج وہ ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ بے انصافی تھی۔ پھر بھی اس کا دل سیلاب سے برا نہیں ہوا۔ وہ اب بھی اس کے التفات کے لئے کوششیں کرتا تھا۔

اور یہ بات نہیں کہ سیلاب اس پر ملنقت نہ ہو۔ واضح طور پر اس کا جھکاؤ سہلو کی ہی طرف تھا۔ اس سے بات کرتے وقت اس کے لمبے میں عجیب سی ٹھنک آ جاتی۔ اسے دیکھتے ہوئے اس کی نظروں میں وارفتگی ہوتی اور آنکھیں بھی چمکتیں۔ مگر سہلو کو

"...کہ تم نے مجھے اپنا پارٹنر نہیں بنایا۔" سہلو نے اس کا جملہ پورا کر دیا "اور میں بے وقوف ہوں کہ اس عظمت پر افسردہ ہوں۔"

"ہاں، یہی بات ہے۔" سیلاب نے خندیدگی سے کہا۔

"یہ منطق میری سمجھ میں تو نہیں آ سکتی۔" سہلو بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں واقعی بے وقوف ہوں۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ ذہین ہونے کے باوجود اس معاملے میں تم بے وقوف ثابت ہوئے ہو۔"

"تو اسے دانائے زمانہ، ذرا مجھے بھی سمجھا دو۔"

"ایسی باتیں سمجھائی نہیں جاتیں، خود سمجھتی ہوئی ہیں۔"

"مگر میں تو بے وقوف ثابت ہو چکا ہوں۔" سہلو کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اب تو تمہیں ہی سمجھانا پڑے گا۔"

سیلاب چند لمحوں کے لیے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی پھر عجیب سے لمبے میں بولی "تم میں لطیف باتیں سمجھنے کی اہلیت نہیں ہے۔"

"اس میں لطافت کمال سے آگئی۔" سہلو بھنا گیا۔

"ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ہے۔" سیلاب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اور یہ اہلیت اس لئے نہیں کہ تم جرات مند نہیں ہو، بزدل ہو۔ کسی چیز کو اپنے لئے بے حد اہم سمجھنے کے باوجود بھی تم اس کے حصول کے لئے نہیں لڑ سکتے، تمہارا دل جو کرنا چاہتا ہے، وہ تم کو نہیں سکتے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً تمہارا دل چاہتا ہے کہ میرا ہاتھ کھڑو مگر تم میں اتنی جرات نہیں ہے۔"

سہلو کا دماغ گھوما جا رہا تھا۔ "کیسی بے سرو پا باتیں کر رہی ہو۔"

"تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ تمہارے معاملے میں سب کچھ مجھے ہی سونپنا اور کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

"تو سمجھاؤ نا، ابھی تک تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہے۔"

"بس اتنا سوچ لو کہ پارٹنر زیادہ قریب ہوتا ہے یا حریف۔" سیلاب نے کہا اور اٹھ

کر کچن کی طرف چلی گئی۔

سہلو اس کے چلنے پر غور کرتا رہا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا مگر پھر اچانک جھماکا ہوا اس کا سب کچھ روشن ہو گیا۔ واقعی... یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ پارٹنر سانسے ضرور ہوتا ہے مگر فاصلہ بھی ہوتا ہے۔ جبکہ حریف بہت قریب ہوتا ہے۔ اتنا قریب کہ جسم بار بار چھوتے رہتے ہیں۔

پھر اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی بے وقوف ہے۔ کم از کم اس معاملے میں۔ اب اسے باتیں یاد آ رہی تھیں... اور سمجھ میں بھی آ رہی تھیں۔ کیرم کھیلنے ہوئے سیلاب کوئی گولٹ کھیلنے کے بدلے اس کی طرف بھجکتی تھی بلکہ اس پر لد جاتی تھی۔ اور اب تو وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ سیلاب دوسری طرف کی آسمان گولٹیں چھوڑ کر اس کی طرف کی مشکل گولٹیں کھیلتی تھی۔ اس پر کبھی اس کی اپنے پارٹنر سے بحث بھی ہو جاتی تھی۔ سہلو نے تصور میں وہ منظر دیکھا۔ اور اس کا چہرہ ختمائے لگد وہ واقعی بہت بے وقوف تھا۔ جب سیلاب اس کی طرف بھجکتی تو قدرتی طور پر اس کا لہس اس کے وجود میں سنسنی دوڑا دیتا تھا مگر وہ اس قوت سے محفوظ ہونے کے بجائے اس پر ہی کڑھتا رہتا کہ سیلاب نے اسے پارٹنر نہیں بنایا ہے۔

اس روز سہلو نے بہت کچھ سوچا اور بہت کچھ اس کی سمجھ میں آیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ خوش بھی ہوا، مگر جھنجھلیا بھی۔ ایک بات تو وہ یقینی طور پر سمجھ گیا۔ یہ کہ اسے سیلاب سے محبت ہے اور وہ اس کے بغیر... اس سے دور نہیں رہ سکتا۔ اور آثار بتاتے تھے کہ اس کا جذبہ یک طرفہ نہیں۔ سیلاب بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن یہ بات وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ سیلاب کے مزاج میں تلون ہی اتنا تھا کہ وہ تو پہل پہل رنگ بدلنے والی لڑکی تھی۔ اگر یہی سب کچھ کسی اور لڑکی نے کیا تو وہ تو وہ بلا جھجک یقین کر لیتا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ مگر معاملہ سیلاب کا تھا، جس کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ یہاں کوئی خوش فہمی پانا عمر بھر کا رویہ ہی ثابت ہوتا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ سیلاب کی طرح وہ بھی کچھ عجیب ہی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ سیلاب کا یہ کہنا غلط تھا کہ وہ بزدل ہے اور اس میں جرات کی کمی ہے۔ خود کو پوری طرح ٹٹولنے کے بعد وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ

”میں سمجھی نہیں۔“

”میرے لئے تمہارا پارٹنر بننے کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور جو تم نے علیحدگی کی تو اس بارے میں میں سوچتا بھی نہیں چاہتا۔“

”یعنی تمہارے لئے میرا پارٹنر بننا ایک بہت بڑا اعزاز ہے؟“

”جولو نے اہمیت میں سر ہلا دیا۔“

”اور اس قربت کی کوئی اہمیت نہیں جو تمہیں ملتی رہی ہے؟“

”جولو نے نفی میں سر ہلا دیا۔“

”جانتے ہو، عاقل اور عاقلہ مجھے چھوٹے کئے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں اور میں انہیں موقع نہیں دیتی۔“

”یہ ان کا مزاج ہے۔ میں ایسا نہیں ہوں۔“ جولو نے خشک لہجے میں کہا۔

”میں نے ٹھیک ہی کہا تھا تم میں لطیف باتوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”میرے نزدیک یہ لطافت نہیں، کثافت ہے۔“

”ہو اسٹوپ۔ اچھا یہ بتاؤ پارٹنر بننا اتنی بڑی بات کیوں لگتا ہے تمہیں۔“

”اس میں مستحکم اور گمراہی ہے یہ دیکھا اور پناہیلا ہوتا ہے۔“

”جولو نے دونوں باتوں سے اپنا سر قدام لیا۔ ”او مالی گلاس۔ تم بہت فرسودہ آدمی ہو۔“

”مجھ سے کچھ کہا تم نے؟“ جولو نے سراٹھا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ تم پکڑے کھاتے رہو۔“

”کچھ دیر غائب رہی پھر سیاب ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ ”میں جانتی تھی کہ تم ایسے ہی ہو۔ پھر مجھی۔“

”جولو نے اس کی بات کٹ دی۔ ”آج ذرا مجھے صاف صاف بتا دو کہ میں کیسا ہوں۔ اور تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔“

”مرد ہٹاؤں گی۔“ سیاب نے غصے سے پاؤں دھتے ہوئے کہا۔ ”تم بیک درؤ،“

”شہلی، تمز دلے اور بزدل ہو۔“

خالص مرد ہے۔ وہ جرات مند بھی ہے۔ لیکن وہ روایتی معاشرے کی مروجہ قدروں کو سمجھتا بھی ہے اور ان کا احترام بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سب کچھ سمجھنے کے بعد اس کے اندر مقفل روئے اُبھرے ہیں۔ ایک طرف اسے خوشی ہوئی مگر دوسری طرف اسے برا بھی لگا۔ اچھی لڑکیوں ایسی تو نہیں ہوتیں۔ لڑکیوں کو ایسا ہونا بھی نہیں چاہئے۔ محبت تو ایک خود کار جذبہ ہے، جس پر کسی کا اختیار نہیں۔ وہ تو بس ہو جاتی ہے، آدمی چاہے یا نہ چاہے۔ مگر لڑکیوں میں جب ایک ضروری وصف ہے۔

یہاں وہ سیلاب کو ایک مارجن دینے پر مجبور تھا۔ ذہنی نشو و نما کا تمام عرصہ اس نے انگلیڈ کے آزاد ماحول میں گزارا تھا۔ اس سے بھی بڑا فرق پڑتا ہے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس بات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ سیلاب کی فطرت ہی ایسی ہے۔ کچھ لڑکیوں ہوتی ہی باقی ہیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سیلاب کوئی بری لڑکی نہیں۔ بس وہ بہت آزاد طبیعت کی ہے اور کوئی بات نہیں۔

وہ اور بھی بہت کچھ سوچتا مگر سیلاب آندہ طوفان کی طرح آگئی۔ اس کے ہاتھ

میں ٹسے تھا۔ اس نے ٹسے میز پر رکھی۔ ”یہ رہے جناب گرامر م پکڑے۔“ اس نے اعلان کیا۔ ”یہ سر کر اور یہ زبردست پٹنی۔“ اس نے چٹکارا لیتے ہوئے کہا۔

”جولو حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

”بتایا تو ہے۔“ وہ معصومیت سے بولی ”اور پکڑے میں نے خود بتائے ہیں۔ کھا کر دیکھو نا۔“

”جولو مزے لے لے کر پکڑے کھانے لگا۔ ”بہت مزے کے ہیں۔“ اس نے سر اٹھا کر کہا۔

”اب شاید میری بات سمجھ میں آجائے۔“

”وہ تو سمجھ میں آ چکی ہے۔“ جولو نے بے ساختہ کہا۔

”تو پھر میرا شکر یہ ادا کرو۔“

”یہ ممکن نہیں۔ اس لئے کہ میں تم سے متفق نہیں ہوں۔“

”کس بات سے؟“

”تمہاری علیحدگی سے۔ تمہاری سوچ مجھے اچھی نہیں لگی۔“

نہ کرنے کو بزدلی سمجھتی ہوں۔ جو بی میں آئے وہ کر گزرنے کی قائل ہوں میں۔
 تیس اچھی نہیں لگتی تو نہ سی۔ میں بدلنے والی نہیں۔“
 ”ہم دونوں بالکل مختلف ہیں ایک دوسرے سے..... بلکہ ضد ہیں۔“ سہلانے آہ
 بھر کر کہا پھر مل کر بولا۔ ”کاش تم یہاں آئی ہی نہ ہوتیں۔“
 ”اب تو کچھ ہو نہیں سکتا اور یہ بھی سن لو کہ تم مجھے بہت برے لگتے ہو۔۔۔۔۔“
 وہ کہتے کہتے رکی پھر افسانہ کیا۔ ”کبھی کبھی مگر عجیب بات ہے کہ تم مجھے بہت اچھے بھی
 لگتے ہو۔“ اس کے لیے میں ابھیں تھی اور وہ بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھی۔

”اور بھی یہی حال ہے۔“ سہلانے کہا۔
 ”مگر ایک بات بتا دوں۔ بیشہ یاد رکھنا۔ ہر جگہ تمہارے پیچھے آؤں گی میں۔ تمہارا
 کبھی پیچھا نہیں چھوٹے گا مجھ سے۔“
 ”میں پیچھا چھڑانا بھی نہیں چاہتا۔“ سہلانے خود کلائی کے انداز میں کہا۔
 ”جب چاہو گے، تب بھی نہیں چھوڑوں گی۔“



اس وقت تو سہلا کو خیال بھی نہیں تھا مگر اب وہ جانتا تھا کہ وہ بڑا سچا لمحہ تھا۔۔۔۔۔
 اور سہلا نے زندگی کا سب سے بڑا سچ بولا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ سہلا نے کبھی
 اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مگر وہ خود بھی سچا ثابت ہوا۔ اس نے بھی کبھی سہلا سے
 پیچھا نہیں چھڑانا چاہا۔ وہ آج بھی اس کے دل و دماغ پر اسی طرح قابض تھی۔ اسی لئے
 تو آج وہ اس سے ملنے کے انتظار میں ایک ایک لمحہ شمار کر رہا تھا۔
 اس پر اس نے چونک کر گھڑی میں وقت دیکھا مگر وقت تو جیسے ٹھہر گیا تھا۔۔۔۔۔ مگر

یہ نہیں رہا تھا۔ گیارہ بج کر بائیس منٹ!
 اور وہ صرف بیٹے ہوئے لمحوں کے دامن میں ہی پناہ لے سکتا تھا۔



کالج کے معاملے میں سہلا نے بڑی رازداری سے کام لیا اور اسے پتا ہی نہیں
 چلنے دیا کہ وہ کہاں داخلہ لے رہی ہے۔

سہلا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر خنکی تھی۔ ”اپنے بیک دروازے اور شریلی
 ہونے پر تو مجھے غصہ ہے۔ اور میں معاشرے کی روایات اور پابندیوں کو توڑنے کو بہادری
 نہیں سمجھتا میرے خیال میں خود سے اور اپنی خواہشوں سے لڑنا بہادری ہے۔“
 ”پاؤں کے زور پر کوئی بہادری نہیں بن سکتا۔“

سہلانے ایک لمبٹ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”جو بی میں آئے، وہ کر لینے
 میں کیا دیر لگتی ہے۔ یہ تو بہادری ہے؟“ اس نے سہلا کو اپنی طرف کھینچا۔
 ”بہادری تو جب مانوں کہ تم سب کے سامنے میرا ہاتھ پکڑو۔“ سہلا نے چیلنج
 کیا۔

”ابھی جو تم نے کہا، بے خبری میں کہا۔ ایک بار اوروں۔ سوچ سمجھ کر کو تو پھر میں
 بھی دکھاؤں کہ میں کتنا بہادری ہوں۔“

سہلا نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں جو کچھ دکھائی دیا، اس نے
 اسے نظریں جھکانے پر مجبور کر دیا۔

”کوئی! اب چیلنج کرو مجھے۔“ سہلانے کے لیے میں اصرار تھا۔
 سہلا اب بھی خاموش رہی۔

”کوئی! نہیں کہیں تو آج کے بعد بزدلی کا طعنہ بھی نہ دینا مجھے۔“
 اس بار سہلا مسکرائی۔ ”جب تک بہادری کا عملی ثبوت دیتے رہو گے، نہیں
 کہوں گی۔“

سہلا کو بہت زور کا غصہ آیا۔ عجیب لڑکی تھی وہ۔ کسی صورت مانتی ہی نہیں تھی۔
 اب اور آزمائشوں سے مشروط کر دی تھی اسے۔ ”اور یہ بھی سن لو۔ میرے خیال میں
 لڑکیوں کو ایسا نہیں ہونا چاہئے، جیسی تم ہو۔“

اس کے لیے کی تندی اور شدت سہلا کے دجور پر کوڑے کی طرح لگی۔ وہ
 سمٹ کر رہ گئی۔ اس نے سر اٹھا کر ایک لمحے کو اسے زخمی نگاہوں سے دیکھا مگر اگلے
 ہی لمحے خوش دلی سے مسکرائی۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو ایسی ہی ہوں۔ اب
 بدل بھی نہیں سکتی۔ میں گھٹ گھٹ کر جیسے والی روایتی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے دھیرے
 دھیرے سگنا اچھا نہیں لگتا۔ میں مجزک کر چلنے والی ہوں۔ جو دل میں ہے، اس کا اعلان

”میں نے کہا تھا کہ میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔“

”چلو۔۔۔ دیکھیں گے۔“

”چلو۔۔۔ چھوڑو اس بات کو۔ لڑکیوں وقت ضائع کرتے ہو۔ اس وقت کہاں جا رہے تھے؟“

”خلی بیڑہ ہے۔ میں نے سوچا۔۔۔“

”کہ مجھے چائے پلا دو۔ ہے؟“ سیلاب نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا ”دیکھو نا، آج کالج میں میرا پہلا دن ہے۔“

”جی نہیں۔ میں کاسن روم جا رہا ہوں۔“

”چائے پلا دو نا۔“ سیلاب ٹھکی۔

”میں نے کہا نا، میں کاسن روم جا رہا ہوں۔“

”تو چلو۔ میں بھی چلتی ہوں۔“

”ضرور چلو۔“ سیلاب نے آگے بڑھتے ہوئے کلمہ اس وقت اسے خیال بھی نہیں آیا کہ چائے پلا دینے ہی میں عاقبت ہے۔

گرگز کاسن روم اور بوائز کاسن روم برابر برابر ہی تھے۔ وہاں پہنچ کر سیلاب نے سیلاب سے کلمہ ”اب میری جان چھوڑ دو۔ یہ رہا گرگز کاسن روم۔“

”میں تو گرگز اور بوائز کاسن روم کی تفریق کو نہیں مانتی۔ کاسن روم تو بس کاسن روم ہوتا ہے۔ جس میں میرا جی چاہے گا جاؤں گی۔“

سیلاب کا چہرہ قہقہہ ہو گیا۔ یہ افلو تو اس کے وہم دنگن میں بھی نہیں تھی۔ ”دیکھو“ میں من مانی نہیں چلے گی۔ یہ کالج کے ڈسٹن کا معاملہ ہے۔ پرنسپل صاحب بہت سخت آدمی ہیں۔“

”کچھ بھی ہو۔ میں تو تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ سیلاب اڑ گئی۔ ”چلو ایسا کرو کہ تم گرگز کاسن روم میں چلے چلو۔“

”پہ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“ سیلاب اور گرگز بڑا گیا۔

”بس تو پھر میں تمہارے ساتھ بوائز کاسن روم میں چلتی ہوں۔ جواب دی میں نہ کر لوں گی۔“

اس روز ایک خلی بیڑہ تھا۔ سیلاب کاسن روم جانے کی غرض سے کلاس سے نکلا۔ فرسٹ ایئر کے کلاس روم سے سیلاب کو نکلنے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ سیلاب نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، سیلاب بول پڑی۔ ”ارے۔۔۔ تم یہاں۔۔۔ وہاں اے سر ایئر۔“

”یہ تو مجھے کہنا چاہئے۔“

”مگر میں کہہ رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اس کالج میں پڑتے ہو۔“

”جھوٹ مت بولو۔ سیکڑوں بار تمہیں اپنی کالج کا نام بتا چکا ہوں میں۔“

”ضرور بتایا ہو گا۔ مگر اسکول اور کالج کا نام دھیان سے کون سنتا ہے۔ ہر حال مجھے

خوشی ہوئی اس اتفاق پر۔“

سیلاب کا خون کھولنے لگا۔ وہ کتنی دھناتی سے اسے اتفاق کہہ رہی تھی۔ ”کیوں؟“

اس نے ترقی سے پوچھا۔

”فرسٹ ایئر فول بنا ہے تو کسی اپنے ہی کے ہاتھوں بن لوں۔“

”تمہیں کون فول بنا سکا ہے۔“ سیلاب نے مسکھ اڑانے والے انداز میں کلمہ ”اور

مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔“ لائیں پریشان ہو گیا ہوں۔“

”کیوں بھی؟“

”میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ تمہاری یہاں آمد مجھے بہت ہنگامی پڑے

گی۔“ سیلاب نے کلمہ اس وقت اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس نے کس قدر جچی بات

کہی ہے۔ آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا۔

”مجھے انوس ہے کہ تمہیں پریشان ہوئی۔“ سیلاب نے کلمہ۔

”چلو، کوئی بات نہیں۔ ایک سٹی ہی کی تو بات ہے۔“ سیلاب بے پرواہی سے بولا۔

”وہ کیسے؟“ سیلاب نے بھنوں اچکا کر۔

”میں ایک سال بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم یہاں رہ جاؤ گی۔“

سیلاب نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”تم ایک بات بھول رہے

ہو۔“

”وہ کیا؟“

پتہ چل گیا تو آپ مصیبت میں پھنس جائیں گی۔“ قریو لا۔

”لیکن پرنسپل صاحب کو پتا چلے گا کیسے؟“ سیلاب نے معصومیت سے پوچھا۔

”سب لڑکے چہرے پر ابھمن لئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

”میرا مطلب ہے، آپ لوگ نہیں بتائیں گے تو کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔“

کچھ سربراہان میں بے محرک کچھ چروں پر پریشانی بھی ابھری۔ ”اس صورت میں ہم

سب بھی پھنس جائیں گے۔“ قرآنہ کلمہ

”پتا چلے گا ہی نہیں۔“ سیلاب نے زور دے کر کلمہ

”یہ بہت بڑا رسک ہے مگر سیلاب۔“ ایک اور لڑکا بولا۔

”آپ لوگ میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے؟“ سیلاب دل آویز انداز میں

سکرائی۔

”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔“ کئی آوازیں ابھریں۔

لیکن قریب بھی مخالفت کر رہا تھا اس نے کلمہ ”ہم سب کالج سے نکالے بھی

باکتے ہیں۔“

”میں صرف ایک ٹیم کیوں گی۔“ سیلاب نے بے حد لجاجت سے کلمہ

سجلا خاموش کھڑا تھا دیکھ رہا تھا وہ سب سیلاب کی طرف اس طرح متوجہ تھے

کہ انہیں اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

”چلیں۔ ٹھیک ہے۔“ قرآنہ کچھ دیر سوچنے کے بعد رضامندی میں سر ہلایا۔

ان کے ساتھ ہی امیدواری کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سب اپنی اپنی کھینے لگے۔

”آپ مجھ سے کھیل لیں۔“

”تم طرح کھیل رہے تھے۔ کیلئے رہو۔۔۔ اور ہاں، تم کیرم میں لگے رہو۔“

”کیرم کیلئے کا یہ مطلب نہیں کہ میں ٹیبل ٹینس نہیں کھیل سکتا۔“

”ہاں سنی، ڈبلز میں کیوں نہ کھیلیں۔“ ایک لڑکے نے امکانات پر دھنسنے کی

کوشش کی۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ سیلاب نے شہنشاہی انداز میں کلمہ

”بس تو آپ میری پارٹنر بن جائیں۔ میں بہت اچھا کھیل ہوں۔“

سجلا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کچھ بھی سنی، سیلاب اس کی کزن تھی۔ عائد اس پر بھی آتا۔ وہ گھبرا کر فرار کی راہ سوچنے لگا۔ ”واقعی۔۔۔ میں بڑا بے مروت ہوں۔“ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کلمہ ”تمہارا پہلا دن ہے کالج میں۔ چلو تمہیں چائے پلاؤں۔“

”اب تو میں کامن روم میں ضرور جاؤں گی۔“

”پلیز سیلاب۔۔۔“ وہ گھٹکیانے لگا۔

سیلاب چند لمحے سوچتی رہی۔ ”اچھا۔۔۔ اگر چائے پلانے کا پکا وعدہ کرتے ہو تو میں

بھی وعدہ ہے کہ ٹیبل ٹینس کا صرف ایک ٹیم کیوں گی۔“

سجلا چند لمحے اسے بغور دیکھا رہا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ضد پوری کئے بغیر ٹیم

مانے گی۔ ”اچھا۔۔۔ چلو۔“ اس نے مرے مرے لہجے میں کلمہ

وہ دونوں کامن روم میں داخل ہوئے۔ وہاں دس بارہ لڑکے پہلے سے موجود تھے

دو طرح کھیل رہے تھے۔ چار کیرم بورڈ پر مصروف تھے۔ ٹیبل ٹینس کی دونوں میز پر

گھری ہوئی تھیں۔ کسی کو ان دونوں کی آمد کا پتہ بھی نہیں چلا۔

”ایکسیکوزی حضرات!“ سیلاب نے اعلان کرنے والے انداز میں کلمہ

کامن روم میں نسوانی آواز ہم کا دھماکا ثابت ہوئی۔ سب لڑکوں نے چونک کر

دیکھا۔ سیلاب کو دیکھ کر ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کھیل ایک دم موقوف ہو گیا۔

”پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں سیلاب ہوں۔۔۔ فرسٹ ایئر فول۔“

سجلا سناٹے کے عالم میں کھڑا تھا۔ لڑکوں کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔

سیلاب چند لمحے کسی رد عمل کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ سانسے نہیں آیا۔

”آپ لوگ مجھے خوش آمدید نہیں کہیں گے؟“

اس پر لڑکوں کا جود ٹوٹا۔ قرآنہ جو سجلا کا دوست تھا، بلند آواز میں کلمہ۔ ”ویل

میں سیلاب۔“

پھر سب لڑکے اپنی اپنی بولنے لگے۔ اچھی خاصی دوستانہ فضا بن گئی۔

”تو میں کھیل سکتی ہوں؟“

اس سوال پر پھر خاموشی ہو گئی۔ ”پرنسپل صاحب کو یہاں آپ کی موجودگی کا

اس پر پارنٹرز بننے کے امیدواروں میں بحث شروع ہو گئی۔ اور جیتنے موجود نہ سب ہی امیدوار تھے۔ سچو سیلاب کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ سیلاب بہت خوش تھی اس کا چہرہ ختم ہوا تھا۔ ایسی ہی فضا میں تو وہ خوش رہتی تھی۔

امیدواروں کی بحث کسی نتیجے پر پہنچنے والی نہیں تھی۔ بلاخر سیلاب کو مداخلت کا پڑی۔ ”میکیکوزی۔“ اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

سب خاموش ہو کر اسے گھنٹے لگے۔

”آپ خواہ لڑ رہے ہیں۔“ سیلاب نے کہا۔ ”میرا پارنٹر تو سوچ رہا ہے۔ اور ہمارے خلاف کیلئے کے لئے بھی لڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں روز ایک ٹیم کیلئے کرنا گی۔ سب کی باری آ جائے گی۔“

”مگر آپ کا پارنٹر کون ہے؟“

”میٹ مالی کزن“ سچو حید۔“ سیلاب نے سچو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈراما انداز میں کہا۔

سب لڑکوں نے پہلی بار سچو کو دیکھا۔ ”یہ... یہ... آپ کے کزن“ قمر بھلایا۔

”جی ہاں۔ میں ان کے ساتھ کیوں گی۔“

سچو کو متاثر بننے کا احساس ہونے لگا۔ ”میں نہیں کیلئے چاہتا۔“ اس نے آہستہ سے سیلاب سے کہا۔

”میں کسی اور کو پارنٹر بنا لوں تو برا مت مانتا۔“ سیلاب نے سرگوشی میں دہرایا۔

سچو نے خاموشی سے ایک لڑکے سے ریکٹ لے لیا۔

یوں ٹیم شروع ہوا۔ مختلف ٹیم کے سلسلے میں بحث نہیں ہوئی۔ شاید لڑکوں۔ سمجھ لیا تھا کہ دیکھنے میں زیادہ لطف آئے گا۔

ٹیم سیلاب اور سچو نے بہ آسانی جیت لیا۔ مخالفین سے کیلئے ای نہیں گیا۔ حلافا وہ بہت اچھے کھلاڑی تھے۔

”تمہیں فار آل آف یو۔“ سیلاب نے کامن روم سے نکلنے ہوئے کہا۔ ”ہم ملیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کالج کی کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سچو سچو رہا تھا کہ اب اس کالج میں زندگی آسان نہیں رہے گی۔ کتنی دشوار ہو جائے گی، اس کا وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ”کوئی بات نہیں۔ ایک سال ہی کی تو بات ہے۔“ اس نے خود کھائی کی۔

”کیا کہا؟“ سیلاب نے چوک کر پوچھا۔

”کہا تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو بس سوچ رہا ہوں۔“

”ٹھیک سوچ رہے ہو۔“ سیلاب مسکرائی۔ ”ہم بس ایک سال کے لئے دور ہوں گے۔ اس کے بعد پھر مل جائیں گے۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔۔“

”میں جانتی ہوں۔“ سیلاب نے اس کی بات کٹ دی۔ ”مگر تم بھول رہے ہو۔ اُن نے بہت سوچ سمجھ کر کہا ہے کہ تمہاری جان بھی نہیں چھوڑوں گی۔“

سچو کے ہونٹوں پر درگزر کرنے والی مسکراہٹ ابھری۔ ”کوئی بات نہیں یہی۔ بھلا جائے گا۔“



کالج میں ایک قمری ایسا تھا جس سے سچو کی گہری دوستی اور بے تکلفی تھی ورنہ طور پر وہ بہت لمبے دیئے رہنے کا قائل تھا۔ مگر اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ پورے کالج کے لڑکے اس سے بے تکلف ہو گئے ہیں۔ وہ بھی، جنہیں وہ جانتا تک نہیں تھا، اسے سلام دعا کرنے لگے۔

”یہ سب کلمات ہیں تمہاری کزن کے۔“ قمر نے کینٹین میں چائے پیتے ہوئے کہا۔ ”مگر کالج کی یونین کا انتخاب لڑو تو تمہیں کوئی نہیں ہرا سکتا۔“

”کہاں کی بات رہے ہو۔“ سچو نے بد مزگی سے کہا۔

”سچ کہہ رہا ہوں۔ تم کالج کی مشہور ترین شخصیت بن چکے ہو۔ سب تمہیں نئے ہیں۔ سب تم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔“

”مگر کیوں؟“

”کزن کے کلمات۔“ قمر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”سیلاب ہر ایک سے یہی

”ارے بھی سچو“ تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ آگے تمہارا کیا کرنے کا پروگرام ہے۔“ غلو نے اس سے کہل۔

”انتر کے بعد انشاء اللہ آئی بی اے میں ایڈمشن لوں گا۔ پہلے بی بی اے اور پھر ایم بی اے کروں گا۔“ اس نے جواب دیا۔

غلا اچھل ہی پڑیں۔ ”اچھا۔۔۔ تم بھی ایم بی اے کرو گے؟“

”کیا کوئی اور بھی کر رہا ہے غلا؟ عاقریا عامر؟“

”انکا تو مجھے نہیں پتا لیکن سیما ب کا بھی ارادہ ہے۔“

سچو کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ سیما ب! لیکن اسے کیسے معلوم کرسے۔ وہ اپنی حیرت چھوڑ کر غلا کی طرف متوجہ ہو گیا جو اب ای سے مخاطب تھیں۔

”ان دونوں کے خیالات اور عرائم کتنے ملتے جلتے ہیں۔“ غلا کہہ رہی تھیں۔

”سچو کا تو اب پتا چلا ہے ورنہ میں یہی سمجھتی کہ سیما ب نے اس سے متاثر ہو کر ایم بی اے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن سیما ب نے تو میٹرک کرتے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ایم بی اے کرے گی۔“

سچو کو یاد آیا۔ سیما ب ہمیشہ چیخیں کرتی تھی کہ اس کا بیچھا نہیں چھوڑے گی۔ تو یہ بات تھی۔ لیکن اسے معلوم کیسے ہوا کہ وہ ایم بی اے کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات تو کبھی ان کے درمیان ہوئی ہی نہیں۔ وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل آیا۔

کمرے میں سیما ب موجود تھی۔ ”ارے۔۔۔ تم سے کب بیچھا چھوٹے گا میرا؟“ سچو نے جان بوجھ کر یہ جملہ کہل۔ وہ اسے کریدنا چاہتا تھا۔

”کبھی نہیں۔ میں ہر جگہ تمہارا بیچھا کروں گی۔“

”مگر کیسے؟ تمہیں کیا معلوم کہ انتر کے بعد میں کیا کروں گا۔“

”مجھے نہیں معلوم۔ مگر میں ایم بی اے ضرور کروں گی۔“ سیما ب کے لہجے میں یقینی تھی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں ایم بی اے کروں گا۔“ سچو نے اس پر آنکھیں اٹالیں۔

کہتی ہے کہ اپنے کزن کی مرضی کے بغیر وہ کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتی ہے کہ تمہارا اور اس کا کوئی ایسا تعلق بھی نہیں۔ یعنی جتا دیتی ہے کہ اصل ویلنسی ابھی خالی ہے۔ عرضی والی جا سکتی ہے۔ مگر کزن سچو کی تائید ضرور ہے۔“

سچو نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا ”کاش۔۔۔ یہ سال جلدی ختم ہو جائے۔“

”ویسے تمہاری کزن ہے بہت زور دار چیز۔“ قرنہ کہل۔

سچو نے سر اٹھا کر اسے بے حد کڑی نظروں سے دیکھا۔ ”تم تیز سے بات نہیں کر سکتے؟“ اس نے سخت لہجے میں کہل۔

”میرا وہ مطلب نہیں تھا۔“ قرنہ نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ ”دراصل تمہاری کزن کے معاملے میں کسی کو بھی صحیح لفظ نہیں سمجھتے۔ زور دار چیز ہے میرا وہ رواج۔“

مطلب نہیں تھا۔ علائکہ وہ اس پر بھی پوری اترتی ہے۔۔۔“

اس پر سچو نے پھر اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔

”میرا مطلب تھا کہ آئندہ سیما ب بہت زیروست لڑی ہیں۔“ قرنہ تیزی سے کہل۔ ”وہ جو سوچتی ہیں“ اسے پورا بھی کرتی ہیں۔ اپنی بات پر کسی سے بھی عمل کرا۔

کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی حیثیت کالج کی ملکہ کی سی ہو گئی ہے۔ یہ یہ کہنا چاہتا تھا میں۔۔۔ اور منہ سے زور دار چیز نکل گیا۔۔۔ ار رہا۔“

”میں تو شک انکيا ہوں یار۔“ سچو نے بھلا کر کہل۔

”تم ہی نہیں، کالج کے تمام لڑکے بھی تم سے شک آپکے ہیں۔“

”چھوڑ یار“ چائے تو سکون سے پینے دے۔“



گیارہ بج کر پینتیس منشا!

اس روز سچو کو پتا چلا کہ سیما ب بار بار چیخیں کس بنیاد پر کرتی ہے کہ اس کا بیچھا نہیں چھوڑے گی۔

وہ پر یکس کر کے گھر آیا تو غلا اور غلو آئے ہوئے تھے۔ وہ انہیں سلام کر رہے تھے۔ وہیں بیٹھ گیا۔

”میرے دل نے بتایا تھا تمہاری کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی۔“
اس سے زیادہ سچا اس سے اگلا نہیں سکا۔ بس اتنا اس نے سمجھ لیا کہ اس نے
واقعی پیچھا نہیں چھوئے گا۔ اگلے ہی لمحے اس کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ وہ اس
سے پیچھا چھڑانا ہی کب چاہتا تھا۔ بات اتنی سی تھی کہ وہ اسے پریشان بہت کرتی تھی۔



گیارہ بج کر چالیس منٹ!

یہ تعلیمی سال بھی پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اختتام کے قریب پہنچ کر
مگر وہ سال تھا بڑا ہنگامہ خیز۔ اور سب ہنگاموں کا سبب ایک ہی تھا۔۔۔ سیما! اس نے
صحیح معنوں میں سچا کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے پہلی بار ہچلا کہ وہ بلیک میل
کرنا بھی جانتی ہے۔ وہ واحد لڑکی تھی جو دھڑلے سے لڑکوں کے کلاس روم میں جاتی
اور کہتی۔ سچا اسے کسی بات سے روکنے کی کوشش کرتا تو وہ بلیک میلنگ پر اتر آتی
کٹھن نے مجھے ہلکے کی بیشک کی ہے۔“ وہ اسے بتاتی۔

”کہاں کا پروگرام ہے؟“

”میں نے پوچھا تھا کٹھن سے۔ وہ کہنے لگا: جہاں ہم تم اکیلے ہوں، وہ جگہ دیران
ہو وہ بھی ہر ہلکے اسپاٹ سے خوب صورت لگے گی۔“

”کیا مطلب؟ تم دونوں۔ بس تم دونوں۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ یہی تو کہہ رہا ہے وہ۔“ سیما اس کے ہمتاے ہوئے چہرے کو بغور
دیکھتی۔

”تم نے منع کر دیا نا؟“ وہ پرامید لہجے میں پوچھتا۔

”نہیں بھئی۔ ایسی غلطی جس سے انکار کیسے ممکن ہے۔ لیکن میں نے کہہ دیا
کہ چنانا ہے تو کلری جمیل چلو۔“

”کلری جمیل۔۔۔ اور صرف تم دونوں؟“

”کیا حرج ہے اس میں؟ میں جانتی ہوں، وہ اچھا لڑکا ہے۔“

”تھائی میں کوئی لڑکا اچھا نہیں ہوتا۔“ سچا رزنی آواز میں کہتا۔

”وہم ہے تمہارا۔ میں نے تو تھائی میں کبھی کسی کو برا نہیں پایا۔“

سچا کی سانسیں رکے لگتی۔ ”تو تم جتنی رہی ہو لڑکوں سے؟“

”بارہ!“ سیما نے کندھے جھٹک دیے۔

”اب تک کس کس کو یہ اعزاز عطا کر چکی ہو تم؟“ سچا اب غصے میں تھا۔

”تیس نہیں یاد۔ ہم تم بارہا تمہارے ہیں۔“

”میری اور بت ہے۔“ سچا نے سکون کی سانس لی۔

”اور عاطر عامر بھی۔“ سیما نے کہا۔ ”سب اچھے ثابت ہوئے۔ بس تم تنگ

اور پور ہو۔ عاطر اور عامر تین بائیں کرتے ہیں۔“

”تعریف کا شکریہ۔“ سچا نے تنگ لہجے میں کہا۔

”کٹھن نے کہا ہے کہ جسے کو چلیں گے۔ اس کے پاس بائیک ہے نا۔“

”تم ہرگز نہیں جاؤ گی۔“ سچا نے سخت لہجے میں کہا۔

”بھئی، میں پور ہو رہی ہوں بہت۔“

”میں نے کہا تھا۔“

”تم کیوں پابندیاں لگتے ہو مجھ پر؟ میں نے پیلا سے اجازت لی ہے۔“ سیما

لہتے کہتے رہی اور چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ ”ارے تمہارے پاس تو

گازی ہے۔ جسے کو کٹھن نے چلو مجھے۔ مجھے کٹھن سے کوئی خاص دلچسپی تو نہیں۔“

”چلو، ٹھیک ہے۔“ سچا ملن جاتا مگر اس بلیک میلنگ پر کڑواہٹا رہتا۔ پھر اس نے

فہم کیا کہ اب بلیک میل نہیں ہو گا۔ مگر سیما کے سامنے اس کے فیصلے یوں ڈھیر ہو

جاتے تھے، جیسے ساحل پر سر ہینکنے والی موجوں کے سامنے مٹی کے گھر ڈنڈے۔

اس روز ان دونوں کا پیرٹل تھا۔ سیما نے کہا۔ ”چائے تو پلو آؤ یار۔“

”یہ یادوار مت کہا کرو۔“ سچا چڑ کر بولا۔

”سب لڑکیاں ایسے ہی بات کرتی ہیں۔“ سیما نے معصومیت سے کہا۔

”تم مت کیا کرو۔ سب کو چھوڑو۔“

”اچھا، تم سے نہیں کروں گی۔“

”کسی سے بھی نہیں کرو گی۔“ سچا نے درشتی سے کہا۔

”اچھی زبردستی ہے۔ چلو چھوڑو، چائے تو پلو آؤ۔“

”یہ کون سی بڑی بات ہے۔ چلو کیٹین۔۔۔“

”نہیں۔“ سیاب نے برا سامنہ بناتے ہوئے اس کی بات کٹ دی۔ ”کیٹین ہسٹن میں نہیں گئے۔“

کیٹین ہسٹن کالج کے قریب ہی تھا۔ سہلو اکثر دوستوں کے ساتھ وہاں جاتا رہتا تھا لیکن سیاب کے ساتھ کیٹین ہسٹن جانے کا تصور بھی محال تھا۔ وہ بری طرح گزبوا کر وہاں میں نے کبھی لڑکوں کو ایک ساتھ نہیں دیکھا۔ اس نے گہرا کر کہا۔
سیاب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”ہاں! کئی ہی ہوئے تو یار۔ وہاں فیملی روم بھی ا ہیں۔“

”تمہیں کیسے معلوم؟“ سہلو نے اسے شک آمیز نظروں سے دیکھا۔

”اے بھئی! کئی کی کبھی لڑکیاں وہاں کسی نہ کسی کے ساتھ جا چکی ہیں۔“
”تم بھی جا چکی ہو؟“

”نہیں۔ لیکن آج جانا چاہتی ہوں۔ مجھے ریڈیو نٹ اور ہوٹل بہت اچھے۔“

ہیں۔ اب چلو بھی۔“ سیاب نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے گھینٹا۔

اس وقت وہ دونوں لائبریری میں تھے۔ اس طرح ہاتھ پکڑنے پر سہلو بوکھلا کر اس نے گہرا کر اوپر اوپر دیکھا۔ ”اچھا ہاتھ تو چھوڑو۔ چلا ہوں۔“

سیاب اس کے پلو پلو چند لمحوں تک اس کا ہاتھ تھامے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

یوں سہلو بار بار اس کے ساتھ گھوم پھرتا تھا مگر اس روز اس کی عجیب حالت تھی۔ خود کو چور محسوس کر رہا تھا۔ لگتا تھا ”ہر راہ گیر اسے اور سیاب کو گھور کر دیکھ رہا ہے۔“

وہ تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیاب کو اسے ٹوکنا پڑ گیا۔ ”بھاگے کیوں جا رہے ہو؟“

کیٹین ہسٹن کے فیملی روم دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ بہت بڑا ہال تھا جس میں دو رویہ بڑی پشت گاہوں والی نشستیں تھیں۔ یہ گویا فیملی روم کی دو دیواریں تھیں۔ تیسری جگہ کی دیوار تھی۔ چوتھی جانب داخلی دروازہ کھلے لیں۔ وہاں پہلا

موجود تھا۔ جیسا کہ تو پرہ کھینچ لیں۔ اور وہاں دمچی روشنی تھی۔ بڑا روانوی لمبا خواب ناک ماحول تھا۔ مگر سہلو کا وہاں دم گھٹ رہا تھا۔

ہال میں داخل ہو کر خالی نشست کی تلاش میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ تقریباً تمام میزیں بھری ہوئی ہیں۔ اور وہاں جوڑے ہی جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر کیف خاصا اندر جا کر انہیں بھی ایک میز میسر آ ہی گئی۔ راستے کے دوسری طرف والی میز پر بھی ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ وہ یوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ جیسے گرد و پیش سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ انہوں نے پردہ بھی نہیں کھینچا ہوا تھا۔ سہلو کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ جلدی سے چائے پی کر وہاں سے نکل بھاگے۔ اس خیال سے اس نے ویٹر کی تلاش میں اوپر اوپر نظریں دوڑائیں لیکن دور دور تک ویٹر کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ شے لگا تو سیاب نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”کہاں بھاگے جا رہے ہو۔؟“

”ویٹر کے لئے۔۔۔ آڈر دیتا ہے نا۔“

سیاب ہنسی۔ ”میل ویٹر کے دیر سے آئے کہ ان کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے ویٹر دیر سے آتے ہیں۔“

سیاب کی ہنسی کی وجہ سے دوسری طرف بیٹھے ہوئے جوڑے کو پہلی بار ان کی موجودگی کا احساس ہوا۔ لڑکے نے جلدی سے پردہ کھینچ لیا۔

”کیوں؟ میں سمجھا نہیں؟“ سہلو نے سیاب سے پوچھا۔

”عجیب بے وقوف آدمی ہو۔“ سیاب نے برا سامنہ ہوئے کہا۔ ”یعنی! میں بس رانا۔“ کچھ کہلایا پیا جاتا ہے۔ لوگ یہاں تھائی کے لئے آتے ہیں۔ اور ویٹر کو بل بھیجی پ دی جاتی ہے۔“

سہلو کا چہرہ ختم ہوا تھا۔ ”لا حول ولا قوت۔۔۔“

”کوئی غائب نہیں ہو گا لا حول سے۔ یہ سب انسان ہیں۔“

”میں ویٹر کو بلاتا ہوں۔“ سہلو پھر اٹھنے لگا۔

”بیٹھے رہو آرام سے۔“ سیاب نے سخت لہجے میں کہا پھر وہ مزے سے ہاتھیں لے لے لگی۔ لیکن سہلو کچھ نہیں رہا تھا۔ اسے تو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ کوئی پندرہ

ایں منٹ بعد ویٹر آیا۔ اس نے اسے چائے اور کیک پیش لائے کہ کیا اور سکون کی باتیں۔ وہ جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

رہ سکتے۔

چائے کے بعد وہ دیر کا انتظار کرتے رہے۔ ٹھک آکر سچو نے کلمہ ”چلو، کلونٹر پر ہی بل دے دیں گے۔“

”اچھا نہیں لگتا۔“ سچو نے کلمہ ”پرہ پٹا دو۔“

ذرا دیر بعد دیر گزرا تو سچو نے اس سے بل لانے کو کلمہ

باہر نکل کر سچو نے سکون کی سانس لی۔ لیکن ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔ ”میرا ایک پیڑ لکھ گیا۔“ اس نے تسف سے کلمہ ”چھوڑو یار۔ پڑھائی تو تم کرتے ہی رہتے ہو۔“ سچو بولی۔



”یہ تم کل آخری پیڑ میں کلمہ عتاب ہو گئے تھے؟“ اگلے روز قرآن سچو سے پوچھا۔

سچو نے اسے کینے شستن کے ایڈوچر کی تفصیل سنا دی۔ وہ دلچسپی سے سنتا رہا مگر اس کی آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔

سب کچھ سننے کے بعد قرآن نے کلمہ ”یار سچو، تم میرے دوست ہو۔ اب میں کچھ کموں گا تو برا تو نہیں مانو گے؟“

”کو تا بھائی، کیا ہے؟“

”یار، یہ تمہاری کرن بہت خطرناک لڑی ہے۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اچھی لڑی نہیں ہے۔“

”کیا کیواس ہے؟“ سچو کو اس کی بات سچ بچ بری لگی۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ برا مت مانتا۔ تمہاری بھلائی کے خیال سے کہہ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہاتھ پاؤں بچا کر چلو۔“

”کچھ پتا بھی چلے کہ بات کیا ہے۔“ سچو نے لہجہ نرم کر لیا۔

”دیکھو یار، وہ اچھی جگہ نہیں ہے۔“

”یوں۔۔۔ کلنگ کے لڑکے لڑکیوں سے ہی ہل بھرا ہوا تھا۔“

”تمہارا خیال ہے۔“ قرآن نے کمری سانس لے کر کلمہ ”وہ بدنام ریسٹورنٹ ہے۔“

دیر کے جانے کے بعد سیماب نے سچو سے کلمہ ”ذرا یہ پردہ کھینچ دو۔“

”لگتا۔۔۔ کیوں؟“

”اس لئے کہ یہ یہاں اسی لئے لگایا گیا ہے۔“

”چھوڑو۔۔۔ رہتے دو۔“

”میں تمہیں کھانا نہیں جاؤں گی۔“ سیماب نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

”کیا ضرورت ہے اس کی؟“

اتنی دیر میں دیر چائے اور ایک پیس لے آیا۔ اس کے جانے کے بعد سیماب نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ”کھانے پینے کی چیزوں کو نظر بھی لگ جاتی ہے۔ ہر آنے

جانے والا گھومتے ہوئے گزرتا ہے۔ پردہ کھینچ دو۔“

سچو نے پہلی بار سیماب کو بہت غور سے دیکھ دیکھ دی ایک ایسی تھی جسے نظر لگنے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے وہ اسے بہت اچھی لگی۔ اس نے پردہ کھینچ کر برابر کر دیا۔ اب وہ غلط میں تھے۔

سیماب چائے بنا رہی تھی۔ نظروں کی جھنجھ محسوس ہوئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھ سچو اسے والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”تم بہت اچھی۔۔۔ بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔“

”یا تو گنگھی، بندھی جا رہی تھی یا پردہ کھینچنے ہی میرے حسن کی تعریفیں شروع کر دیں۔ اس کے بعد دست دراز ہی بھی کرو گے۔“

”سچو کھسا گیا۔“ جی نہیں۔ تم جانتی ہو، میں ایسا نہیں ہوں۔“

کتنے کو تو اس نے کہہ دیا۔ لیکن سچو یہ ہے کہ دل سیماب کو چھونے کو چل رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ تھلائی کتنی تھنڈا انگیز ہوتی ہے۔

سیماب نے چائے بنا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ چائے پینے کے دوران میں وہ اوجھل اوجھل باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک سیماب نے پوچھا۔ ”سچو بچاؤ۔ کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟“

”اچھا لگ رہا ہے اور برا بھی۔“ بے تا عجب بات۔

”تم آدمی ہی عجیب ہو۔“ سیماب نے بیٹا کر کلمہ۔ ”تم مجھے لوگ کبھی خوش نہیں

شر بھر سے لوگ آتے ہیں۔ ہمارے کالج کی لڑکیاں کم ہی ہوتی ہیں۔۔۔ اور وہ ہوتی ہیں جو ابھی نہیں ہیں۔ سمجھے کچھ۔

”مجھے تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔“ سچو نے سیلاب کی مغللی پیش کرنے کی غرض سے کہل

”میں جو کہہ رہا ہوں تو یوں کہہ دو۔ اور اپنی اس کزن سے بھی ذرا دور ہی رہو۔ جلتے ہو، کالج کے کتنے لڑکے اس کی قربت کی کہانیاں سناتے ہیں۔“

”بگڑتے ہیں۔ وہ ایسی نہیں۔“

”چلو، نہ سہی۔ لیکن کینے جستن اچھی جگہ نہیں ہے۔“

”خرابی کیا ہے، یہ تو بتاؤ۔“

”دیکھو بھائی، ایسی جگہوں پر آئے دن پولیس چھاپے مارتی رہتی ہے۔ اب ذرا سوچ، چھاپا پڑا اور سب اندر۔ اور اگلے روز اخباروں میں تصویریں۔ گھر والے حناٹ کراتے پھرتے ہیں۔ ذرا سوچ تو یار۔“ قرن نے ڈر لائی انداز میں ہاتھ لراتے ہوئے کہل

”سچو لڑکر رہ گیا۔“ تم سچ کہہ رہے ہو؟

”او بھائی، ایسا ہو چکا ہے کئی بار۔ اخبار میں تصویریں تم نے بھی دیکھی ہوں گی۔ ہاتھوں سے چہرہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں لوگ۔“

”یقین نہیں آتا۔“ سچو نے لرزتی آواز میں کہل

”میں نے سمجھا دیا۔ آگے تم جانو۔“ قرن نے بے حد خفا ہو کر کہل

”سچو نے بے نیازی ظاہر کی مگر اندر سے وہ ہل گیا تھا یہ سچھلنے والا پہلو تو بہت ہی خطرناک تھا۔

چار دن بعد سیلاب نے پھر جانے کی فرمائش کی لیکن اس بار سچو نے صاف انکار کر دیا۔

”لیکن کیوں؟“

سچو نے قرن سے جو کچھ سنا تھا اس کی سماعت میں اضطراب دیا۔ ”اب یہ خطرو تو مول نہیں لے سکتے تھ۔“ اس نے آخر میں کہل

”کیا بکواس ہے یہ۔۔۔ خرافات۔۔۔ ہنہ۔“ سیلاب نے بے حد خفا ہو کر کہل

”بکواس نہیں، حقیقت ہے۔ اور پولیس والوں کو تو تم جانتی ہی نہیں۔ کسی کی بیب میں مائل شریف ہو تو وہ خود رکھ لیتے ہیں اور جس کی پڑیا برآمد کر کے دکھا دیتے ہیں۔ پھر اخبار میں تصویر، تصویر کے نیچے پشٹا کشین۔ تصویر اپنی ہو تو میرا خیال ہے، کشین پشٹا نہیں، زہریلا لگے گا۔“

”عجیب احق ہو تم۔ یہ تو زبردست ایڈیٹر رہے گا۔ اور اخبار میں تصویر کا مطلب مفت کی پلٹی۔“

سچو بری طرح ہنسا گیا۔ ”تم کیسی عجیب لڑکی ہو۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں۔۔۔“

”ہاں۔ شاید میں عجیب ہوں۔ سیلاب نے اس کی بات لکھ دی۔“ مگر یہ میری نفرت ہے جو دل چاہے، ضرور کرتی ہوں۔ اور سر عام کرتی ہوں۔ چھپ کر کچھ لڑنا میری فطرت میں نہیں۔۔۔“

”اس پر مجھے کشین یاد آگیا۔“ اس بار سچو نے اس کی بات لکھ دی۔ ”اخبار میں لکھا ہوتا ہے۔ سر عام بوس و کناہ۔“

سیلاب کا چہرہ تنہا اٹھ۔ ”مجھے بات پوری کرنے دو۔“ یہ کہتے کہتے اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ ایسی ہی ہل پل رنگ بدلنے والی لڑکی تھی۔ ”کسی کا ہاتھ تھامنے کو دل چاہے گا تو میں یہ کبھی نہیں سوچوں گی کہ کسی بیلک ٹیس پر ایسا کرنا مناسب نہیں۔ میں زندگی کو انجوائے منٹ سمجھتی ہوں۔ مجھے مردوں کی طرح آزادی سے گھومتا اچھا لگتا ہے۔ نت نئے ہوٹلوں میں کھانا کھانا کھانا پینا میری ہابی ہے۔“ اس کا لہجہ خواہناک ہو گیا تھا ”شاید مجھ میں نسوانیت کی کمی ہے۔“

سچو نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور فوراً ہی نظر جھکا بھی لی۔ ”نہیں۔ ایسا تو نہیں ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہل ”لیکن شاید تم ذہنی طور پر اب بھی انگلیز میں ہو۔ تم نے ابھی تک یہ تسلیم نہیں کیا، یہ پاکستان ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں پتا ہی نہیں کہ انگریز یورپ میں سب سے زیادہ قدامت پسند قوم ہے۔“

”پاکستانی معیار سے وہ بے راہ رہیں دیکھو سیلاب، سمجھنے کی کوشش کرو۔“ سچو نے اے۔ اے۔ شرقی روایات، اقدار اور باطل کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن جلد جب بھی اس کے ساتھ کیے شہنشاہ میں گیا اس پر چھاپے کی دہشت طاری رہی۔ تصور میں کبھی پولیس والے نظر آتے اور کبھی اخبار میں لکھی ہوئی اپنی اور سیلاب کی تصویر اور نیچے کٹکٹ۔



اب وہ آئی بی اے میں تھلہ سیلہ سے اس کا چچا جھوٹ گیا تھا لیکن وہ خوش نہیں تھلہ وہ سیلہ کو بہت مس کرتا تھا اسے اس پر جھللاہٹ بھی ہوتی تھی کہ وہ اس کے بغیر وہ بھی نہیں سلک اور وہ ساتھ ہو تو ابھن روتی ہے حقیقت یہ تھی کہ اس پر مختلف اوقات میں بہت متھلہ کیفیات طاری ہوتی تھیں۔ ابتدا میں تو آئی بی اے میں اس کا دل ہی نہیں لگ سیلہ اسے بہت یاد آتی تھی۔ علائکہ آئی بی اے میں بھی لڑکیوں کی کہ نہیں تھی۔ اور چنلہ ایک تو اس پر ملتقت بھی تھیں مگر اس کا ان میں سے کسی سے راہ و رسم بدلنے کو بھی نہیں چللا۔ وہ تو اکثر سیلہ ہی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا کہ عرصہ مگرزرا تو اس کی سمجھ میں اپنی ہے چھٹی کی وجہ بھی آگئی۔ اور اسے شاک لگ کہی عجیب بات تھی کہ اسے سیلہ پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ کلچر چھوڑنے کے بعد لاشوری طور پر پریشن رہا کہ سیلہ نبھلے کتے لڑکوں کے ساتھ پکڑ چلا رہی ہوگی۔ مگر یہ پریشنی تاریکی سے روشنی میں۔ یعنی لاشور سے شعور میں آ گئی۔ اس کی پریشنی اور ذہنی خلفشار کم ہو گیلہ لیکن اس پر غصہ آنے لگا کہ وہ کتے کھٹیا انداز میں سوچتا ہے۔ جبکہ وہ جانتا ہے کہ سیلہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں۔ لیکن لڑکوں میں تو کوئی ایسا ویسا ہو سکتا ہے۔ اس کے اندر کسی خدشے نے چلا کر کلہ صرف اپنے اپنے ہونے سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

دن عجیب انداز سے گزر رہے تھے۔ یہاں پر دعائی کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ فرصت کم

”چائے پینے کا موڈ ہو تو کیا کروں؟“

کرائے ہی پڑھائی کی فکر سوار ہو جاتی۔ آئی بی اے کے مسابقتی ماحول میں آرام کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ طلبہ پڑھائی کے دوران میں ہی آرام اور تفریح کے چھوٹے چھوٹے مواقع نکال لیتے تھے۔ گھر پر ریلیکس کرنے کا مطلب تھا کہ آپ مقابلے سے آؤ۔

اس روز وہ جاگا تو پڑھائی کی فکر کے ساتھ نہیں۔ وہ ایک مختلف دن تھا۔ وہ سیمپل کے خیال کے ساتھ جاگا تھا۔ اس نے یاد تھا کہ اس نے بہت طویل خواب دیکھا ہے۔۔۔ اور پورے خواب پر سیمپل چھائی ہوئی تھی۔ مگر اسے خواب بالکل یاد نہیں تھا۔ جاگنے کے بعد پانچ منٹ تک وہ بستر پر بیٹھا رہا۔ وہ بے اختیار سیمپل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

وہ بستر سے اس وقت اٹھا جب اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج غلہ کے گھر ضرور جائے گا۔ ایک دن ریلیکس کرنے سے پڑھائی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔ انا کا کہہ ہو گا۔ سیمپل سے مل کر وہ تازہ دم اور یک سو ہو جائے گا اور پڑھائی پر زیادہ توجہ دے سکے گا۔

لیکن وہ پاتھ روم سے نکلا بھی نہیں تھا کہ سیمپل خود آگئی۔ وہ پاتھ روم سے نکلا تو وہ کمرے میں موجود تھی۔ ”اوہ“ تم کب آئیں؟“ اس نے حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں اس سے پوچھا۔

”دس منٹ ہوئے ہیں۔“ سیمپل نے خنک لہجے میں کہا۔

سچلہ پڑھانے ہو گیا۔ وہ ناراض لگ رہی تھی۔ ”مجھ سے خفا ہو؟“

”کیا نہیں ہونا چاہئے؟“ سیمپل نے انا سوال کر ڈالا۔ ”سوچتی تھی، شاید تم بہت مصروف ہو۔ آئی تو پتا چل گیا کہ تمہیں بارہ بجے تک سونے کی مصروفیت لاحق ہو گئی ہے۔“

”تم نہیں جانتیں۔۔۔“

”پہلے نہیں جانتی تھی۔۔۔“ سیمپل نے اس کی بات کٹ دی۔ ”مگر اب جان گئی

ہوں۔“

”میری بات سنو۔۔۔“

ای ملتی تھی۔ غلہ کے گھر جانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اور سیمپل نے تو آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اسے اس بات پر بھی غصہ آتا تھا۔ وہ اگر مصروف ہو گیا ہے تو سیمپل تو اتنی مصروف نہیں ہے۔

لیکن آدی کتنا ہی مصروف ہو، اس کی پریشانیوں کو بچھا نہیں چھوڑتیں۔ اور پھر پریشانی کا تعلق دل سے ہو تو کیا کہہ دو۔ ہر وقت سیمپل کے متعلق سوچنے لگ۔ وہ اس وقت کیا کر رہی ہو گی۔ پوائز کلاس روم۔۔۔ کینے شبنم کا فیملی کیس۔۔۔ یہ وہ جگہیں اس کے تصور میں خاص طور پر ابھرتیں۔ وہ سیمپل کو بیشک کسی نہ کسی لڑکے کے ساتھ دیکھتا۔ پھر اسے کینے شبنم پر چھپا پڑا دکھائی دیتا۔ وہ بہت کرب ناک تصور ہوتا تھا۔ آگے روز وہ صبح کا اخبار نکھلا کہ کہیں چھاپے کی خبر تو نہیں چھپی۔

بڑی بات یہ تھی کہ اس سب کے باوجود اس کی پڑھائی ٹھیک چل رہی تھی۔ کلچر کی طرح آئی بی اے میں بھی وہ بہت اچھے طلبہ میں شامل ہو چکا تھا۔ سیمپل کی پریشانی نہ ہوتی تو شاید پہلی رزم میں ہی وہ سب سے اچھا طالب علم شمار ہونے لگتا۔

کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ فون کر کے ہی سیمپل کی خیریت معلوم کر لے لیکن غلہ کے گھر جانا ہی کون سی بڑی بات تھی۔ بس خود داری اسے روکتی تھی۔ اگر سیمپل کو اس کا خیال نہیں ہے تو اسے بھی اس کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے۔ سیمپل تو اتنی مصروف نہیں تھی۔ وہ آگئی تھی، مگر نہیں آئی۔ اس نے کبھی فون بھی نہیں کیا۔ تو وہ اس کے پیچھے کیوں بھاگے۔ ایک طرف تعلق بھی طویل اور دیرپا نہیں ہوتا۔

اس عرصے میں ہی ضرور ہوا کہ اس نے اپنے اور سیمپل کے تعلق کو سمجھ لیا۔ وہ سیمپل سے محبت کرتا تھا۔ عجیب محبت تھی۔ وہ سیمپل کی آواز ہی پر وہ جلا کر کھاتا رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اس کی قربت سے گھبراتا تھا۔ لیکن اس سے دور رہتا اور زیادہ تکلیف وہ تھا۔ کبھی اسے خیال آتا کہ اتنے مختلف مزاج کی لڑکی سے محبت تو خیال نہیں ہے۔ اچھا ہے کہ یہ تعلق آپ ہی ختم ہو رہا ہے۔ مگر یہ سوچتے سوچتے دل سے نہیں بھی اٹھنے لگتیں۔

ای طرح چار مہینے گزر گئے!

وہ چھٹی کا دن تھا۔ ہفتے بھر کا تھا کہ ہوا، اس دن وہ بہت ۔۔۔ تک سو آتا تھا۔ اور سو

مگر ایک لمحے میں سیلاب بدل گئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھری اور اسکا چہرہ روشن روشن لگنے لگا۔ ”چھوڑو ان باتوں کو۔“ اس نے خوش دلی سے کلمہ ”تو کہ یہ وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔“

سیلو جھنجھلائے لگے عجیب لڑکی تھی۔۔۔ چھا جانے والی۔ الٹا چور کو تال کو ڈانسنے کے مصداق آتے ہی شروع ہو گئی۔ اور اسے شکایت کا موقع بھی نہیں دیا۔

”اب چلو بھی۔“

”کہاں؟“ سیلو نے گھبرا کر پوچھا۔

”کہیں بھی۔۔۔ گارڈز میں۔“

”مگر میں نے ہشتا بھی نہیں کیا ہے۔“

”میں نے بھی ہشتا نہیں کیا ہے۔ تمہارے ساتھ ہی کدوں گی۔ پھر خوب باتیں کریں گے۔“

سیلو کی جھنجھلاہٹ غصے میں تبدیل ہو گئی۔ ”تم نے ہشتا کیوں نہیں کیا ہے؟“ اس نے آنکھیں نکالیں۔

”دیر سے اٹھی تھی۔ بغیر ہشتے کے یہاں آگئی۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں بھی دیر تک سونے لگی ہوں۔“

”جواب دینی سے بچنے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔ آتے ہی تابو توڑ ملے شروع کر دیئے۔ مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔“

سیلاب کے ہونٹوں پر تاہو ڈالنے والی مسکراہٹ ابھری۔ Best

defence is to attack

”مگر میں چھوڑوں گا نہیں۔۔۔“

”پہلے ہشتا۔“ سیلاب نے اس کی بات کٹ دی۔

ناشتے کے دوران میں سیلو پریشان کن سوچوں میں الجھا رہا۔ وہ بار بار سیلاب کو دیکھ کر اسے پہلے سے کمزور اور کچھ مڑھائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اور اس نے کہا تھا کہ وہ بھی دیر تک سونے لگی ہے۔ کیوں؟ وہ خود تو پڑھائی کی وجہ سے پورے بیٹھے بیٹھے پوری نہیں کر پاتا ہے۔ اس لئے چھٹی کے دن دیر تک سوتا ہے۔ اور سیلاب نے جس

انداز میں کہا تھا اس سے ایک دن دیر تک سونے کا تاثر نہیں ملتا تھا۔ وہ روز دیر سے اٹھتی ہے۔ کیوں؟ کالج کی مصروفیات؟۔۔۔ غیر نمٹتی مصروفیات! وہ اس بارے میں سوچتا رہا اور اس کی بھوک ختم ہو گئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ کیرم کھیلنے بیٹھے تو سیلو نے سیلاب سے پوچھا ”کالج کا کیا حال ہے؟“ اس نے کوشش کی تھی کہ سوال سرسری انداز میں کرے۔ پھر بھی ایسے لگے تھا کہ سیلاب اس کے لیے سے اصل بات پکڑے گی۔

”پہلے جیسی۔۔۔ سب کچھ پہلے جیسا ہے۔ کسی کی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بس تمہارا دوست قربت بجا بجا رہنے لگا ہے۔“

سیلو پوچھتا چاہتا تھا۔۔۔ اور تم؟ مگر ہمت نہیں ہوئی۔ پھر بھی اس نے پوچھا ”تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“

”میں تو کالج لائف کو خوب انجوائے کر رہی ہوں۔“ وہ چمک کر بولی۔ ”تمہارے کالج سے جانے کے بعد مصروفیات بھی بڑھ گئی ہیں۔ آزاد ہو گئی ہوں۔“

اب سیلو سے رہا نہیں گیا۔ ”کیفے شیشن جاتی ہو؟“ اس نے لہجہ سرسری رکھنے کی کوشش کی۔

”روز۔۔۔ مگر چھپا آج تک نہیں پڑا۔“ سیلاب کا لہجہ مضحکہ اڑانے والا تھا۔

سیلو کا دل بچھ گیا۔ گویا اس کا اندازہ درست تھا۔ ”تمہیں میں یاد نہیں آتا؟“

”آتے ہو۔ اور ہر بار غصہ آتا ہے۔ تم نے تو مجھے چھوڑ ہی دیا۔“

”مصروفیت ہی اتنی ہے۔ تمام مضامین نئے ہیں۔ بہت توجہ دینی پڑتی ہے مگر تم آ کئی تھیں۔“ سیلو نے شکایت کی۔

”میں بھی بہت مصروف ہو گئی ہوں۔ کالج سے بھی دیر سے ہی آتی ہوں۔۔۔“

اب سیلو میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ کالج سے دیر سے آنے کا سبب پوچھتا۔ ”اور شام کی بھی ایک مصروفیت لگائی ہے۔“ سیلاب کہتی رہی۔ ”کچھ میں یوں ہی نہیں آئی کہ جب تم نے چھوڑ دیا تو مجھے کیل اور اتنی مصروفیات میں کسی کو یاد نہ لہنا آسان نہیں ہوتا۔“

”تو پھر اب کیوں آگئیں؟“ سیلو نے تلخی سے کلمہ

”میں نہیں چاہتی کہ جیسے میں تیس بھول گئی، تم بھی مجھے بھول جاؤ۔“
اس پر سہلو مارے غصے کے لنگ ہو گیا۔۔۔

اس کے کوئی ایک ماہ بعد غلام ان کے ہاں آئیں۔ اکیلی تھیں۔ ”افریمائی کیوں نہیں آئے؟“ ای نے پوچھا۔ ”بت عرصہ ہو گیا انہیں ہمارے ہاں آئے۔“
”معروف ہی اتنے ہیں۔ کاروبار بننے کے مرحلے میں ہے۔ ان دنوں کچھ پریشان بھی ہیں۔“ غلام نے کہا۔

”تو سیلاب کو تو لے آئیں۔“

”وہ صحتی ہوئی تھی۔ بت کہا، لیکن نہیں ملائی۔“

”وہ بہت کمزور ہو رہی ہے آج کل۔“ ای نے تشویش سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“
سہلو سر جھکائے بیٹھا تھا لیکن کان غلام کی طرف لگے تھے۔

”ہر وقت پڑھائی میں لگی رہتی ہے۔ فرسٹ ایئر میں پرنسپل کی کمی تھی۔ کتنی ہے، اس کی خلائی کرنی ہے۔ پھر آئی بی اے میں داخلے کی بھی اسے بڑی فکر ہے۔ اس کی تیاری الگ کرتی ہے۔ کتنی ہے، داخلے کا ٹیسٹ بہت مشکل ہوتا ہے۔ نیند تک پوری نہیں ہوتی بے چاری کی۔“

سہلو کو غلام پر ترس آیا اور سیلاب کی مکاری پر غصہ آیا شرت پڑھائی کی۔۔۔ اور تفریح کرتی پھرتی ہے۔ زندگی کو انجوائے کرنا ضروری ہے۔۔۔ وہ بھی من چاہے انداز میں۔۔۔

ان دنوں سہلو، سیلاب کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے اور کڑھنے لگا تھا۔ کبھی کبھی تو پڑھائی میں بھی دل نہ لگتا۔ وہ سوچتا، کاش یہ روگ نہ لگا ہوتا۔ تب وہ سکون اور یکسوئی سے پڑھائی کر سکتا تھا۔

تیسری نرم ختم ہوئی اور چھٹیاں ہوئیں تو ذرا فرصت ہوئی۔ وہ پورا دن گزارنے کی غرض سے غلام کے گھر چلا گیا۔ وہ اپنے صاحب سے کالج کی چھٹی سے پہلے گیا تھا تا کہ یہ تاثر نہ قائم ہو کہ وہ صرف سیلاب کی وجہ سے آیا ہے۔ سوچا تھا، غلام سے خوب باتیں کرے گا۔

وہ غلام کے پاس بیٹھا، چائے پی اور ان سے باتیں کرتا رہا۔ پھر غلام نے کہا

سیلاب سے نہیں ملو گے؟

”وہ تو کالج گئی ہوئی ہو گی۔“

”نہیں۔ آج ہی سے چھٹیاں شروع ہوئی ہیں۔ اسی مہینے امتحان ہے۔ وہ اپنے کمرے میں ہے۔“

سہلو اوپر چلا گیا۔ سیلاب پڑھائی میں یوں منہمک تھی کہ اسے دروازہ کھلنے اور سہلو کے اندر آنے کا بھی پتا نہیں چلا۔ بالآخر سہلو کو کھٹکار کر اپنی آمد کا اعلان کرنا پڑا۔

سیلاب نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ ”ارے تم! کب آئے؟“

”دیر ہو گئی۔ پانچ منٹ سے تو اس کمرے میں ہی ہوں۔“

”مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“

”کوئی بہت دلچسپ ناول پڑھ رہی ہو؟“

وہ جھنجپ گئی۔ ”نہیں۔ کورس کی کتاب ہے۔“

”تو اتنا اہمک!“

”پورے سال پڑھائی نہیں کی ہے۔ اب امتحان سر پر آگئے ہیں تو تیاری تو کرنی ہے۔“ سیلاب کے لہجے میں معذرت تھی۔

”آئی بی اے میں یوں تو ایڈمشن نہیں ملے گا۔“

”تو نہ ملے۔“ سیلاب نے بے پروائی سے کہا۔ ”مجھے بہت پڑھ کرنا بھی کیا ہے۔

بس ڈگری میں دلچسپی ہے مجھے۔ ایم بی اے نہ سہی، ایم اے کر لوں گی۔ ایک بی ای کا تو فرق ہے۔“

سہلو کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ ”میں چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیوں؟ اتنی سی دیر کے لئے آئے تھے؟“

”نہیں۔ کیا تو دن بھر کے لئے تھا مگر تمہاری پڑھائی میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔“

”ارے چھوڑو پڑھائی کس۔۔۔ ہو جائے گی۔“ سیلاب نے کتاب ایک طرف ہٹائی اور

اٹھ گئی۔ ”تفریح بھی ضروری ہے پڑھائی کے لئے۔“

وہ پورا دن ان دونوں کے ساتھ گزارا۔ سیلاب نے پڑھائی کا نام بھی نہیں لیا۔

”مجھے یقین نہیں آتا۔“

”مجھے بھی یقین نہیں آتا تھا مگر کرنا پڑا۔ اور یہ بھی سن لو کہ وہ کم از کم کلچ میں باپ ضرور کرے گی۔“

”حیرت ہے۔“

سجلا کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر چلا آیا۔ قمر کے پاس وہ ڈرتے ڈرتے اپنے بدترین اندیشوں کی تصدیق کے لئے گیا تھا لیکن وہاں اس کی تمام الجھنیں اور پریشانیں دور ہو گئیں۔ اور یہ نتیجہ تو وہ پہلے ہی اخذ کر چکا تھا کہ سیلاب دہری شخصیت کی مالک ہے۔

اس کے وجود سیلاب نے انٹر کے امتحان میں پورے بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی تو اسے حیرت ہوئی۔ ہاں، آئی بی اے کے نیٹ میں سیلاب نے ٹاپ کیا تو اسے حیرت نہیں ہوئی۔ اس وقت تک وہ اس بات پر یقین کر چکا تھا کہ سیلاب جو چاہے کر سکتی ہے۔

آئی بی اے میں داخلے کے بعد وہ پھر اس کے قریب آگئی۔ پھر وہی متضاد کیفیات، وہی مسائل!!!



سجلا نے چونک کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ بارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ اس نے دل کی دھڑکنوں میں تیزی آگئی۔ وصل یار کی ساعت قریب آچکی تھی۔ اس نے چاکر اب تیاری شروع کر دے گا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ابھی اس کے پاس دس منٹ کی مسلت اور ہے۔ اور ماضی کو دہرائے میں اسے جو لطف آ رہا تھا، وہ اس سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

مگر اب اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ ہاں، وہ چھوٹے چھوٹے، لیکن اہم واقعات دہرا سکتا تھا۔

وہ پھر یادوں میں کھو گیا۔ چھوٹے چھوٹے منظر اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے!



کلچ کے مقابلے میں آئی بی اے کا ماحول بے حد آزارو تھا۔ وہاں لڑکے لڑکیاں

انہی چٹھوں میں ایک دن سجلا کو قمر سے ملنے کا خیال آگیا۔ وہ مانتا نہیں چاہتا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ صرف سیلاب کی وجہ سے اس سے ملنے جا رہا تھا۔ قمر اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ ”ہماری یاد کیسے آگئی۔“ اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ”تم تو ہمیں یوں بھول گئے جیسے ہم کچھ ہیں ہی نہیں۔“

”یہ بات نہیں یار۔ بس فرصت ہی نہیں ملتی۔“

دو دنوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ کلچ کی باتیں بھی ہوئیں پھر قمر چونکا۔

”ارے یا سہ۔ وہ تمہاری کرن ہے نا۔ سیلاب۔۔۔“

سجلا کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ ”کیا ہوا اسے؟“

”ہوا تو کچھ نہیں مگر وہ بڑی باکل نگلی۔ اس نے تو حیران کر دیا مجھے۔“

”اور اب میں حیران ہونے والا ہوں۔“ سجلا نے سختی سے سوچا۔ پھر جلدی سے بولا۔

”تم بتانے کی ضرورت نہیں۔ صرف تعداد بتاؤ؟“

”کس کی؟“ قمر نے حیرت سے پوچھا۔

”سیلاب کے بوائے فرینڈز کی۔“

”ایسی بات ہوتی تو حیرانی کسے ہوتی۔ یار، معاملہ برعکس ہے۔“

سجلا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اس سال وہ بالکل بدل گئی۔ تم جانتے ہو کہ کلچ کے تمام قاتل ذکر لڑکے اس کے لئے آہیں بھرتے ہیں۔ پہلے وہ سب سے بات بھی کر لیتی تھی۔ ان کے ساتھ چائے پینے بھی چلی جاتی تھی مگر اب تو وہ کسی سے بات بھی نہیں کرتی۔ ہوائز کلاس روم کیا، گٹر لکسن روم کے قریب بھی نہیں چٹکتی۔ لائبریری اس کا سب سے پسندیدہ ٹھکانہ ہے۔ خلی بیڑے میں وہ لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتی ہے۔ چٹکی کے بعد بھی دیر تک لائبریری میں رہتی ہے۔ وہ تو بالکل بدل گئی بھائی۔۔۔“

سجلا منہ کھولے سے یہ کچھ سن رہا تھا۔ ”لیکن وہ تو کہہ رہی تھی۔۔۔“

”ہاں یار۔ آدی کسی کبھی تبدیل ہو جاتا ہے اچانک۔ لیکن اس جو دیکھ چکا ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ایک لڑکی میں کم از کم دو لڑکیاں موجود ہیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ چار ہوں۔“

ساتھ گھومتے اور کسی کو پرواہ بھی نہیں ہوتی۔ فارغ وقت میں لالان میں ہمیشہ کئی جوڑے بیٹھے نظر آتے۔ سجاد کو تو کبھی اس سے غرض ہی نہیں رہی تھی۔ لیکن سیماب کو تو وہ ماحول نعمت کی طرح لگا۔ مچھلی کو خوش رنگ، شگاف پانی کا خوب صورت تلاب مل گیا تھا۔

پہلے روز وہ اسے آئی بی ایس میں ملی تو بہت خوش تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ خواہ سجاد بھی بہت خوش تھا۔ اسے قمر کی بات یاد تھی، جس نے بتایا تھا کہ سیماب بالکل بدل گئی ہے۔ اور اس کا ثبوت بھی مل گیا تھا۔ وہ اپنی محنت اور یکسوئی کے زور پر تعلیم کے میدان میں بہت آگے نکل گئی تھی۔

”کیسا لگا تمہیں؟“ سجاد نے پوچھا۔

”بہت اچھا۔ کالج سے بہت مختلف۔“

”کلاس کے طلبہ سے ملیں؟“

”ہاں۔۔۔ اور تین دوست بھی بنا لئے۔“

سجاد کی یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ سیماب کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

”مگر یہ ہے کہ اپنی کلاس کے لڑکے مجھے اہل نہیں کرتے۔ ان سے دوستی کرنے میں لطف آتا ہے، جو ہم سے آگے ہوں۔“

شاید اس کا اشارہ سجاد کی طرف تھا۔ سجاد کا چہرہ تھما اٹھا مگر اگلے ہی لمحے اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔

”تم اپنی کلاس کے کچھ اچھے لڑکوں سے مجھے ملوا دو۔“ سیماب نے فرمائش کی۔ چند لمحے تو سجاد سے بولا ہی نہیں گیا پھر اس نے کہا۔ ”میری تو اپنی کسی سے دوستی نہیں ہے۔“

”تم عجیب آدم ہیں آوی ہو۔“

”میں مضامین بہت وقت طلب ہیں۔“ سجاد نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ ”فرصت ہی نہیں ملتی۔ یاد نہیں، تم سے بھی ملنا ختم ہو گیا تھا۔“

”مجھے تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں۔ میں صرف ایڈمشن دشوار ہے۔ اسی

لئے تو میں نے اتنی محنت کی اور اب مجھے یقین ہے کہ میں یہاں سے ڈگری لے کر ہی نکلوں گی۔“

”میں یہاں سے نالچ اور قابلیت لے کر نکلتا چاہتا ہوں۔“ سجاد نے خشک لہجے میں کہا۔

”وہ خود بہ خود مل جاتی ہے۔“ سیماب نے بے پرواہی سے کہا۔

اس روز چھٹی کے بعد وہ ملے تو سجاد نے سیماب سے پوچھا۔ ”تم آئی کیسے تھیں؟“

”پرائنٹ کی بس سے آئی تھی۔“

سجاد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ خالو جان ایسے تو نہیں تھے۔

سیماب نے اس کی حیرت بھانپ لی۔ ”بیلا تو اصرار سے گاڑی دے رہے تھے۔ میں نے خود انکار کر دیا۔“

”کیوں بھی؟“

”ابھی میرے پاس زندگی سے لطف اٹھانے کے لئے بے فکری کے چند سال ہیں۔ انہیں کیوں ضائع کروں۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں کوئی ذمہ داری اٹھانا نہیں چاہتی۔ کار کی بھی نہیں۔ میں نے بیلا سے کہہ دیا کہ سجاد مجھے لے جایا کرے گا اور اسی کے ساتھ آ جاؤں گی۔“

پہلے چند لمحوں میں تو سجاد یہ سوچتا رہا کہ یہ سجاد کون ہے اور جب بات سمجھ میں آئی تو اس نے گڑبڑا کر کہا۔ ”میں۔۔۔ میں تو پانچ پر آتا ہوں۔“

”یہ اور بھی اچھا ہے۔ کار کی بہ نسبت پانچ مجھے پر لطف لگتی ہے۔“

سجاد کا دل دھڑک اٹھا۔ اتنی قربت، جس کو وہ رستہ تھا۔ لیکن کہہ نہیں سکتا تھا۔

یہ آرویل کہ۔ اس نے خوش دلی سے کہا۔

وہ پارکنگ کی طرف چل دیئے۔ سجاد نے کنگ مارکر پانچ اشارت کی اور بولا۔ ”پلو۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔“

لیکن سیماب بیٹھی تو وہ اچھل پڑا۔ اسے ایسا لگا کہ سیماب لڑکوں کے سے انداز

میں بیٹھی ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ سیلاب پھیلی سیٹ پر ایک طرف ہو کر بیٹھنے کے بجائے دونوں طرف پاؤں لٹکا کر لڑکوں کی طرح بیٹھی تھی۔
”یہ کیا....“ اس نے گہرا کر اسے ٹوکا۔ ”یہ کیسے بیٹھی ہو۔“

سیلاب نے اپنا تفصیلی جائزہ لیا اور بولی۔ ”ٹھیک تو بیٹھی ہوں۔“

”دونوں ٹانگیں اس طرف کر کے بیٹھو۔ جیسے لڑکیاں بیٹھتی ہیں۔“

”واہ اتنا زیادہ فاصلہ ہے۔ اس طرح تو میرا جسم آکر رہ جائے گا۔“

”کچھ بھی ہو۔ بیٹھنا تو ایسے ہی ہے۔“ سیلاب کے لیے میں خوش قسمت تھی۔

”احسان کرنے کا یہ مطلب ہے کہ تم حکم چلانے لگو۔“ سیلاب نے برہمی سے کہا۔

”نہ میں احسان کر رہا ہوں نہ حکم چلا رہا ہوں۔“ سیلاب نے طلحی سے کہا۔ ”جہیں طریقہ قصہ بتا رہا ہوں۔“

سیلاب پھیلی سیٹ سے اتر گئی۔ ”تم پابندیاں بہت لگاتے ہو.... اور مجھے یہ بات قبول نہیں۔ تم جاؤ، میں پوائنٹ کی بس سے چلی جاؤں گی۔“

یہ ایک اور مسئلہ تھا ان کے ساتھ۔ سیلاب درست ہوتا تھا مگر اس کے باوجود اسے شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے کھیا کر کہا ”یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟“
”میں ہر کام اپنی مرضی سے کرتی ہوں۔ یہ نہیں چلے گا کہ ایسے بیٹھو اور ایسے نہ بیٹھو۔“

”اچھا بابا، بیٹھ جاؤ اور مجھے تماشہ بوا دو۔“ سیلاب نے ہاتھ جوڑ لئے۔

”تمہیں تماشہ بننے کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے۔“

”اسی دنیا میں رہتا ہوں اور اسی دنیا میں رہتا ہے مجھے۔ خیر.... بیٹھو۔“

اس روز سیلاب کو گھر ڈراپ کرتے ہوئے وہ واپس آیا تو پورا دن اسی مسئلے پر سوچتا رہا اور کھولتا رہا۔ بلاخر اس نے فیصلہ کیا کہ سیلاب کی اس خد کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے گا چنانچہ اگلی صبح اس نے سیلاب کو سبھانے کی کوشش کی۔

”بھئی تمہارا میرا ساتھ چلنے والا نہیں۔“ سیلاب نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم جاؤ۔ میں خود آ جاؤں گی۔“

”مگر میری بات....“

”دیکھو جن تین لڑکوں سے میری دوستی ہوئی ہے وہ سب بایک والے ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو۔“

سیلاب گہرا گیا۔ جانتا تھا کہ یہ خالی غولی بلک مینگ نہیں۔ وہ اس پر عمل بھی کرے گی۔ کالج میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا اور وہ اسے دہرانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سو اس نے جھکے جھکے لہجے میں کہا۔ ”چلو بیٹھ جاؤ اور جیسے ہی چاہے بیٹھو۔“

”میری کام ہنسی خوش بھی ہو سکتا تھا۔“

”ہاں، ہو سکتا تھا لیکن ہوا نہیں۔“

اس دن کے بعد یہ معمول بن گیا۔ اور سیلاب صرف لڑکوں کی طرح بیٹھتی نہیں تھی۔ جب ہی چاہتا اس کی کر تمام لیتی کھدے پر سر لگا دیتی۔ ایسے میں سیلاب کو لگتا کہ وہ بھی دھری شخصیت کا مالک ہے۔ کیونکہ ایسے میں اسے غصہ بھی آتا تھا وہ گہرا کر اودھر اودھر بھی دیکھتا مگر اسے خوش بھی ہوتی تھی۔ رگ و پے میں بے خودی سے دوڑتی رہتی تھی۔



اب سیلاب کھرت سے اپنے اور سیلاب کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اب تک اسے احساس ہو چکا تھا کہ وہ سیلاب سے محبت کرتا ہے لیکن یہ محبت بہت دشوار اور اس کے لئے بہت بڑی آزمائش تھی۔ حالانکہ ان کی راہ میں کوئی روایتی دیوار نہیں تھی۔ غلام جان شاید اس رشتے کے حامی نہیں تھے لیکن وہ روشن خیال آدمی تھے اور یہ طے تھا کہ سیلاب کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کبھی نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان ایک دیوار تھی۔ بلکہ دو دیواریں کھنے۔ اور وہ دیواریں وہ دونوں آپ ہی تھے۔

دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سیلاب آزاد خیال ہونے کے ساتھ قدامت پرست بھی تھا جبکہ سیلاب ہواؤں کی طرح آزاد تھی۔ سیلاب شرمیلا تھا جبکہ سیلاب بے باک تھی۔ وہ اعتیاد پسند تھا اور سیلاب مہم جو۔ اسے روایات عزیز تھیں اور سیلاب مجسم بغاوت۔ راہ کی دیواریں گرانا سیلاب کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن

شاوی اسی لڑکی سے کروں گھ۔

”واہ کوئی زبردستی ہے میری مرضی کے بغیر تو نہیں کر سکتے۔“ سیاب نے چیخ کر کہا۔

”ظاہر ہے۔ میں یہی تو کہہ رہی ہوں کہ تم اجازت دو تو میں اہی کو تمہارے گھر لاؤں۔“

”اپنے دیکھے بھالے بغیر کیسے اجازت دے دوں۔“

”تم نے دیکھا تو ہے انہیں۔ اور یقین کرو، وہ بہت اچھے ہیں۔ ڈاکٹر ہیں۔“
”دیکھا تو ہے مگر ان سے ملوں، انہیں سمجھوں اور جانوں، تبھی فیصلہ کر سکتی ہوں۔ میں اندر سے کنوئیں میں تو چھلاگ لگنے والی نہیں۔“

”اچھا، یہ تو بتا دو کہ گنجائش تو ہے نا۔ میں تمہاری ان سے تفصیل سے ملاقات کرا دوں گی۔“

”گنجائش تو ہے۔ اس لئے کہ میں کہیں commit نہیں ہوں۔“ سیاب نے کہی سانس لئے کر کہا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے۔“ رافہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں پھر بات کروں گی۔ تم سے۔“

سیاب کو محسوس بھی نہیں ہوا کہ یہ سب سن کر سچو کو چپ لگ گئی ہے۔
درحقیقت سچو بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ اس کی بے خبری میں کوئی امتحان اس کے سر پر آگیا ہے۔ اس نے اس کے لئے تیاری بھی نہیں کی اور اب اس کے پاس وقت بھی بقیہ کم ہے۔ حالانکہ اس امتحان کے لئے تیاری کرنے کی اس نے کئی بار بڑے غلوں سے کوشش کی تھی۔ وہ آئینہ اسے ہر بار یہی بتاتا تھا کہ اظہار کرتے ہوئے وہ ہوشیو ہو جاتا ہے اس کے بلوجود اس نے سیاب کے سامنے اظہار کا ارادہ کیا۔ کوشش بھی کی۔ لیکن آواز بند ہو جاتی تھی اور پسینے جھوٹے لگتے تھے۔ آخر تنگ آکر اس نے یہ ارادہ ہٹا کر دیا۔

مگر اب اسے احساس ہوا کہ یہ ضروری ہے۔ سیاب کو commit کے بغیر کچھ اہی نہیں ہو سکتا۔ سیاب اہی کو بھی وہی جواب دے سکتی تھی، جو اس نے رافہ کو دیا

سیاب کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سو اس نے نامکن کو ممکن کر دکھایا۔ اس نے سچو سے وہ کروا دیا، جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی اظہار محبت!

اس روز وہ دونوں لان میں بیٹھے تھے کہ رافہ آگئی۔ وہ سیاب کی کلاس فیلو تھی۔ اس نے آتے ہی سیاب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”تم یہاں بیٹھی ہو، اور میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔“

”کیا بات ہے؟ میںیں بیٹھ جاؤ۔ اس وقت اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔“ سیاب نے کہا۔

”ایک بات میں کب سے کرنا چاہ رہی ہوں تم سے۔ موقع ہی نہیں ملتا مگر آج کر کے رہوں گی۔“

”تو کر لو۔“

رافہ نے کن انکھیں سے سچو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اٹ از نو پرستل۔“

”سچو کی پرواہ نہیں کرو۔ یہ میرا کزن بھی ہے اور بچپن کا دوست بھی۔“

”جب تو اور بھانتب ہے۔ چلو نا۔“ رافہ نے اسے کھینچنے کی کوشش کی۔

سچو بے حد مذہب اور خوش اطوار تھا۔ جانتا تھا کہ ایسے میں اسے اٹھ جانا چاہئے۔ لیکن کوئی اچھلی جس اسے بتا رہی تھی کہ یہ کوئی بہت اہم بات ہے، جس سے اس کا تعلق بھی ہے۔ چنانچہ وہ ڈھٹائی سے پیشا رہا۔

”سچو سے میں ہر طرح کی بات کر سکتی ہوں۔“ سیاب نے کہا۔ ”تم بے فکر ہو کر بات کرو۔“

رافہ چند لمے ہچکچاتی پھر گھاس پر بیٹھ گئی۔ ”تم جانتی ہو کسی کہ میں پہلے ہی دن سے تمہیں پسند کرتی ہوں۔۔۔ بہت زیادہ۔ جی چاہتا ہے ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔“

”جو کہ نامکن ہے۔“ سیاب نے تبصرہ کیا۔

”ایسی بات نہیں۔ سنو تو۔ تم نے میرے بھائی جان کو دیکھا ہے؟“

”ہاں شایہ۔۔۔ ابھی پرسوں ہی تمہاری سالگرہ کے دن۔“

”پرسوں انہوں نے بھی تمہیں دیکھا۔ جب سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitani point

Scanned By Wagar Azeem Pakistanipoint

”اس لئے کہ رہا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں..... اور شادی کرنا چاہتا ہوں
 تم سے۔“ اس کیفیت میں سب کچھ کہہ سکتا تھا۔
 ”شادی! ہنہ! یوں کہ میرے پیروں میں بیڑیاں ڈالنے کا شوق ہے۔ قابض
 و نا چاہتے ہو مجھ پر۔“ سیاب نے غصے اور حقارت سے کہہ۔ ”لیکن مجھے اپنی آزادی
 مت عزیز ہے۔ میں تمہیں اس کا موقع کبھی نہیں دوں گی۔“

”میری بات تو سنو۔“ سجاد غصہ اڑنے لگا۔
 ”مجھے اندازہ ہے کہ تم سے شادی کر کے میرا کیا خبر ہو گا۔ گھٹ کے رہ جاؤں گی
 بس۔ میں بے وقوف نہیں ہوں۔“

”تم آزادی کو پتا نہیں کیا سمجھتی ہو۔۔۔۔۔“
 ”تمہیں اس کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ سیاب نے سرد لہجے میں
 کہا۔ ”اور سن لو، میں یہ قلم ضرور دیکھوں گی۔ کسی کے بھی ساتھ چلی جاؤں گی۔“
 اب بات سجاد کی برواٹ سے بالکل باہر ہو گئی تھی۔ ”تو تم بھی سن لو۔“ اس
 نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے چیلنج کرنے والے انداز میں کہہ۔ ”جس دن تم یہ قلم
 مجھے سینا ہال میں داخل ہوئیں، خواہ اپنی کسی سیٹیلی کے ساتھ ہو، اس دن کے بعد میں
 تمہاری صورت دیکھنا، آواز سننا، حتیٰ کہ تمہارے بارے میں سوچنا بھی قبول نہیں کروں
 گا۔ اور اس امجد کو تو میں کل ہی دیکھ لوں گا۔ شاید تمہاری سمجھ میں آجائے کہ مرد کیا
 ہوتا ہے۔“

اس کے لہجے میں اتنی سفاکی تھی کہ سیاب لرز کر رہ گئی۔ ”تمہیں امجد سے اچھے
 لی ضرورت نہیں۔“
 ”البتہ کیا ہوتا ہے۔ میں اسے اتنا ماروں گی کہ وہ کم از کم ایک ہفتے اپنے پیروں پر
 نہ اُٹھیں ہو سکے گا۔“ غصے سے سجاد کی آواز لرز رہی تھی۔
 سیاب کا چہرہ فق ہو گیا۔ ”پلیز۔۔۔۔۔ امجد سے کچھ نہ کہنا۔“ اس کا لہجہ التجائیہ ہو

”یوں نہ کہوں۔۔۔۔۔“
 ”اس لئے کہ میں نے بھوٹ بولا تھا۔ مجھ سے اس قلم کی کسی نے تعریف نہیں

”نہیں۔ مرد غصہ پی جیلا کرتے ہیں۔“
 ”تو خاموش کیوں ہو؟ خفا ہو گئے؟“
 ”ہونا چاہیے تھا۔ لیکن خفا ہو نہیں سکتا۔“
 ”یہ بتاؤ، کہاں چلنا ہے۔“
 ”پیسل سینا چلیں گے۔ وہاں بڑی زبردست قلم چل رہی ہے۔“

سجاد کو فلموں سے دلچسپی نہیں تھی۔ نہ اسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کہاں کون
 قلم لگی ہے اور کیسی ہے۔ لیکن سیاب نے جس قلم کا نام لیا تھا، اس کے متعلق
 بہت لوگوں سے سن چکا تھا۔ ایک تو وہ صرف باغیان کے لئے ریلیز کی گئی تھی
 دوسرے اس میں خطرناک حد تک گرم مناظر تھے۔ مخفیہ یہ کہ وہ بڑی بدنام قلم تھی۔
 تمہیں کس نے بتایا کہ وہ بڑی زبردست قلم ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”امجد نے بتایا تھا۔ اس نے تو مجھے وہ قلم دکھانے کی پیشکش بھی کی تھی۔“
 سجاد نے موٹر سائیکل ایک طرف روک دی۔ ”بے وقوف لڑکی، وہ بہت گندی
 ہے۔“ اس نے پلٹ کر سمجھانے والے انداز میں کہہ۔ ”امجد کو جرات کیسی ہوئی کہ
 تمہیں یہ قلم دکھانے کی آفر کرے۔“

”اس میں حرج ہی کیا ہے؟“
 ”تم نے میری بات سنی نہیں۔ وہ بہت گندی قلم ہے۔“
 ”تو کیا ہوا۔ ہم دونوں عاقل و بالغ ہیں۔ اور پھر میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔“
 ”ایسی قلم دیکھنے کے لئے کوئی عورت جائے تو میں اسے عورت ماننے سے؟
 انکار کروں گا۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟ کیا وہ عورت نہیں رہے گی؟“ سیاب نے
 لانے والے انداز میں کہہ۔

”کیوں مت کرو۔ تم حد سے گزر رہی ہو۔“ سجاد آپے سے باہر ہو گیا۔
 سیاب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اتنے سخت
 اور لہجے میں اس سے بات کی تھی۔ ”یہ تم کس طرح بات کر رہے ہو مجھ سے۔“

کی۔ میں نے تو اخبار میں اشتہار دیکھا تھا اس کا۔

سجلو نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ ایسے چھوٹے بچوں کی طرح پشیمان نظر آ رہا تھی؛ جس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ جانتا تھا کہ سیلاب تقریباً بھوٹ بولتی ہے۔ لیکن اس معاملے میں وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ ”میں کیسے مان لوں۔ میں تو امجد سے ضرور بات کروں گا۔“

”پلیز!۔۔۔ اچھا! میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہ قلم کبھی نہیں دیکھوں گی۔“

سجلو نے چتر لے کر سوچنے کے بعد کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں امجد کو بخشنے دیتا ہوں۔“



اس روز سجاو، قمر سے ملنے کے لئے گیا۔ اس سے ملنا کم ہی ہوتا تھا مگر ایک دفعہ اس کا راز دار دوست تھا۔ اسے مشورے کی ضرورت تھی اور وہ قمر کے سامنے دل بوجھ بھی بٹا کر سکتا تھا۔

قمر نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔ ”ایک بات طے ہے۔ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔“

”یہ میرا من پسند نتیجہ کیسے نکلا تم نے۔“ سجلو نے طنز لہجے میں کہا۔

”یہ سب کچھ وہ تمہارے ساتھ تمہاری موجودگی میں ہی کرتی ہے۔ تم آئی فو اے میں گئے تو اس نے کلچ میں اپنی روش تبدیل کر لی۔“

”اور آپ پہلے سے بھی بڑھ کر ہو گئی۔“

”شاید اسے تمہاری محبت کا یقین نہیں۔ اس یقین کے حصول کے لئے ہی وہ سب کچھ کرتی ہے۔“

”میں کیا کروں۔ میں نے تو ظاہر بھی کر دیا جو میرے لئے آسان نہیں تھا۔۔۔ نے بے بسی سے کہا۔

”اس کی تسلی نہیں ہوتی ہو گی۔“ قمر نے پر خیال لہجے میں کہا۔ پھر خود ہی تر بھی کی ”لیکن نہیں یا! اس کی فطرت ہی ایسی ہے۔ شاید۔۔۔ تمہیں یاد ہے۔ میں نے کہا تھا۔۔۔ اور اب دہرا رہا ہوں۔ اس سے جو شادی کرے گا! اسے دو بیویاں رکھے لطف آئے گا کم از کم۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ شری تعداد کا لطف آ جائے۔“

”مذاق مت کرو یا۔۔۔ یہ مسئلہ بہت سنگین ہے۔“

قمر کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”میری ماں! کچی بات یہ ہے کہ وہ لڑکی تمہارے لئے ہے ہی نہیں۔ تم اسے انورڈ نہیں کر سکتے۔“

”میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن اس کے بغیر وہ بھی نہیں سکتا۔ کوئی حل بھی ہے اس مسئلے کا۔“

”ایک ہی حل ہے۔“ قمر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”یہ سب کچھ برداشت کرنے کی عادت ڈال لو۔ اپنی فطرت بدلو کیونکہ وہ تو اپنی فطرت نہیں بدل سکتی۔ اور میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم زور زبردستی والے مرو نہیں ہو۔ ہوتے تو بھی اسے سنبھال نہیں سکتے تھے۔“

”فطرت کبھی نہیں بدلتی۔“ سجلو نے جواب دیا۔ ”وہ بھی مجبور ہے اور میں بھی مجبور ہوں۔ مگر میں اس سے شادی ضرور کروں گا۔ یہ بھی مجبوری ہے۔“

”سوچ لو یا۔۔۔ وہ تمہارے لئے اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی۔ خواہ مخواہ زندگی کو جہنم بنا ڈالو گے۔“

سجلو جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اتنی آزاد خیال اور جارح لڑکی سے اس کا نباہ ناممکن تھا۔ لیکن وہ محبت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ مہم جو لڑکی! جو خطرات سے کھیلنا پسند کرتی تھی۔ شادی کے بعد وہ کیا کچھ۔۔۔ اس سے آگے اس سے سوچا ہی نہیں گیا۔ سیلاب سے شادی کے حق میں اسے ایک بھی دلیل نہیں ملتی تھی۔

مگر وہ اس سلسلے میں سوچتا رہا۔ وہ اس سے دستبردار بھی نہیں ہو سکتا تھا!



اگلی صبح وہ یونیورسٹی جاتے ہوئے سیلاب کو پک کر ملنے کے لئے اس کے گھر پہنچا۔ ”مول کے مطابق وہ آئی اور بانگ کی پچھلی سیٹ پر آ بیٹھی۔ اس ایک معمول کو چھوڑ کر باقی سب کچھ خلاف معمول تھا۔ روزہ وہ مسلسل بولتی تھی لیکن اس روز خاموش تھی۔ سجاو نے دو بار بات کرنے کی کوشش کی۔ دونوں بار سیلاب نے ایک ہی بات لی۔ ”میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔“

ایک معمول یہ تھا کہ خالی چیریز کے دوران میں وہ ملتے تھے۔ کبھی لان میں بیٹھ کر

اس طرح دس دن گزر گئے۔ اس روز وہ لان میں سر جھکائے بیٹھا اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ سیلاب کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ”میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“
 سجاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”ٹھیکو نا۔ تم نہیں جانتیں۔۔۔“
 ”میں یہاں تجدید تعلق کے لئے نہیں آئی ہوں۔“ سیلاب نے سر دھجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”تمہیں ایک اطلاع دینی ہے۔“
 اس کا لہجہ ایسا تھا کہ سجاد کا دل ڈوبنے لگا۔ ”ہاؤ۔۔۔ کیا بات ہے؟“
 ”سوس شام بچا اور چچی ہمارے ہاں آ رہے ہیں۔۔۔ عاقلہ کے لئے میرا ہاتھ مانگتے۔“
 ”تم تم جانتے ہو کہ پاپا اس رشتے کے حق میں ہیں۔“
 سجاد کے لئے وہ دھماکا تھا اس نے اسے شل کر کے رکھ دیا۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

”اب تو خوش ہو۔ مجھ سے تمہاری جان بچھو رہی ہے۔“
 ”کیسی بات کر رہی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔“ سجاد پھٹ پڑا۔

”معلوم ہے“ یہ بات مجھے بتاتے ہوئے تم تقریباً بے ہوش ہو گئے تھے۔ لیکن میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ واضح اور دو ٹوک انداز میں کہہ رہی ہوں کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔“

سجاد کے دل میں امید کی کرن پھوٹی۔ ”تم انکار کر دو گی نا۔“
 ”میری مرضی کے بغیر پاپا بھی ہاں نہیں کریں گے۔ اور میں نے سوچا تھا کہ میں پاپا کو بتا دوں گی کہ میں صرف تم سے شادی کر سکتی ہوں۔ لیکن اس روز کے واقعے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا۔“

”تم سمجھتی کیوں نہیں۔ میں تمہیں کسی بات پر روکتا توکتا ہوں تو تمہاری اور اپنی۔۔۔ دونوں کی بہتری کے لئے۔“

”نہیں سجاد“ یہ بات نہیں۔“ سیلاب کے لہجے میں سنگینی تھی۔ ”جج یہ ہے کہ تم بیل ورڈ بھی بنو اور تنگ نظر بھی۔ مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میری روشن خیالی بے باقی اور آزادی پر تم بے درکداری کا گمان کیل۔ اس بار میں نے جان لیا کہ محبت کے

باتیں کرتے۔ کبھی کینٹین میں چائے پیتے۔ لیکن اس روز سیلاب اس کے قریب بھی نہیں پہنچی۔ سجاد تمام وقت بے چین رہا۔ اس کا دماغ اڑا اڑا رہا۔ دل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ چھٹی کے وقت تک اسے یقین ہو گیا کہ وہ آج اس کی بائیک پر نہیں جائے گی۔ بلکہ اپنے کسی کلاس فیلو سے گھر ڈراپ کرنے کو کہے گی۔

لیکن وہ پارکنگ میں کھڑی اپنی موٹر سائیکل تک پہنچا تو وہ پہلے ہی سے وہاں موجود تھی۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ تم آؤ گی۔“ اس نے سکون کی سانس لینے ہوئے کہا۔
 سیلاب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ بنائے کھڑی رہی۔

سجاد نے سوچا کہ اس معاملے کو یہیں رفع دفع کر لے۔ ”دیکھو سیلاب۔۔۔“
 سیلاب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں صبح ہی تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے اپنے کسی کلاس فیلو سے پک اپ ایئر ڈراپ کے لئے صرف اس لئے بات نہیں کی کہ میں تمہیں ”تکلیف دینا“ جانا نہیں چاہتی۔ پلیز“ مجھے اس پر مجبور نہ کرو۔“

اس کے لہجے کی رکھائی اور بے تعلقی نے سجاد کو احساس دلایا کہ معاملہ سنگین ہے۔ اتنے برسوں میں وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ فی الحال یہ معاملات ٹھیک نہیں کئے جاسکتے۔ اس وقت اسے سمجھانے کی کوشش کرے گا تو بات خراب ہی ہو گی۔ یہ بھی غیر معمول بات تھی کہ وہ behave کر رہی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ سیلاب اسے جلانے کے لئے اپنے کلاس فیلو کی خدمات حاصل کرے۔ چنانچہ اس نے خاموشی سے بائیک انشورٹ کی اور سیلاب کے بیٹھنے کے بعد آگے بڑھا دی۔

گھر پہنچ کر سیلاب اتاری اور اسے خدا حافظ کے بغیر گھر میں داخل ہو گئی۔
 اب یہ معمولات شروع ہو گئے۔ چار دن بعد سجاد نے پھر بات برابر کرنے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں سیلاب تلون مزاجی کے بجائے استقلال کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ سجاد کو پھر پاپائی اختیار کرنی پڑی۔

وہ دن سجاد کے لئے بے حد اذیت ناک تھے۔ اس کا وہ بیان پڑھائی میں بھی نہیں رہا تھا۔ یہ خیال ہی اس کے لئے سوہان روح تھا کہ سیلاب اس سے اتنی ناراض ہے کہ کسی طور صلح کرنے پر آمادہ نہیں۔

باوجود تم میرا احترام نہیں کر سکتے۔ مجھے کبھی عزت نہیں ملے گی تم سے.... اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نے کبھی تمہیں برا نہیں سمجھا۔ سمجھتا تو تم سے محبت کر سکتا تھا؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تم نے شروع ہی سے مجھے آوارہ اور بدکردار سمجھا۔ مگر میں تمہیں شک کا فائدہ دیتی رہی۔ لیکن اس بار بات واضح ہو گئی۔“

سجاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے۔ ”سیلاب“ تم سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ ہر معاشرے کی اپنی روایات اور اقدار ہوتی ہیں۔ عزت اور شرافت کے کچھ معیار ہوتے ہیں۔ ان کا خیال نہ رکھو تو آدمی حقیر ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں بہت بلند دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”اور میں بس زندگی کے ایک ایک لمحے سے محفوظ ہونا چاہتی ہوں۔ اپنی مرضی کے مطابق جینا چاہتی ہوں۔ مجھے ایڈونچر پسند ہے۔ خطرات مجھے اپیل کرتے ہیں۔ میں روایت شکن ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد کی میری زندگی کا ہر لمحہ رومان سے معمور ہو۔ تم تو شادی سے پہلے بھی مجھ سے رومانس نہیں کر سکے۔ لہذا مجھے برا سمجھتے رہے۔“

”تم سمجھتی ہی نہیں کہ شادی ذمے داریوں کا نام ہے۔“

”میں عاقل سے بات کر چکی ہوں۔ وہ مجھے مکمل آزادی دے گا۔ وہ شادی کے بعد مجھ سے اور زیادہ محبت کرے گا۔“

”لیکن میں....“

”یہ بات بن نہیں سکتی سجاد۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ شادی کے بعد تم مجھے کس طرح رکھنا چاہو گے.... میرا کیا حشر کرنے کی کوشش کرو گے۔ اور میں ایسی ہوں نہیں کہ قیدیوں کی سی زندگی گزاروں۔ کوئی جبر مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ کہ خرابی ہو گی۔ میرا تو کچھ نہیں۔ لیکن تم زیادہ دیکھی ہو گے۔ تو جو بعد میں ہوتا ہے، وہ ابھی کر لیا جائے۔ تکلیف بھی کم ہو گی۔“

”تم بہت غلط فیصلہ کر رہی ہو۔“

”میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن میں تمہیں کبھی بھلا بھی نہیں سکوں گی۔ وہ بات ہے جو میں نے عاقل سے بھی چھپائی ہے۔ ممکن ہے شادی کے بعد ہم تم زیادہ بہتر طور پر مل سکیں۔ اس وقت.... اس صورت میں تمہیں میرا باقی فطرت بھی ابھی ملے گا۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ”اب میں تمہیں یہاں لانے اور گھر لے جانے کی بات سے بھی آزاد کر رہی ہوں۔ خدا حافظ۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

سجاد گنگ پتھار پہاڑی دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ خاصی دیر میں وہ پرسکون ہوا۔ اسے سیلاب کی آخری بات یاد آئی۔ وہ حوصلہ افزا بھی تھی۔ سیلاب نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ وہ عاقل سے شادی کے بعد اس سے مل سکتی ہے۔ یہ افسوس خوش آئند تو تھا۔ لیکن سیلاب کی یہ بات آپ اس کے اچھے کردار کی نفی کرتی تھی۔ آزادی اور بے راہ روی میں کوئی زیادہ فاصلہ تو نہیں ہوتا۔

یہ سوچ کر اسے صبر آ گیا۔ واقعی.... محبت کی مجبوری اپنی جگہ۔ لیکن وہ اس آزادی طبع اور بے راہ روی کو پیوی بنانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

وہ اپنی سوچ کو وقتی اور دماغ کا بسلاوا سمجھتا تھا۔ لیکن چند روز گزرے تو....

سجاد نے اچانک گڑی کی طرف دیکھا اور بری طرح چونکا۔ یادوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بارہ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے اور وہ جانتا تھا کہ سیلاب کو انتظار کرنا بالکل پسند نہیں۔



اب وہ کسی نین ابھڑکی طرح بے قرار تھا۔ دل کی دھڑکنیں موسیقیت سے لبریز تھیں۔ وصل کی ساعت آ پہنچی تھی۔ ابھی اسے تیاری بھی کرنی تھی۔ اور پہلے ہی مرحلے میں وہ پانچ منٹ لیٹ ہو چکا تھا۔

وہ حرکت میں آ گیا۔ اس کے انداز میں غلٹ تھی۔ وہ شیفت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے ایک خفیہ مٹن دیا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ شیفت اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ آداب اور شیفت کے بیچے سے ایک وارڈ روب نمودار ہو گئی۔ وہاں کپڑے بڑے سلیفے سے رکھے تھے۔ ایک طرف ٹائیں تھیں۔ نچلے حصے میں جو تے اور جرابیں۔

نیز نظروں سے دیکھیں گے اور اس کے باہر نکلنے کے بعد کھل کر تبصرے کریں گے مگر اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اس وقت اسے سیلاب کے سوا کسی کی پروا نہیں تھی۔



اس سڑ سے کہ لیٹ نہ ہو جائے، اس نے گاڑی معمول سے زیادہ رفتار سے چلائی۔ وہ سجانی چوک پہنچا تو ایک بیٹھنے میں تین منٹ کم تھے۔ سیلاب بھی وقت سے پہلے نہیں آتی تھی۔ پھر بھی اس نے اس کی تلاشی میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن وہ نہیں آتی تھی۔ اس نے گاڑی ایک طرف پارک کی اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت چوک میں کافی چل پھل تھا۔ بس اسٹاپ پر اسکول اور کالج کے طلبہ اور طالبات کا خاصا جھوم تھا۔ اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ ذرا دیر بعد اس نے گھڑی دیکھی۔ ایک بج کر تین منٹ ہوئے تھے۔ اسے گھبراہٹ ہوئے گی۔ سیلاب لیٹ بھی نہیں ہوتی تھی۔ اور آج کے بلانے پر اس نے پہلے منع کیا تھا کیا پتا کسی مجبوری نے آئے اسے روک لیا ہو اسے۔ یہ سوچ کر وہ باپس ہوئے لگا۔ اگر سیلاب نہ آئی تو وہ کیا کرے گا۔ بڑی کوفت ہو گی۔

اسی وقت ذرا فاصلے پر ایک ٹیکسی آکر رکی۔ سیلاب نے اتر کر ٹیکسی ڈرائیور کو ادائیگی کی پھر وہ اس کی گاڑی کی طرف چلی آئی۔ سجاوے نے اگلا دروازہ کھولا اور وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔ سجاوے نے ادھر ادھر دیکھا۔ بس اسٹاپ پر موجود لوگ اب ان کی طرف متوجہ تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ کچھ اوباش قسم کے لڑکوں کی نگاہیں تو باقاعدہ گندگی اچھل رہی تھیں۔ لیکن سجاوے کے خیال میں وہ حق بہ جانب تھے۔ ایک خوب صورت لڑکی کا ٹیکسی میں بیٹھ کر آنا اور ٹیکسی سے اترتے ہی ایک کار میں بیٹھ جانا۔ اس بات کے دو معنی تو ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ لوگ غلط تو نہیں سوچ رہے تھے۔

یہ بھی سیلاب کی ضد تھی کہ وہ اسے سجانی چوک سے پک کر لے۔ ورنہ وہ اسے اس کے گھر سے بھی پک کر سکتا تھا۔ اور وہ خود ٹیکسی میں براہ راست ہوٹل بھی پہنچ سکتی تھی۔ لیکن ایکسٹ منٹ اور تھل تو اس کی کمزوری تھی۔ اس چوک پر لوگوں کی نگاہوں کا سامنا کرنا بھی تو تسنی خیز تھا۔

اس نے جلدی جلدی لباس منتخب کیا اور اسے لے کر شیفت دوبارہ اپنی جگہ سرکائے بغیر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ لباس تبدیل کر کے اس نے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا۔ اس کی عمر کم از کم پانچ برس کم لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا 'ج ہے'، بے وفائی مروی عمر کم کر دیتی ہے اور اس کی خود اتمادی میں اتنا ہی اضافہ کر دیتی ہے۔

کپڑے بدلنے کے بعد اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے جوتے پہنے۔ پھر وہ وارڈ روم کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے ایک دروازہ کھولی۔ اس میں پرفیوم کی بے شمار شیشیاں تھیں۔ اس نے ایک پرفیوم منتخب کر کے اسپرے کیا۔ پرفیوم کی دھبی، بھینی خوشبو کمرے میں پھیلنے لگی۔ اس نے فٹن دلیلا۔ شیفت نے وارڈ روم کو چھپا لیا۔

ہر طرح سے تیار ہو کر اس نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے جب سے پرس نکال کر چیک کیا۔ پرس میں تمام ضروری چیزیں موجود تھیں۔ سیلاب سے ملنے جاتے ہوئے وہ اس پرس کا بست خیال رکھتا تھا۔ بھاری رقم ساتھ رکھنا بے حد ضروری تھا۔

وہ کمرے سے نکلا۔ بیرونی کمرے میں لوسی کوئی فاکس دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ بس آج قیامت لگ رہا تھا۔

سجاوے کو اس کی وہ مفتون ہو جانے والی نظریں بہت بری لگتی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ لوسی اسے پسند کرتی ہے اور اس کے ایک اشارے پر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ لیکن وہ تو سیلاب کا امیر تھا۔ "میں جا رہا ہوں مس لوسی۔" اس نے کہا۔ "میری وائف کا فون آئے تو انہیں بتا دینا کہ میں ایک کام سے گیا ہوں۔"

اب کے لوسی کی آنکھوں میں اور طرح کی چمک ابھری۔ وہ چمک کتنی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ سجاوے چڑ گیا۔ لوسی کی یہ نظریں اسے اور زیادہ بری لگتی تھیں۔ مگر وہ اس سلسلے میں بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"لو۔ کے سر۔ وٹش اپ آل دی نیٹ۔" لوسی کا لہجہ بھی مزید غنی تھا۔

سجاوے باہر نکل آیا۔ اسے احساس تھا کہ سر جھکائے کام میں مصروف دفتر کے تمام ملازم چپکے چپکے اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے آگے بڑھتے ہی وہ ایک دوسرے کو معنی

ہیشہ کی طرح لوگوں کی نظریں دیکھ کر اس روز بھی خفت اور شرم سے سجاو ک
کنپیاں گرم ہو گئیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھ
دی۔

سیلاب اسے بست غور سے دیکھ رہی تھی۔ ”تم اب بھی ویسے ہی ہو۔“ اس
کہا۔

”فطرت کبھی نہیں بدلتی۔“

”تو پھر بلاستے کیوں ہو مجھے؟“

”محبت سے بڑی مجبوری نہیں ہوتی۔“

وہ چڑ گئی ”تمیں لوگوں کی اتنی پروا کیوں ہے؟“

”معاشرتی جانور جو ٹھہرا۔“ سیلاب نے کہا پھر جلدی سے اضافہ کیا۔ ”اور پرواہ“

بھی کرتی ہو ورنہ چھپ کر کیوں ملتیں مجھ سے۔ کٹے عام بھی مل سکتی تھیں۔ ڈر۔
والی تو تم کسی سے ہو نہیں۔“

سیلاب جھینپ سی گئی۔ ”چھپ کر ملنے کا لطف ہی اور ہے۔“ اس نے کہا پھر کا
سوچ کر گلابی ہو گئی۔ ”کمال چلیں گے؟“

”نگار ہو مل۔“ سیلاب بولا۔ ”میں نے فون پر کمرہ ریزرو کر لیا ہے۔“

سیلاب کے رخساروں کی رنگت اور گرمی ہو گئی۔ ”اب تو ہو طلوں کے بارے میں
تمہاری معلومات بہت بڑھ گئی ہیں۔“ اس کے لمبے میں شوخی تھی۔

”تمہاری محبت کا کرم ہے۔ اس کے لئے کوٹ محبت تو تلاش کرتا ہی پڑتا ہے۔ پھر
تمہاری شرط کا فائدہ یا فور اشار ہو مل نہ ہو۔“

”فائدہ اور فور اشار کے تحفظ میں قہر تو نہیں ہو سکتا۔“

”ٹھیک کہتی ہو۔ مگر تمہارا قہر مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے۔“

”میں تو کبھی تھی کہ تمہارا ڈر نکل چکا ہے۔“

”کٹے نہیں تو ڈر اندر کہیں بہت گہرائی میں بیٹھ جاتا ہے۔ لو، ہم پہنچ گئے۔“ سیلاب
کی آواز سننا نہ لگی۔ اس نے گاڑی نگار ہو مل کے گیٹ سے گزاری اور پارکنگ
لاٹ کی طرف لے گیا۔ اب اسے دریاں سے لے کر ہو مل کے دوسرے انصف کی

نظروں کا سامنا کرنا تھا۔



اب وہ تھے اور ہو مل کے کمرے کی حسین تھائی۔ ان کے انداز میں کئی دنوں کے
پایسوں کی سی بے تابی تھی۔ ہیشہ ایسا ہی ہونا تھا۔ وہ ٹوٹ کر ملنے تھے۔ اور پیاس پھر
بھی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ تو بعد میں ایک دوسرے میں یوں گم ہوتے کہ جدا ہونے کو جی
ہی نہیں چاہتا۔

اس وقت بھی وہی کیفیت تھی۔ صحرا سیراب ہو کر بھی پیاسے کے پیاسے تھے۔
ایک بات پوچھوں؟ ”چج جج بناؤ کے؟“ اچانک سیلاب نے پوچھا۔

”تم جانتی ہو کہ میں جھوٹ بولتا ہی نہیں ہوں۔“

”مجھ سے تعلق ہے تو جھوٹ بولنے سے بچ ہی نہیں سکتے۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسی۔

”وہ تو دوسروں سے بولنا پڑتا ہے۔ تم سے تو جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہیں۔“

پوچھو تو۔“

”تم خوش تو ہو؟“

”دیکھ نہیں رہی ہو۔ میں بہت خوش ہوں۔“ اس نے والہانہ انداز میں سیلاب کو

چھوا۔

سیلاب کسمائی۔ ”میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تمہاری ازدواجی زندگی کے بارے
میں پوچھ رہی ہوں۔ تم اس سے پوری طرح مطمئن ہو۔“

سیلاب کو اس کے لمبے میں فکر مندی محسوس ہوئی۔ اس نے غور سے اسے دیکھا۔
اس کے چہرے پر بھی فکر مندی کا تاثر تھا۔ ”میں اپنی ازدواجی زندگی سے پوری طرح
مطمئن ہوں سیلاب۔۔۔ میں اتنا خوش و خرم کبھی نہیں رہا۔“

”میں آتا مجھ سے ملنا، یہ مطمئن ہونے کا ثبوت تو نہیں۔ اس سے تو تمہارے
بیان کی تردید ہوتی ہے۔“

سیلاب نے چونک کر اسے دیکھا مگر فوراً ہی مطمئن ہو گیا۔ وہ فطرت نہیں کر رہی تھی۔

اس کے چہرے پر اب بھی فکر مندی کا تاثر تھا۔ ”تم میری ازدواجی زندگی کے عدم
اطمینان کی علامت نہیں ہو سیلاب۔ تم تو میری مجبوری ہو۔ وہ واحد سمجھوتا ہو، جو میں

خوشی ملتی ہے۔ وہ کبھی دکھ نہیں دیتے مجھے۔ اب یہ مجبوری ہے کہ وہ میرے اندر کی یوی کو تو مکمل غلامیت دے سکتے ہیں۔ لیکن میرے اندر چھپی محبوبہ کی ان سے تسلی نہیں ہوتی۔ اب یہ تو میری نفسیاتی کمزوری ہے تاہم ان کا کیا قصور اس میں۔ ویسے میری ازدواجی زندگی ہر اعتبار سے بہت خوشگوار ہے۔

سجاد کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھایا۔ ”میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ تم بہت اچھی یوی ہو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے تم اپنے بچوں کی بہت اچھی ماں ہو۔ میں جب بھی بلاؤں تم کتنی ہو کہ بچوں کو چھوڑ کر آنا اچھا نہیں لگتا۔“

”یہ سچ ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا مگر میں اچھی ماں ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہاں یہ کہہ سکتی ہوں کہ اگر میں اچھی ماں ہوں تو اس کا سبب تم ہو۔ تم سے مجھے جو سکون، غلامیت اور تسلی ملتی ہے، اس کے نتیجے میں مجھے اچھی ماں اور اچھی یوی بننے کا حوصلہ ملتا ہے۔“

”یہ بھی عجیب منطق ہے۔ بے وفائی تمہیں اچھی یوی بننے کی تلقین کرتی ہے۔“

”ہاں۔ شاید میں بہت پیچیدہ نفسیاتی کیس ہوں۔“ سیما نے سرو آہ بھر کے کہا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو.....“ سجاد کتے کتے چونکا۔ باہر راہ داری کی طرف سے ہماری بوٹوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یا یہ اس کا وہم تھا۔ یہ آوازیں تو اسے بیش سنائی دیتی تھیں۔

”کیا ہوا؟ کیا بات؟“ سیما نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں۔ وہم بہت کرتا ہوں میں۔“ سجاد نے کہا لیکن وہ بہت زیادہ بے چین تھا۔ اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

مگر چند لمحے بعد اس نے کمرے کے دروازے کے کی ہول میں چابی ڈالے جانے کی واضح آواز سنی اور جان لیا کہ خطرہ سر پر آ پہنچا ہے۔ وہ اپنی جگہ جما رہ گیا۔ اس سے بلا بھی نہیں گیا۔ یہاں تک کہ اس نے دروازے کا پینڈل گھومتے دیکھا۔

”چھپا..... چھپا.....“ اس نے گھبرا کر مشکل کہا۔

اس لفظ کے رد عمل کے طور پر سیما کی آنکھوں میں خوف جھلکا۔ اسی لمحے

نے کیا ہے۔ اور یہ ناگزیر تھا۔ یقین کر دو، میری زندگی میں غلامیت ہی غلامیت ہے۔“

”تمہاری یوی کیسی ہے؟“

”قدیر بہت اچھی یوی، بہت ہی اچھی ماں ہے۔ وہ مثالی عورت ثابت ہوئی ہے۔ میں اس کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اس کا کمال ہی نہیں سکتا میں۔“

”مگر اس سے بے وفائی بھی کرتے ہو۔“

سجاد کچھ بدمزہ ہوا۔ گفتگو عجیب رخ پر جا رہی تھی۔ ”اس بات کو درست خاطر میں دیکھنے کی کوشش کرو۔ یہ قدیر سے بے وفائی نہیں، تم سے وفا نہ پاس ہے۔ تمہاری محبت کا قرض چکانا ہے۔ تمہارا تعلق قدیر سے بہت پہلے کا ہے۔ کچھ چیزیں کبھی ختم نہیں ہوتیں..... ختم کی ہی نہیں جا سکتیں۔“

”عجیب منطق ہے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتی۔ قدیر کو سمجھاؤ گے تو وہ بھی نہیں سمجھے گی۔“ سیما نے پر خیال لمحے میں کہا۔

”تو میں سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔“ سجاد نے جھنجھلا کر کہا۔ ”ان رنگین لمحوں میں یہ کیسا بے بیخیاں تم۔“

”خاتون پر بھی غور کرتے رہنا چاہئے۔“

”چھل..... تو اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں بتاؤ۔ تم اپنے شوہر سے خوش ہو۔“

”بالکل ہوں۔“ سیما نے بلا جھجکا کہا۔

”تو پھر یہ.....؟“

”یہ میری مجبوری ہے۔ میں بیش سے دوسری شخصیت والی ہوں۔ اور میری دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک دلیر ہے، دوسری ڈرپوک۔ ایک بے باک ہے تو دوسری شرمیلی۔ ایک باغی ہے تو دوسری مفاہمت پسند۔“

”میں تم سے تمہاری ازدواجی زندگی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“ سجاد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم نے یہ نفسیات کا باب شروع کر دیا۔“

”وی بتا رہی ہوں۔ بات تو پوری ہونے دو۔“ سیما نے تحمل سے کہا۔ ”میری دوسری شخصیت میں ایک یوی ہے تو دوسری محبوبہ۔ عاطر کی ازدواجی زندگی دیکھ کر میں کہہ سکتی ہوں کہ جو ہوا، اچھا ہی ہوا۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں۔ مجھے ان سے بہت

سب انسپکڑ کی آنکھوں میں چمک لرائی۔ ”ضرور۔ آئیے۔“

راہداری میں سہارو نے اپنی جیب سے پرس نکالا تو سب انسپکڑ کی آنکھوں میں چمک اور بڑھ گئی۔

بلت واقعی کچھ دشوار نہیں تھی۔ پانچ منٹ بعد سہارو سیاب کو لے کر لابی سے گزر رہا تھا۔ لیکن سیاب اپنی شخصیت کا سحر نکالتا چکی تھی۔ وہ بہت دیران اور اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔ لابی میں اس وقت پریس کے کچھ فوٹوگرافر پکڑے جانے والے مردوں اور عورتوں کی تصویریں بنانے کا عذاب بھگت رہے تھے۔ عذاب اس لئے کہ عورتوں نے اپنے چہرے اپنے ہاتھوں سے چھپائے ہوئے تھے اور فوٹوگرافر بڑے تھل سے ان کے ہاتھ پٹنے کے منتظر تھے۔

وہ دونوں اس منظر سے نظریں چرا کر باہر آ گئے۔ ان کے جسوں کی لرزش دور سے بھی دکھائی دے سکتی تھی۔ خاص طور پر سیاب تو پوری جان سے کانپ رہی تھی۔ سہارو پارکنگ کی طرف چلا تو سیاب نے اسے روک لیا۔ ”مجھے ٹیکسی میں بٹھا دو پلیز۔“ اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

سہارو اسے لے کر ہوٹل کے گیٹ کی طرف چل دیا۔ ”بے کار پریشان ہو رہی ہو۔“ اس نے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ”دیکھو نا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔“ لیکن سیاب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سہارو نے گزرتی ہوئی خلی عکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔



گاڑی میں بیٹھ کر دفتر آتے آتے سہارو میں اتنی بڑی تبدیلی آئی، جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہیں یہ کہ نہ صرف اس کا جسم، بلکہ وجود تک اندر سے اپنی بنیادوں میں لرز رہا تھا کہ وہ تجربہ تھا ہی اتنا ہیملٹک۔ اور کہیں یہ کہ وہ بتدریج پرسکون..... بلکہ..... پراعتاد ہو گیا تھا۔ اس تجربے کی خونخاکی کا نقش بہت تیزی سے ماند پڑتے پڑتے یکسر مٹ گیا۔ اپنا خوف اسے بے سبب اور مضحکہ خیز لگنے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے دفتر میں لباس تبدیل کرتے ہوئے وہ اپنے خوف کو یاد کر کے ہنس دیا۔ آدمی کتنا احمق ہوتا ہے۔ خوف پالتا ہے تو اس کے بارے میں کچھ سوچنا سمجھنا نہیں ہے۔

دروازہ دھڑ سے کھلا اور دو بلوردری پولیس والے اندر گھس آئے۔ سیاب کی آنکھوں میں جھلکا خوف، دہشت میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی پیچ نکلنے والی تھی لیکن اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر سختی سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اس نے سہارو کی طرف دیکھا مگر وہ اور برسے حال میں تھا۔ لگتا تھا بے ہوش ہو جائے گا۔ سیاب کو اتنا ہوش بر حال تھا کہ اس نے اپنے بے ترتیب لباس کو درست کیا اور تیزی سے اپنی چادر کی طرف لپکی۔

کہتے ہیں کہ جب مصیبت سر پر آ پڑے تو کزور سے کزور آدمی بھی اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ سہارو نے بھی حیرت انگیز تیزی سے خود کو سنبھالا اور دونوں پولیس والوں کو دیکھا۔ ان میں ایک سب انسپکڑ تھا اور دوسرا کانشیل۔ ”انسپکڑ.... اس طرح کمرے میں گھس آنا....“ اس نے کزور لہجے میں احتجاج کیا۔

”یو آر انڈر ارسٹ.... بوجھ آف یو۔“ سب انسپکڑ نے سخت لہجے میں کہا۔

”لیکن کس جرم میں....؟“

”جو کہنا ہے،“ تھانے چل کر کہنے لگا۔ ”انسپکڑ سیاب کی طرف بڑھ رہا تھا اور کانشیل سہارو کی طرف۔“

سہارو نے سیاب کی طرف دیکھا اس کا چہرہ یوں زرد ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم سے خون کی آخری یونٹ بھی نچوڑ لی گئی ہے۔ آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے لگتا کہ وہ اس ایڈووکیٹ سے محفوظ ہو رہی ہے۔ اسے دیکھ کر سہارو کا دل کٹنے لگا۔ اندر ہی اندر وہ لرز رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، اگر اپنے منطقی انجیام کو پہنچ جاتا تو وہ دونوں ہی کہیں منہ دھکھانے کے لائق نہ رہتے۔ اور پچھل پر کیا گزرتی.... سیاب کے پچھل پر۔ یہ تو عمر بھر نہ شے والا داغ تھا۔ نجانے کہاں سے سہارو میں بہت اور توانائی آ گئی۔ اسے کچھ کرنا تھا۔ بات کو آگے بڑھنے سے روکنا تھا اور یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ اس ملک میں چھپے ہوئے کلنڈر کے پڑے، ہمیشہ مشکل کشائی کرتی ہیں۔ عزت کے لئے تو آدمی ہر قیمت دے سکتا ہے۔

وہ تیزی سے اٹھا۔ ”انسپکڑ پلیز....“ اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ ”آپ ذرا الگ آ کر میری بات تو سنیں۔“

”رہنے دو۔ کوفتے کل پکالینگ۔ آج کا پروگرام اٹل ہے۔“
 ”لیکن....“ قدیرہ کے لمبے میں ہچکچاہٹ تھی۔

”کچھ نہیں۔ تیار ملنا۔ یہ میرا حکم ہے۔“

”بہت بہتر جناب۔“ ہمیشہ کی طرح قدیرہ نے ہتھکڑیاں ڈال دیئے۔

اس رات تفریح کر کے، کھانا کھا کے گھر واپس آئے تو بچے بہت تھکے ہوئے تھے۔ وہ جلدی سو گئے۔ تھائی میں قدیرہ نے سجاو کے سینے پر سر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بہت محبت سے بولی۔ ”آپ میرے اور بچوں کے لئے کتنے اچھے ہیں۔ کتنا خیال رکھتے ہیں۔۔۔ کتنی محبت کرتے ہیں۔ میں اللہ کا بھنا شکر ادا کروں کم ہے۔“

سجاو نے چونک کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ بیویاں شوہر سے بے خبر کبھی نہیں رہتیں۔ شوہر کے پاس سے بے وفائی کی بو اٹھیں فوراً آ جاتی ہے۔ اسی کو انسانی وجدان کہتے ہیں۔ قدیرہ کی بات سن کر اسے حک ہوا کہ کہیں وہ اس پر مڑ تو نہیں کر رہی ہے۔ لیکن قدیرہ کی آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی۔

”تم بھی میرے لئے اللہ کا بہت بڑا تحفہ ہو۔“ اس نے بے حد سچائی کے کہا۔

زرا قریب تو آؤ نا۔۔۔

یہ بھی کہیں عجیب بات تھی کہ بے وفائی ہمیشہ قدیرہ کو اس کے لئے بہت زیادہ کشش انگیز بنا دیتی تھی۔ ایسے میں اس کی قربت اسے یوں بھڑکاتی تھی کہ وہ شوہر سے عاشق بن جاتا تھا۔



صبح سجاو، راشد کو اسکول پہنچا کر واپس آیا تو قدیرہ بڑے انہماک سے اخبار دیکھ رہی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ کیونکہ قدیرہ دو منٹ میں اخبار کی تمام شہ سرخیاں پڑھ کر اسے فارغ کر دیتی تھی۔ اور اس وقت اخبار پڑھتے ہوئے اس کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ اسے اس کی آمد کا بھی پتہ نہیں چلا۔

”کسی ایسی دھمکے کی خبری، جو اتنی توجہ سے اخبار پڑھ رہی ہو۔“ سجاو نے اسے

لباس تبدیل کر کے وہ اپنی کرسی پر آ بیٹھا اور اسی بارے میں سوچنے لگا۔ تو یہ تھا وہ خوف جسے میں نے ہوا بنا رکھا تھا۔ اس نے سوچا۔ برسوں میں یہ خوف اپنے اندر پال رہا تھا۔ اور آج جب وہ حقیقت بن کر سامنے آیا تو کتنا چھوٹا اور بے وقعت لگا۔ بلکہ اب تو اس تجربے کو یاد کر کے اس کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ قہرل اور ایکسٹ منٹ کا مضموم تو اس کی سمجھ میں چلی ہوا آیا تھا۔۔۔ اور یہ اس تجربے کی علامت تھی۔

اسے احساس ہوا کہ ایسا پر اعتماد وہ کبھی نہیں رہا جیسا اس وقت ہے۔ اس پولیس انسپکٹر کو اس نے کتنی آسانی سے اور کتنی اچھی طرح پینڈل کیا تھا۔ پہلی بار اسے پتہ چلا تھا کہ بہت پھیلا ہوا اور مزید پھیلتا ہوا منفعت بخش کاروبار، کسی بہت محبت سے پالے ہوئے دے۔ جیسا موٹا تازہ چیک انکوائٹ اور جب میں پھولا ہوا پرس معاشرے میں اعلیٰ پوزیشن کا نماز ہوتا ہے۔ اور جن کی معاشرے میں کوئی پوزیشن، مقام اور مرتبہ ہو، پولیس ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ پولیس کا منہ اس سے بھی زیادہ آسانی سے بند کر سکتے ہیں۔ خود اس نے کتنی آسانی سے اس سب انسپکٹر کو بھگایا تھا۔ خود اعتمادی تو بڑھتی ہی تھی۔

اس کا سارا ڈر اور خوف نکل گیا۔ اب وہ ایک دہلا ہوا آدمی تھا۔

چار بجے اس نے اپنے گھر کا نمبر ملایا۔ فون قدیرہ نے رینیو کیا۔ ”قدیرہ“ میں اڑھے پانچ بجے گھر پہنچ جاؤں گا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ قدیرہ کی پرسکون شیریں آواز سنائی دی۔

”تم بچوں سمیت تیار رہنا۔“ وہ بولا۔

”کیوں بھئی۔ خیریت تو ہے؟“

”کب سے بچے کہیں باہر نہیں گئے۔ آج سند باو چلیں گے۔ پھر میں ایک بہت اچھے ریستورنٹ میں تمہیں ڈنر کراؤں گا۔“

”آج رہنے دیں۔ یہ پروگرام کل پر رکھیں۔“

”کیوں؟“

”آج میں کوفتے بنا رہی ہوں۔“

پکارا۔

”مجھے تو ایسی دھماکا ہی لگا ہے۔ آپ بھی پڑھ لیں۔“

سجاد ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ ناشتا کرتے ہوئے اس نے قدیر کا پوچھا ہوا اخبار دیکھا۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ وہ نگار ہوٹل پر پولیس کے چھاپے کی خبر تھی۔ پکڑے جانے والوں کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ اور خبر میں ان کے مع ولادت نام بھی تھے۔

”اسے دھماکا کدہ رہی تھیں تم؟“ اس نے قدیر سے پوچھا۔

”جی ہاں۔ مجھے تو دھماکا ہی لگا۔ حیرت ہوئی کہ دنیا میں یہ کچھ بھی ہوتا ہے۔“

”یہ سب کچھ دنیا میں ہی ہو سکتا ہے۔ جنت یا دوزخ، حیات بعد الموت میں تو یہ ممکن نہیں۔“ سجاد نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

قدیر اب بھی انجینے میں تھی۔ ”ان میں شادی شدہ لوگ بھی ہوں گے۔“

”یہ شادی شدہ لوگوں ہی کے شوق ہیں۔“

قدیر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ ”آپ کو بھی ہیں ایسے شوق؟“

”بالکل ہیں۔ لیکن میں انہیں ڈھنگ سے.... سلیقے سے پورا کرتا ہوں۔ میں بہت

محنت دیتا ہوں۔“

قدیر ہنسنے لگی۔ ”جھوٹ۔ شوقین ہوتے تو میرے سامنے اس سے انکار کرتے۔

بے وقوف بناتے ہیں مجھے۔“

”ہاں۔ تمہیں بے وقوف بنانا ہوں مگر کبھی کبھی۔“ سجاد نے سنجیدگی

سے کہا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چھل۔۔۔ اس میں کپڑے بدل لوں۔“

کپڑے بدلتے ہوئے وہ گفتگوتا رہا۔ فیڈ اسکی ہے جو اڑا لے جائے۔ رنگ اس کے ہیں جو چرا لے جائے....



لوسی سجاد کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں اپائنٹ منٹ ڈائری، نوٹس

لینے والا پیڈ اور پینسل تھی۔ سجاد نے نرم لہجے میں کہا۔ ”سٹ ڈاؤن مس لوسی۔“

”تھینک یو سر۔“

”میں یہ چاہتا ہوں مس لوسی۔۔۔“

لوسی پہلے ہی تمام علامات دیکھ چکی تھی۔ باس مضطرب تھا اور جسمانی حرکات و سکنات سے زور لگ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ پیپر ویسٹ کو دونوں ہاتھوں سے گھمائے جا رہا تھا۔ ”میں سر۔“ لوسی نے جلدی سے کہا۔ ”میں آپ کے آج کے تمام اپائنٹ منٹ کینسل کر دیتی ہوں۔ ویسے کوئی خاص اور امپورٹنٹ اپائنٹ منٹ بھی نہیں۔“ سجاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“

”سوری سر میں سمجھی کہ۔۔۔“

”تم ٹھیک سمجھی ہو مس لوسی۔“ سجاد نے اس کی بات کٹ دی۔ ”آج کی تمام

اپائنٹ منٹ کینسل کر دو۔“

”پس سر۔ اور سر، آج آپ ڈکٹیشن بھی نہیں دیں گے۔ ممکن ہے، مشین پر

نواب ریکارڈ کر دیں۔ نہیں تو کل سی۔“

”ایگزیکٹو مس لوسی۔“

”اور سر، آپ کوئی کال بھی ریسیو نہیں کریں گے۔“

”کریکٹ۔ تم خطرناک حد تک سمجھ دار ہو گئی ہو مس لوسی۔“ سجاد نے سر دھبے

میں کہا۔

”خطرناک؟ نو سر۔۔۔ نیور۔ صرف سمجھ دار۔“

”او کے۔ تم جا سکتی ہو۔“

لوسی کے جانے کے بعد سجاد مضطربانہ انداز میں پیپر ویسٹ سے کھینچا رہا۔ بار بار اس کا ہاتھ ڈائریکٹ لائن والے ٹیلی فون کی طرف بڑھتا مگر وہ اسے واپس کھینچ لیتا۔ جلد بازی مناسب نہیں تھی۔ اس نے ایک فائل کھولی مگر اس وقت وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ رگ و پے میں ایسا بیجان دوڑ رہا تھا جو شدت کے اعتبار سے اس کے لئے نیا تھا۔ شاید یہ بچھلی بار کے تجربے کی حمایت تھی۔

وہ بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ وقت کی رفتار تیز ہزار کن حد تک ست تھی۔ بڑی مشکل سے دس بجے۔ دس بجتے ہی اس نے ڈائریکٹ لائن والا ٹیلی فون اپنی طرف کھینچا۔ ریسیور اٹھایا اور وہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جو اس کے دل پر نقش تھا۔ رابطہ ملنے پر اس نے

لا رہا ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تم نے دیکھا نہیں، میں نے اس پونٹیکس چھپت ہو
منٹ میں رام کر لیا تھا۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ سبب۔ اب تو مجھے احتیاج نہیں مل
اپنے آپ پر۔“

”مگر میری خاطر آپ کو بے اصولی بھی تو کرنی پڑی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ
رشوت کے کتنے خلاف ہیں۔ میری خاطر اس دن آپ کو یہ بھی کرنا پڑا۔“
”ارے نہیں۔ رشوت دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ سجاد نے پر زور لہجے
میں کہا۔

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ شاید سبب کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”پلیز۔۔۔
بھوت نہ بولیں۔“ بالآخر لائن پر اس کی آواز ابھری۔ ”میں نے خود آپ کو جیب سے
پس نکالنے ہوئے دیکھا تھا۔“

”میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے رشوت نہیں
دی۔“
”تو پھر؟“

سجاد مسکرایا۔ ”بھئی ڈرپوک آدمی احتیاطی تدابیر تو پوری کرتا ہے نہ میرے پرس
میں میرا اور تمہارا شناختی کارڈ بھی تھا اور ہمارا نکاح نامہ بھی۔ وہ میں نے نکل کر انکسپلر
لو دکھایا۔ پھر بھی اڑا رہا۔ اس پر میں نے دھمکی دی اسے۔ میں نے کہا۔ ٹھیک
ہے، تم ہمیں تھانے لے چلو۔ لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ
کروں گا تم پر۔۔۔ اور ایک کروڑ روپے وصول کر کے رہوں گا۔ چاہو تو شرط لگا لو اس پر
اُس بچہ وہ ایک دم سدھا ہو گیا۔“

دوسری طرف سبب نے ایک گہری سانس لی۔ لائن پر خاموشی چھا گئی۔ سجاد
تصویر میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ کتنی مطمئن ہے۔
”پھر کیا خیال ہے۔ آ رہی ہو نا؟“

”میں نے کہا نا اب یہ سلسلہ ختم۔ آج اخبار میں تصویریں بھی دیکھی ہیں میں
نہیں۔ اور خبر میں نام بھی پڑے ہیں۔“

”پلیز سبب۔ دیکھو، ہفتہ دس دن میں چند گھنٹے کا یہ ایڈوکیٹر معمولات میں جکڑی

سکون کی سانس لی۔ دوسری طرف ٹھنٹی بج رہی تھی۔ اس کی دل کی دھڑکنیں بے دم
ہوئے لگیں۔

پھر دل کو قرار آ گیا۔ دوسری طرف سے ریسور اٹھا لیا گیا۔ ”ہلو؟“ جانی پہچانی
مترنم آواز سنائی دی لیکن آج اس میں بیشہ جیسی ٹھنک نہیں تھی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے وہ دلکش سرلا لہرا گیا۔ پھولوں سے لدی ہوئی وہ نرم و
نازک شلغ ”سیمب“ اس نے چھلکی ہوئی آواز میں پکارا۔ یہ نام وہ جب بھی پکارتا
لوک زباں پر ہر بار ایک نیا لائقہ محسوس ہوتا۔ ہر بار سانسوں میں ایک نئی خوشبو
ملکورے لینے لگتی۔ اور آج تو یہ سب کچھ اور سوا ہو گیا تھا۔ اس کے بیچن سیٹ۔
میں سجاد بول رہا ہوں۔“ کچھ توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔

”جیسے میں آپ کی آواز پہچانتی نہیں۔“ بات وہی تھی، جو بیشہ وہ کتنی تھی۔ البتہ
لہجہ بدلا ہوا تھا اور تم کی جگہ آپ نے لے لی تھی۔

”آج آ رہی ہو نا؟“ سجاد کے لہجے میں بے تابی تھی۔ آرزو تھی۔

”نہ آج۔۔۔ نہ آئندہ کبھی۔ اب میں آپ سے اس طرح کبھی نہیں ملوں گی۔“
”پچھلی بار جو ہوا؟ اس سے ڈر گئی؟“

”جی ہاں۔ کیا نہیں ڈرتا چاہئے تھا۔“

”بھئی جی بات ہے۔ میرا تو ڈر نکل گیا۔“ سجاد نے کہا۔ ”حالات نہ ڈرتا میں تھا۔ تم
تو ڈرتی ہی نہیں تھیں۔ تمہیں تو خطرات سے کھیلنے میں لطف آتا تھا۔ ایڈوکیٹر کا کوئی
موقع تم ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔ تمہیں کیا ہو گیا۔“

”بچوں کا خیال آ گیا۔“ لائن پر سبب کی لرزتی آواز ابھری۔ پھر اچانک وہ
سکلیں بھرے لگی۔ ”سجاد۔۔۔ اگر اس روز ہماری تصویریں چھپ جاتیں تو میں اپنے
بچوں کا سامنا کیسے کرتی۔ کیسے سمجھاتی انہیں۔ میں تو کہیں کی بھی نہیں رہتی۔“

”لیکن ایسا ہوا تو نہیں سبب۔“

”ہم باز نہ آئے تو کسی دن ایسا بھی ہو جائے گا۔ لیکن اب میں ایسا نہیں ہونے
دوں گی۔“

”تم بلا وجہ ڈر رہی ہو سبب۔“ سجاد جھنجھلا گیا۔ ”آج میں پہلی بار تمہیں یقین

سکون کی سانس، حلق آباد ہوتا ہے۔ میں علوی ہو گیا ہوں اس کا۔
ہوئے لگیں۔ بی سجا۔ اب یہ ممکن نہیں۔
پلینہ۔

”سوری اور آپ کو میری قسم، اب اس سلسلے میں اصرار نہ کیجئے گا۔“
”اچھا۔ یہ آپ جتنا لگا لگا رکھی ہے تم نے۔“ سجا نے اسے ڈانٹا۔ ”اس وقت
میں اپنی بیوی سے نہیں، محبوبہ سے بات کر رہا ہوں۔“
”اب وہ دونوں ایک ہو گئی ہیں۔“ دوسری طرف سے قدیر سیماب نے شرمیلے
لہجے میں کہا۔ ”اچھا۔۔۔ خدا حافظ۔“

ریسیور بے جاں ہو گیا تھا۔ سجا نے اسے کیڑل پر ڈال دیا اور کرسی کی پشت ڈھک کر
سر ٹکاتے ہوئے ناخنیں پھیلا لیں۔ وہ اب بھی سیماب ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
اس کے تصور میں اس کی زندگی کے سب سے اہم دن کی تصویر ابھر آئی۔۔۔



وہ مستقل اداس رہنے لگا تھا۔ لیکن بڑی بات یہ تھی کہ اسے مہر آگیا تھا۔ اس
نے تسلیم کر لیا تھا کہ سیماب اس کی کیا، کسی کی بھی اچھی بیوی نہیں بن سکتی۔ اس میں
یہ خوشی ہی نہیں اور عمر بھر کے روگ سے چند دن کا سوگ کہیں بڑھتا ہے۔ وہ جانتا
تھا کہ کچھ دنوں، یا زیادہ سے زیادہ مہینوں میں وہ سیماب کو۔۔۔ ان تمام باتوں کو بھول
جائے گا۔ بس ہلکی سی ایک کک رہ جائے گی۔ وقت ہر زخم کا مرہم ہے۔

سیماب سے آخری بار بات ہونے دو ہفتے ہونے والے تھے۔ اس دن کے بعد سے
وہ سیماب کو پک کرنے کے لئے اس کے گھر بھی نہیں گیا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ اسے
دھتکار دے گی اور سیماب یونیورسٹی میں بھی اس کے قریب نہیں آتی تھی۔ اسے
جتنس تھا کہ سیماب کس کے ساتھ آتی اور جاتی ہے۔ لیکن اس نے کبھی سیماب کو
کسی اور کی موٹر سائیکل پر یا گاڑی میں جاتے نہیں دیکھا۔ ایک دن اس نے چیک کیا تو
پتا چلا کہ وہ پوائنٹ کی بس سے آتی جاتی ہے۔ نجانے کیوں اسے یہ بات اچھی لگی۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ اس روز اسے دیر تک سونا تھا لیکن کسی نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر
اسے اٹھا دیا۔ یہ الگ بات کہ اس سے ٹھیک طور پر آنکھیں بھی نہیں کھولی جا رہی

تھیں مگر ادھ کھلی آنکھوں سے اسے سیماب کا چہرہ نظر آیا تو اس کی آنکھیں چوہٹ ہو
گئیں۔ پوری طرح سے کھلی ہوئی آنکھوں سے بھی سیماب نظر آتی تو وہ آنکھیں مل
مل کر دیکھنے لگا۔

”تم خواب نہیں دیکھ رہے ہو۔ یہ میں ہی ہوں۔“ سیماب کے لہجے میں سوگوار
تھی۔

اس کے لہجے نے اسے غور سے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ حیران رہ گیا۔ اس
نے سیماب کو اس حال میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بت اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔
اور کمزور بھی۔ اس کی متورم آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ ٹھیک سے سو نہیں سکی ہے۔ یا
پھر اٹھنے کے بعد دیر تک روتی رہی ہے۔

”کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ سجا نے گہرا کر پوچھا۔
سیماب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس سے بولا نہیں گیا۔ بس اس نے نفی میں
سر ہلا دیا۔

”ہوا کیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے پتا چل گیا کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“
سجا کا ذہن پوری طرح جاگا نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ”اس
لئے تم نے یہ حال بنا لیا۔“

”یہ تو خود بخود ہو گیا۔“

”لیکن عاقل۔۔۔؟“

”رشتہ آتی تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں نے پلا سے کہہ دیا کہ میں تمہارے سوا
کسی سے شادی نہیں کروں گی۔“

”پھر؟“

”پلانے کہا۔۔۔ جو تم چاہو گی، وہی ہو گا۔“

”تو پھر یہ حال کیوں ہے تمہارا۔ تمہیں پریشانی کیا ہے؟“ سجا جھنجھلا گیا۔
”پریشانی یہ ہے کہ میں تمہارے قاتل نہیں ہوں۔“ سیماب نے کہا اور پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگی۔

سجاد نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا۔ ”یہ تم ہے کس نے کہہ دیا کہ تم میرے قاتل نہیں ہو۔“

”شاید میں نارمل نہیں ہوں.... ہے نا؟“ سیما نے اسے تائید طلب نظروں سے دیکھا۔ ”میں بہت مشکل لڑکی ہوں۔ اور تم بہت اچھے.... بہت سیدھے ہو۔“

”محبت ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔“ سجاد نے کہا۔

”لیکن میرے اندر کی آزاد“ بے باک اور باغی سیما کا تم کیا کرو گے؟“

”اس کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم شادی کے بعد زندگی کیسے گزارنا چاہتی ہو۔ اپنے شوہر سے کیا توقع رکھتی ہو۔“

سیما کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ وہ گھر میں مطلق العنان“

مگر محبت کرنے والا مہمان شوہر بن کر رہے۔ اور میں خدمت گزار کیوی ہوں۔ اس کی ہر بات مانوں، اس کا گھر ستواؤں، سجاؤں۔ وہ ایک مکمل مرد ہو.... اپنی بات منوانے والا۔ مگر....“ وہ کہتے کہتے رکی۔ ”اب جو میں کہوں گی، اسے سن کر تم خفا ہو جاؤ گے مجھ سے۔“

”نہیں ہوں گا۔ میں بہت محبت کرتا ہوں تم سے۔ تمہارے مرض کو بھی سمجھتا ہوں۔ اس کے لئے دوا سوچنے کی کوشش بھی کروں گا۔ تم کھل کر بتاؤ.... صاف اور واضح۔“

سیما ہنسی بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ ”اور میں چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد وہ گھر سے باہر چھپ چھپ کر مجھ سے ملے.... محبت کرنے والوں کی طرح.... وہ مجھے گھنیا ہوٹلوں میں لے کر جائے۔ مجھ سے اور طرح کی محبت کرے.... شوہر کی محبت سے مختلف۔ ہم یوں ساتھ گھومیں، جیسے آوارگی کر رہے ہوں۔“

سجاد سوچتا رہا پھر اس نے سر اٹھایا۔ ”شادی سے پہلے تو یہ کام بے شک حلال ہے لیکن شادی کے بعد ایسا دشوار بھی نہیں۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔“

”دیکھو نا.... شادی تو بہت بڑی مضبوطی ہوتی ہے۔“

اس کی بات سے سیما کا حوصلہ دھولا۔ ”ابھی تم نے کہا تھا کہ محبت ہر مشکل کو

آسان کر دیتی ہے۔ یہ سچ ہے۔ تم جان ہی نہیں سکتے، سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ اس محبت کے زور پر میں بھی قسم کھاتی ہوں کہ اپنے اندر کی آزاد“ بے باک اور باغی سیما کو بے لگام نہیں ہونے دوں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہیں مثالی بیوی بن کر دکھاؤں گی۔ اطاعت شعار“ خدمت گزار بیوی۔ لیکن میں اپنے اندر کی دوسری شخصیت کو بالکل ختم نہیں کر سکتی۔“

”یہ سب تمہارے نام کا قصور ہے سیما۔“ سجاد نے کہا۔ ”سیما ہو تو قرار اور ٹھنڈاؤ کہاں۔ سکون کہاں۔“

سیما کی آنکھیں جپکنے لگیں۔ ”میرا ایک نام اور بھی ہے۔“

”ایک اور نام؟“ سجاد نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں۔ دلاوی نے عقیقے کے موقع پر میرا نام قدیر رکھا تھا۔ لپٹا کو سیما پسند تھا۔ سیما سب کی زبان پر چڑھ گیا لیکن اسکول، کالج میں میرا نام قدیر سیما ہی لکھوایا گیا۔“

”بہت پیارا نام ہے.... قدیر۔“ سجاد نے پر خیال لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب ہے اس کا؟“

”پائیز۔“

”تمہیں اچھا لگا؟“

”بہت زیادہ۔“

”بس تو میں اپنے نام سے سیما خارج کر دوں گی اور صرف قدیر بن کر رہوں گی۔“

”کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنی اس سیما شخصیت کو ختم نہیں کر سکتیں تو نام کو ختم کرنے کا فائدہ۔“

”تو پھر کیا کروں؟“

”میں نے کہا نا کہ محبت ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔“ سجاد کی آنکھیں جپکنے لگیں۔ ”قدیر میری بیوی بن کر میرے گھر میں رہے گی۔ اور سیما سے میں محبت کروں گا۔ گھر سے باہر چھپ چھپ کر لوں گا۔ اسے آزادی کا احساس دلانا رہوں گا۔“

”تم... تم ایسا کر سکتے ہو؟“

”ہر روز تو نہیں۔ ہفتے میں ایک بار تو کر ہی سکتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ گھر میں تم صرف قدیم ہو گی... میری بیوی... قدیم سچلو۔“

”خدا کی قسم“ میں ہمیشہ تمہاری احسان مند رہوں گی۔ تمہیں کبھی شکایت نہیں ہو گی مجھ سے۔“

اسی وقت سچلو کی نظر گھڑی پر پڑی۔ اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ سوا آٹھ بجے تھے ”ارے... تم نے اتنی جلدی جگا دیا مجھے۔ یہ تو ظلم ہے۔“

”لیکن...“

”کچھ نہیں۔ بس اب تم جاؤ مجھے چین سے سونے دو۔ شام کو امی اور ابو تمہارے گھر آئیں گے... میرے لئے تمہیں مانگے۔ ٹھیک ہے؟“

”ہاؤ سوٹ آف یو۔“ وہ دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔



سچلو نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے دس بجے تھے۔ ابھی اسے ڈھائی گھنٹے اور... وہ چونکا۔ اسے خیال ہی نہیں رہا کہ اب انتظار کی ضرورت نہیں۔ اس کا اہم ترین اور من پسند پلانٹ منٹ کیٹسل ہو چکا ہے۔ سیلاب اس سے ملنے کبھی نہیں آئے گی۔

وہ پھر سوچوں میں کھو گیا۔

یہ حقیقت تھی کہ قدیم نے مثالی بیوی بن کر دکھایا۔ اس نے گھر کو جنت بنا دیا۔ اس نے گھر میں بچوں کو بھی کبھی وہ کچھ نہیں کرنے دیا جو اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ بہت اطاعت شعار اور ڈسے دار بیوی ثابت ہوئی۔ گھر میں اس کا حکم چلتا تھا۔ قدیم نے کبھی اس سے بحث نہیں کی... اختلاف نہیں کیا۔ وہ ایسی مشرقی بیوی بن کر رہی جو مشرق میں بھی کم ہی ہوتی ہیں۔

اور سیلاب! سیلاب نے بھی اسے ہمیشہ خوشی اور طمانیت دی۔ اس کے اعصاب کو پرسکون کیا۔ اس کی تسکین دھو ڈالی۔ اس سے مل کر ہر بار وہ زندگی کی دوڑ میں پھر سے حصہ لینے کے لئے تازہ دم ہو جاتا تھا۔

گویا قدیم اور سیلاب دونوں نے اس پر احسانات کئے۔ اور وہ یہ سمجھتا رہا کہ سیلاب پر احسان کر رہا ہے۔ اب وہ سیلاب سے محروم ہوا ہے تو پتہ چلا ہے کہ... وہ سوچتے سوچتے چونکا۔ ”محرومی کیسی۔ یہ تو نجات کلائے گی۔ میں تو رٹا تھا اس علت سے۔ لیکن مجبور تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔

اس پر اس کے اندر کوئی مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ کسی کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلاتے ہوئے شوق تو یہ تمہارا بھی تھا۔ اندر سے کوئی بولا۔

”نہیں۔ یہ تو بس ایک سمجھوتا تھا۔“

ابتدا میں سمجھوتا ہو گا مگر بعد میں شوق بن گیا۔ ایسا نہ ہوتا تو محرومی کا احساس کیوں ہوتا۔“

سچلو نے خود کو مٹھایا۔ وہ آنکھی کا لٹھ تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ ”بھلا“ وہ بزدل بھی ہے اور شرمیلیا بھی۔ یہ درست ہے کہ سیلاب نے اسے راستہ دکھایا۔ لیکن اس کے بعد اس نے ہمیشہ اس ملاقات اور سیلاب کی قربت سے لطف اٹھایا۔ اسی لئے اب محرومی کا احساس ہو رہا ہے۔

اس نے خود کو مزید مٹھایا۔ اور بہت کچھ جان لیا۔ وہ بہت مختلط طبیعت کا مالک تھا۔ یہ سب کچھ اس طرح نہ کرتا اس کا اپنا انداز اور ہوت۔ وہ کوئی رسک نہ لیتا۔ اور وہ شرمیلیا تھا۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ لوگوں کی گندگی اچھاتی نگاہوں سے بچتا۔ وہ یہی سب کچھ عزت سے کرتا۔

مگر کیسے؟ یہ ایک بہت بڑا اور اہم سوال تھا۔

اور اس کا جواب اس کے تصور نے اسے دکھا دیا۔ وہ اس تصور میں کھو گیا جو

حقیقت کا روپ کبھی نہیں دھار سکتا تھا۔

اس نے تصور میں خود کو اسی دفتر میں بیٹھے دیکھا۔ وہ سیلاب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگلے روز سیلاب سے ملتا ہے مگر اسے سب کچھ خود ہی اربٹ کرنا تھا۔ سیلاب کا اس پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔

سچائی چوک کا تصور کرتے ہوئے اس پر ہول چڑھنے لگا۔ سیلاب کو وہاں سے پک کر لانا اچھا خاصا تماشہ تھا... نہیں... خود کو تماشہ بنانے کے مترادف تھا۔ جو بھی وہاں انہیں

ٹپ دی۔ کمرے میں نما دھو کر فریش ہونے کے بعد اس نے روم سروس کو فون کر کے کافی طلب کی۔ ویٹر کو بھی اس نے ٹھٹھی ٹپ سے نوازا۔

سات بجے وہ ہوٹل سے نکل آیا۔ یہ جو دو گھنٹے اس نے وہاں گزارے تھے، وہ اضافی احتیاط تھی۔ ورنہ وہ اگلے روز سیماپ کو لے کر آتا اور کمرہ لیتا تو بھی کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ بس یہ ہو سکتا تھا کہ اس کے اور سیماپ کے بارے میں خراب تاثر مرتب ہوتا۔ حالانکہ یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ بڑے ہوٹلوں میں کسٹمر معزز، کسٹمر ہوتا ہے، کچھ اور نہیں۔ لیکن وہ ایک ایسی ویسی نظر کا خطرہ بھی محسوس نہیں لے رہا تھا۔ پھر تصور میں اگلا دن آگیا۔ لپائنٹ منٹ کینسل کرنے کا مسئلہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے ایک ہفتے پہلے اس دن کے بارے میں فیصلہ کیا تھا۔ لہذا سکرٹری کو بتا دیا تھا کہ اس دن کے لئے کوئی لپائنٹ منٹ نہ دے۔ ”اس من ڈے کو میری ایک پارٹی سے میٹنگ ملے ہے۔“ اس نے سکرٹری سے کہا۔ ”ساڑھے بارہ بجے سے ساڑھے چار بجے تک میں دفتر میں نہیں ہوں گا۔“

اس احتیاط کے نتیجے میں دفتر کے لوگوں کی معنی خیز نظروں، مسکراہٹوں اور تھروں کا اس نے گھاگھونٹ دیا۔ دوسرے اسے دفتر سے تیار ہو کر بھی نہیں جانا تھا کہ دفتر کے لوگوں کو شبہ ہو نہ۔ بریف کیس میں کپڑے لے جا کر وہ ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ اب اسے ایسی باتیں میں پارٹی سے میٹنگ کے لئے نکل جانا تھا۔

اس نے سیماپ کو فون کیا۔ ملاقات کا وقت طے کرنے کے بعد اس نے سیماپ سے کہا ”شیرٹن کے کمرہ نمبر 715 میں آ جانا۔“

وہ ساڑھے بارہ بجے ہوٹل کے لئے نکل لیا۔ وہاں اس نے کپڑے بدلے اور سیماپ کا انتظار کرنے لگا۔ ایک بجے سیماپ آگئی۔ چار بجے سیماپ رخصت ہوئی۔ سو چار بجے اس نے چیک آؤٹ کیا۔ ساڑھے چار بجے وہ دفتر پہنچ گیا۔

اس پورے معاملے میں کہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ تھا ایک عزت دار آدمی کا رویہ۔

تصور کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ واقعی.... یہ تو بالکل محفوظ طریق کار ہے۔ اس نے خوش ہو کر سوچا۔ کاش میں نے سیماپ سے اس پر اصرار کیا ہوتا۔ بلا ارادہ اس کی نظر گڑی

دیکھے گا؟ یہی سمجھے گا کہ ایک عیاش آدمی کسی خراب عورت کو اپنی مطلب برآری کے لئے لے جا رہا ہے۔ کیسی خراب بات ہے۔ جبکہ اس کی ضرورت نہیں۔

پھر ملنے کے لئے ایسے کسی ہوٹل کا رخ کرنا، جو اس معاملے میں بدنام ہو، بہت بڑی حماقت تھی۔ قہر اور ایکسائٹ منٹ تو چھپ کر ملنے میں ہے، نہ کہ رسوائی کا خطرہ مول لینے میں۔ فائیو اسٹار ہوٹل مکمل طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔ وہاں ملنے میں ایکسائٹ منٹ، قہر اور انجوائے منٹ سبھی کچھ ہو گا۔ کیونکہ بے عزتی اور رسوائی کا خطرہ نہیں ہو گا۔ جہاں یہ خطرہ ہو، وہاں کم از کم اس کا ایکسائٹ منٹ تو کم ہو جائے گا۔ اس نے تصور میں شیرٹن ہوٹل کا نمبر ملایا۔ ”مجھے ایک کمرہ چاہیے۔“ اس نے اپنے کریڈٹ کارڈ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

”یور آر ویل کم سر۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”آپ کب تشریف لائیں گے؟“

”پانچ بجے۔“

”آپ کا نام۔“

”سجاد حمید۔“ اس نے بلا جھجک جواب دیا۔

”آپ کے لئے روم نمبر 715 ریزرو کیا جا رہا ہے۔ جب تشریف لائیں، ریمیشن سے چالنی لے لیں۔“

اگلے مرحلے میں اس نے گھر فون کیا۔ ”قدسیہ.... آج مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ مائنڈ تو نہیں کر دی۔“

”نہیں۔ مگر یہ بتائیں کہ کب تک آئیں گے؟“

”زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک۔ کھانا گھر پر ہی کھاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے سجاد۔“

اس کے بعد وہ پانچ بجے دفتر سے اٹھا۔ شیرٹن پہنچنے میں پانچ منٹ لگے۔ ریمیشن سے اسے چالنی مل گئی۔ اس کے پاس صرف ایک بریف کیس تھا، جس میں چلتے وقت اس نے دفتری وارڈ روپ سے دو جوڑے کپڑے نکل کر رکھ لئے تھے۔

پورٹ اس کا بریف کیس لے اس کو کمرے تک پہنچانے آیا۔ اس نے اسے معقول

”آپ نے مجھے بلایا سر؟“

”تو میں اور کس لئے بزر دروں گلہ“ ہاس نے جھنجھلا کر کہا۔

”پر آپ نے کہا تھا آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا ہے۔“

”ہمت ضروری بات ہے مس لوسی۔ پلیز سٹ ڈاؤن۔“

”تھینک یو سر۔“ لوسی بیٹھ گئی۔

”مس لوسی“ ”You are fired“ ہاس نے کہا۔

لوسی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ کوئی یونٹی کسی وجہ کے بغیر کسی کو ملازمت

سے نکال سکتا ہے۔

”I beg your pardon sir“

”میں تمہیں ملازمت سے نکال رہا ہوں۔ تمہیں فوری طور پر دفتر چھوڑ دینا ہے۔“

کل کسی وقت آکر اکاؤنٹسٹ سے حساب صاف کرا لیتا۔“

لوسی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”لیکن سر، میرا قصور۔۔۔“

”میں ابھی بتاتا ہوں۔ لیکن پلیز، تم رونا نہیں۔“ ہاس نے گزبڑا کر کہا۔ ”دیکھو

لوسی، تمہیں یاد ہے، تم نے کہا تھا، تمہیں کسی سے پیار ہو گیا ہے۔“

لوسی کی نم آنکھوں میں حیرت جھلکی۔ ”لیکن سر، یہ سزا۔۔۔“

”اور تم نے کہا تھا کہ تم اس کے لئے ہاف وائف بھی بن سکتی ہو۔“

”تیس مرہ۔“ لوسی نے اور زیادہ حیران ہو کر کہا۔ ”لیکن اس کی اتنی بڑی سزا۔۔۔“

”تم میری بات سنو۔“ ہاس نے اس کی بات کٹ دی۔ ”میں سکریٹری کو ہاف

وائف سمجھنے کا قائل نہیں ہوں۔“

”لیکن سر۔۔۔“

”اور مجھے ایک ہاف وائف کی ضرورت ہے۔“

”لیکن سر، میری جاب۔۔۔“

”اب میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ ڈو یو لوی؟“

لوسی کا دل ایک لمحے کو دھڑکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا

ہو رہا ہے۔ ”آف کورس سر۔“

کی طرف اٹھی۔ پونے گیارہ بجے تھے۔ یعنی ابھی اسے مزید ڈیڑھ گھنٹا گزارنا تھا۔ اچانک

اسے خیال آیا کہ وہ عادتاً حساب لگا رہا ہے۔ ورنہ آج اسے کہیں نہیں جانا ہے۔

”وہ چوری چوری کی ملاقاتیں ختم میاں۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”اب پابنٹ

منٹ تو کینسل ہو چکے مگر ابھی میز کا کام اور ڈاک تو نمٹاؤ۔“

اس نے ڈاک اپنی طرف کھینچی مگر اس سے پہلا خط بھی نہیں پڑھا گیا۔ ایک

عجیب سی بیوی اس کے ذہن کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اس کی کیفیت اس پہنچے

کی سی تھی، جس کا من پسند کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔

کام تو کیا ہوتا تھا! اگلے پندرہ منٹوں میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ملاقات نہ ہوئی

تو شاید اب وہ کبھی دفتر کے کام پر۔۔۔ اپنے کاروبار پر۔۔۔ دفتری معاملات پر پہلے جیسی توجہ

نہیں کر سکے گا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ ملاقات، وہ تھوڑی سی بے وفائی اس کے

سسٹم کا حصہ بن چکی ہے۔ وہ اس کے وجود کی بہتری کو چارنج کرتی تھی۔ اس کی

توانائیوں کو نیا کرنت فراہم کرتی تھی۔ وہ تازہ دم ہو جاتا تھا۔ اور اب اس سے محرومی پر

جو پڑھو گی اس پر طاری ہو رہی ہے، یہ ہر روز بڑھتی رہے گی اور وہ زندگی کے شعلے

سے محروم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ خون کی گردش تیز کرنے والے بیجان کی جگہ خون

کو سرد کرنے والی بیوی نے لے لی ہے۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔



لوسی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی اور بور ہو رہی تھی۔ اس کے پاس کوئی کام ہی

نہیں تھا۔ ہاس کے بلاؤے والا بزر چلایا تو وہ حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ ہاس نے۔ ”ڈونٹ ڈسٹرب“ کا حکم سنانے کے بعد اسے طلب کیا

تھا۔ بلکہ اسے تو یقین تھا کہ ہاس نے بے خیالی میں بزر دلیا ہے۔ چنانچہ وہ بیٹھی رہی۔

لیکن بزر دوبارہ چلایا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا

تھا۔ اس نے جلدی سے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بنایا اور ڈرتے ڈرتے دروازہ

کھول کر ہاس کے کمرے میں چلی گئی۔ باہر کا چہرہ دیکھ کر اسے کچھ ہونے لگا۔ وہ

مضطرب اور زروس نہیں، پریشان اور وحشت زدہ لگ رہا تھا۔

”اور اس لمحے کے بعد مجھے سرکھی نہ کہنا۔ میرا نام سجاد ہے۔“
 ”آل رائٹ جی۔ جاد۔ میں جانتی ہوں۔ ایک بیجے۔۔۔ او کے؟“

لوسی کے جاتے ہی سجاد نے انٹر کالم پر رحمان صاحب کا نمبر ملایا۔ ”میری بات غور سے سنیں رحمان صاحب۔“ اس نے انٹر کالم پر کہنا۔ ”میں نے لوسی کو ملازمت سے نکال دیا ہے۔ آج تو میں ایک کالم سے جا رہا ہوں۔ کل سے مجھے سکرٹری کی ضرورت ہو گئی۔ فی الحال آپ دفتری لڑکیوں میں سے کسی کو بھیج دیں۔ پھر نئی سکرٹری کے لئے اشتہار دے دیں۔“
 ”ٹھیک جناب۔“

انٹر کالم رکھ کر اس نے سامنے رکھی فائل کھول لی۔ لیکن فائل کے کھنڈات اور ان کے مندرجات اس کے لئے بے معنی تھے۔ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے تصور میں لوسی کا چہرہ ابھر آیا۔

وہ حیران ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے بیوی کے سوا کسی کا تصور کیا تھا۔ دوسری حیرت اسے اس بات پر تھی کہ لوسی اتنی حسین ہے۔ وہ غیر چاہب داری سے کہہ سکتا تھا کہ لوسی کا حسن زہد ممکن ہے۔ اور لوسی کو اس کے پاس تین سال ہو گئے تھے۔ لوسی اس پر ملتفت بھی تھی۔ اشاروں اور آوازوں سے وہ یہ بتا بھی چکی تھی مگر اسے اس کی خوب صورتی کا اندازہ تک نہیں تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ لوسی نے دلکش سرپلا کے تصور نے اس کے وجود میں پہچان جگا دیا تھا۔ سنسنی موجد در مونج جسم کی دیواروں سے سر نکرتی پھر رہی تھی۔ اور اسے ابھی بچپن منٹ اور گزارنے تھے۔ کاش اس نے اس بارہ بیجے بلایا ہوتا۔ اس نے بے تلی سے سوچا۔

”یہ بھی اچھا ہے کہ آج کا دن ضائع ہونے سے بچ گیا۔“ اس نے خود کھائی کے انداز میں کہا پھر وہ اٹھ کر اس شیفٹ تک گیا، جس کے پیچھے اس کا وارڈ روب تھا۔ اس نے بین کو دیا کہ شیفٹ سر کیا اور وارڈ روب کا جائزہ لینے لگا۔ آج تو اسے خصوصی اہتمام کرنا تھا۔ وہ پہلی پہلی ملاقات ہو تھی۔

کپڑوں کا جائزہ لینے ہوئے وہ مگنٹا رہا تھا۔ چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی

”Then I accept it with gratitude.“

”ٹھیک یو سر۔“ لوسی نے خود کھائی کے انداز میں کہنا۔ ”لیکن میری چاہب۔۔۔“
 ”میں تمہیں ایک اور چاہب دے رہا ہوں تم نے کہا تھا کہ تم محبت کی خاطر پاف وائف بن سکتی ہو۔“
 ”میں سر۔“

”تو اب تمہاری دفتر سے چھٹی۔ تنخواہ میں ایک ہزار روپے کے اضافے کے ساتھ اب تم میری پاف وائف ہو۔“

لوسی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یوں بیٹھے بیٹھے من کی مراد مل رہی تھی۔ اسے ڈر ہوا کہ ہاس کہیں اسے tease تو نہیں کر رہا ہے۔ ”آپ یو سیرس سر؟“
 ”آف کورس، آئی ایم۔ ورنہ ملازمت سے کیوں نکالتا تھیں۔ اتنی اچھی سکرٹری کو کون کھونا چاہتا ہے۔“

”لوں میں لوسی کا اعتماد کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔“ ٹھیک یو فار دی کمپلیمنٹ۔
 لیکن سر، مجھے کرنا کیا ہو گا۔“

”گھر بیٹھ کر ہر روز گیارہ بجے تک اسٹینڈ بائی رہنا ہو گا۔۔۔ میری کل کا انتظار کرنا ہو گا۔ میں کل نہ دوں تو باقی دن کے لئے آزادی۔ کل کر دوں تو تمہیں میرے بتائے ہوئے وقت پر جہاں میں بلاؤں، وہاں پہنچنا ہو گا۔ میں کسی بھی فائیو اشار ہوٹل کا روم نمبر بتاؤں گا تمہیں۔ آسکتی ہو نا؟“

”شیور سر۔“ لوسی نے لگھوٹ بھرے لہجے میں کہنا۔
 ”لیکن آج ایمرجنسی ہے۔ یہ بتاؤ، سچائی چوک دیکھا ہے؟“
 ”میں سر۔“

”بس تو ایک بجے وہاں پہنچ جانا۔ میں تمہیں پک کر لوں گا۔ اب جاؤ۔ سوا گیارہ بج چکے ہیں۔“

”میں جاؤں سر؟“ لوسی کے لیے میں بے یقینی تھی۔
 ”میں جو کہہ رہا ہوں۔“ ہاس نے سخت لہجے میں کہنا۔ ”اور یاد رکھو“ میں اپنی بات دہرانے کا قائل نہیں ہوں۔“
 ”میں سر۔“

27 جنوری 98ء

ڈیئر سونیا

گزشتہ رات کی بانی کو میں نے اور شام نے بہت انجوائے کیا۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے ہمیں مدعو کیا۔ ایک بات تم سے پوچھنی تھی۔ اس سال اپنا سالگرہ کے موقع پر تم ہماری طرف آرہی ہو یا نہیں۔ اور تمہارے ساتھ کوئی سہماں بھی ہو گا؟ جواب جلد دیتا

تمہاری نیلم راٹھور



نیلیم
نیلیم فروری 98ء

میں سونیا کے کہنے پر آپ کے خط کا جواب دے رہی ہوں۔ سونیا جی کو افسوس ہے کہ وہ آپ کے ہاں نہیں آسکیں گی۔ ویسے یہ بات میرے اور آپ کے بیچ ہے کہ اب سالگرہ کو بھلا دیتا ہی بہتر ہے۔ وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے ہر سال عمر میں ایک سال کا اضافہ ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اضافہ خواتین کیلئے عموماً اور فلم اشارز کیلئے خاص طور پر تشویش کا باعث ہوتا ہے۔ سالگرہ نہ منانی جائے تو کم از کم عمر بڑھنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ آج کل سونیا جی کو عمر کی فکر ستا رہی ہے۔

لیکن بعد میں موقع ملنے پر چند روز کی چھٹیاں پونا میں گزارنا یقیناً فائدہ مند ہو گا۔ شام جی سے کہئے گا کہ میں اب بھی کیرم میں انہیں لے کر آتی ہوں۔

روشن چاولہ نے سونیا کو خط لکھا تھا تو تم دونوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ ابھی روشن کی نئی فلم نے باکس آفس پر کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کئے ہیں۔ شاید تمہارے فلم میں ہو گا کہ روشن نے شادی کر لی ہے۔ اس شادی پر سونیا نے کسی خاص رد عمل کا مظاہرہ تو نہیں کیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اب بھی روشن پر جان چھڑکتی ہے۔

تمہاری، سیماسودی



پروانہ

26 جنوری 98ء

بیاری سونیا جی

شاید آپ کو یاد ہو میں نے چند ہفتے پہلے آپ کو فلم ”لاچار“ کی عظیم الشان کامیابی پر مبارک بلا کا خط لکھا تھا۔ آپ کی نئی فلم ”زبردست“ کے پریمرز۔ کی خبر پڑی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی یہ فلم بھی سپر ہٹ ہو گی اس لئے کہ آپ جیسا باصلاحیت فلمی دنیا میں کوئی اور ہے ہی نہیں۔ آپ کے حسن و جمال کا تذکرہ اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ اس میں تو آپ کا کوئی ہم سر ہے ہی نہیں۔ آپ کی ایک جھلک دیکھ کر ہی مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔

آپ سے ایک التجا ہے اپنی ایک تازہ ترین تصویر اپنے انوگراف کے ساتھ بھجوا دیجئے۔ میرے پاس آپ کی ایسی تصویروں کا اچھا خاصا خزانہ موجود ہے۔ شکریہ۔ آپ کی شمع حسن کا سب سے بے تاب پروانہ۔

ساز انجمن



کل میں پرانے کھنڈرات ٹٹول رہا تھا تو اچانک مجھے تمہارا اور اپنا میرج سرٹیفکیٹ مل گیا۔ میں نے سوچا کہ اس کی یسٹیشن کرا کے جنسین بھجواؤں گا۔ سالگرہ کے تحفے کے طور پر، لیکن پھر مجھے اس پر تمہاری تاریخ پیدائش نکلی نظر آگئی۔ میرا مطلب ہے سال پیدائش۔ سمجھ رہی ہو نا؟

چالیس کی دہائی میں داخلہ مبارک ہو میری جان! اس بار سالگرہ پر کوئی تماشہ نہ کرنا۔ کم از کم زیادہ پینے کے بعد رقص بالکل نہ کرنا۔

میں میل کی شوٹنگ نسا کر مینے کے آخر تک مہینی پسپوں گا۔ ارادہ ہے کہ سنگیتا کو لے کر تمہارے ہاں آؤں گا۔ تم یقیناً اسے پسند کر دو گی۔ بہت پیاری لڑکی ہے وہ۔
خدا کا گھا گھونٹ رہا ہوں۔ شوٹنگ کا وقت آپہنچا ہے۔ کام اتنا ہے کہ سانس لینے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔

پرانی بھتیجیوں کے ساتھ۔ تمہارا روشن چاولہ

تم بڑے ہی بے ایلن ہو۔ ابھی سے مجھے 40 سال کا بتائے دے رہے ہو اور بھی عمر سے کیا ہوتا ہے۔ آوی کی عمر وہ کبھی جانی چاہیے جو اس کے جسم اور چہرے سے نظر آئے۔ میں جانتی ہوں کہ دیکھنے میں، میں تیس کی بھی نہیں لگتی مگر تم سے تو نہیں چھپایا جاسکتا کہ اس بڑھ ڑسے پر میں 34 کی ہو جاؤں گی اور میرج سرٹیفکیٹ جائے جنم میں۔ ان دنوں میں سادہ لوح ہوتی تھی اور اپنی عمر زیادہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ بلوائی کا زمانہ تھا وہ۔

دیسے تم نے وہ سرٹیفکیٹ اب تک سنبھال کر رکھیا ہوا ہے۔ اب تو ہماری علیحدگی کو بھی چار برس ہو گئے۔ مگر سچ یہ ہے کہ میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ کاشی سے ملاقات ہوئی تھی وہ تمہاری وائف سنگیتا کی بڑی تعریف کر رہی تھی۔

بس وہ کہہ رہی تھی کہ لڑکی دماغی ماحول کی ہے اور گھبرائی گھبرائی رہتی ہے اور یہ کہ اس کی آنکھوں میں معمولی سا فرق ہے، انیس بیس کل اب اسے بھیگا پن تو نہیں کما جا سکتا۔ برا نہ مانا اب میں اس سے جلوں گی تو۔ تم سے محبت جو کرتی ہوں۔
سنو روشن، اگر تم میرج سرٹیفکیٹ کو ضائع نہیں کر سکتے تو کم از کم میری پیدائش کے سال پر روشنائی ہی گرا دو۔ برسوں کے تعلق کی خاطر ہی سہی۔
وہی پرانی ولی۔ سونیا کرن

آپ کے جنم دن کو تو میں بھول ہی نہیں سکتا تھے تو آپ کو بہت قیمتی ملے ہوں گے اور سیکڑوں ملے ہوں گے۔ میں نے آج صبح دعا کی ہے کہ اس سال کے تمام ایوارڈ آپ ہی کو ملیں۔ آپ اتنی بڑی فنکار ہیں کہ میرا بس چلنا تو میں آپ کے جنم دن کو قومی دن قرار دلوادیتا۔

بے حد عاجزی سے یاد دلا رہا ہوں کہ آپ کی دستخط شدہ تصویر مجھے ابھی تک نہیں ملی۔ کچھ ڈاک کا نظام بھی ہمارے ہاں ایسا ہی ہے۔ میں نے تصویر کیلئے اپنے کمرے میں ایک خاص جگہ بنائی ہے۔ آپ تصویر بھجوا دیں تو میرا وہ دن یادگار ہو جائے۔

آپ کی شمع حسن کا پروانہ۔ سارا انجمن

مسلما گلی ران اوون میں رکھ دی ہے۔ آپ اوون کو 250 پر لے آئیں اور بیس منٹ تک رہنے دیں۔ اب مجھے خیال آ رہا ہے کہ پتا نہیں، آپ کو اوون آن کرنا بھی آتا ہے یا نہیں۔ خدا کرے یاد ہو۔ بھولے گا نہیں۔ ٹی وی شو کیلئے آپ کو لے جانے والے گاڑی سائزے دس بجے آئے گی۔ اس لیے آج اپنی پارٹی ذرا جلدی ختم کر دیں اور آوازیں بھی نیچی رکھیں۔ پڑوسیوں کا خیال تو رکھنا پڑے گا اور سننے میں کل گیارہ بجے سے پہلے نہیں آؤں گی۔ لہذا نو بجے کا الارم لگا لیجئے گا۔ آپ کی سالگرہ کا تحفہ بیڈ

کی دراز میں رکھا ہے۔ سیکرٹری کی طرف سے جنم دن مبارک۔

آپ کی سیما



سونیا جی

ہمیں آپ کے پڑوسیوں کی طرف سے مسلسل شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ آدھی رات کے بعد سے صبح تک آپ کے اپارٹمنٹ سے شور وغل کی آوازیں آتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ جیسے اشارہ کی یہ مجبوری ہوتی ہے لیکن پھر بھی آپ کو اپنے پڑوسیوں کا خیال تو رکھنا ہو گا۔ وہ لوگ اشارہ بھی نہیں ہیں، انہیں سونا بھی ہوتا ہے اور پھر دن کی مصروفیات میں بھی جتنا ہوتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اس بات کا خیال رکھتے ہوئے رقص و موسیقی کا ریاض مناسب وقت پر کرنے لگیں گی۔ اگر رات کی مجبوری ہے تو کوشش کریں کہ زیادہ آواز نہ ہو۔

خیر اندیش

سلمان نصیر سیکرٹری یونین نگار اپارٹمنٹس



20 فروری 98ء

اپارٹمنٹ ”سی“ کی پڑوسن

افسوس کہ تمہارا نام مجھے معلوم نہیں۔ تمہیں بھی میرا نام معلوم نہیں ہو گا۔ اس کے بلوجود لفٹ میں ہم اچھا خاصا لا لے۔ خیر مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے سخت کھادی کی مگر جی بات یہ ہے کہ تم نے مجھے غصہ دلا دیا تھا۔ میں برسوں سے سونیا کرن کی سیکرٹری ہوں اور یقین کرو، تم نے مجھے سونا جی پر تبصرے کیے، وہ سب غلط اور بے بنیاد تھے۔ بہرحال میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ ہوا اسے بھلا دیا جائے۔ اگلی بار سونیا جی کوئی پارٹی دیں اور وہ دیر تک چلے تو میرا مشورہ ہے کہ جیلے کڑھنے کے بجائے تم بھی آکر پارٹی میں شامل ہو جاؤ۔ ٹھیک ہے نا۔ اب اتنی چھٹی باتوں پر پولیس کو زحمت نہیں دی جاسکتی۔ مجھے یقین ہے کہ تم سونا جی کو پسند کرنے لگو گی۔

اگر تم چاہو تو تمہاری دوست۔ سیما مودی



21 فروری 98ء

مس مودی

سونیا کرن کی پارٹی میں اتنے عجیب انداز میں مدعو کرنے کا شکریہ لیکن میں اور میرے ہینڈل اس پیشکش سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ وجہ سادہ سی ہے۔ ہم سلوگی اور خاموشی سے زندگی گزارنے کے قائل ہیں۔ خاص طور پر صبح کے تین یا چار بجے، شور وغل اور ہنگامہ ہمیں بالکل اچھا نہیں لگتا۔ ہمارا خیال ہے کہ اوپر والے نے رات سوئے کیلئے بنائی ہے۔

رنگا کنور



21 فروری 98ء

مسز کنور

میری طرف سے تم جنم میں جاؤ مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

سیما مودی



22 فروری 98ء

ڈیر سیما

اشارہ پس کے لیے انٹرویو ریکارڈ کرانے جانا تھا۔ بہت سویرے اٹھنا پڑا۔ کل تمہیں یاد دلانا بھول گئی کہ اسٹیشنری کا معلوم کرو۔ چھپ گئی ہو تو منکوا لو۔ میرے رانٹنگ پیلہ ختم ہو رہے ہیں۔ اب نشو و نما پر کھینے کی فوج آئے والی ہے۔

میری تصویریں آگئی ہیں۔ میری طرف سے آٹو گراف دے کر مجھے پرستاروں کو مجبوراً دو۔ اور ہاں۔۔۔ ایک بات اور۔۔۔ ورنہ بھول جاؤ گی۔ یہ تمہیں لیا ہوا کہ تم نے پڑوس والی حسینہ کو جنم میں جانے کا مشورہ دے دیا۔ تم تو بڑے لطفے مزاج کی ہو۔ کچھ اپنی عمر کا خیال کرو۔

سونیا کرن



22 فروری 98ء

سونیائی

یہ تم نے عمر کا حوالہ کیوں دیا۔ میری عمر ہے ہی کتنی۔ سوچو تو میں تم سے دو سال چھوٹی ہوں اور اپنی عمر تم جانتی ہی ہو۔

جن پر ستاروں کے خطوط آئے ہوئے ہیں انہیں میں نے تمہارے دستخط کر کے تصویریں بھجوا دی ہیں۔ دلچسپ کٹور کو میں نے بتا دیا ہے کہ تم اسے فون کرو گی لیکن ”ذرا“ دیر سے۔ یعنی پو پھٹنے سے ذرا پہلے۔

ہاں! اسٹیشنری چھپ کر آگئی ہے۔ میں نے اسٹڈی میں میز پر رکھ دی ہے۔ میرے نئے لیٹر پیڈ بھجوانے پر شکریہ۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ بعض کلام تم کیسے چپکے سے کر لیتی ہو کہ تمہاری سیکرٹری کو بھی پتا نہیں چلا۔ کلفڈ بھی بہت خوب صورت ہے۔ اب میں اتنے شاندار پیڈ پر دیکھنا کہ سووے سلف کی فہرست بنا کر دوں گی! (دیوے بھی پیسہ ذرا منسلک کر خرچ کیا کہ کم از کم مجھے اتنی قیمتی چیزیں دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ فضول خرچی ہے۔)

ہاں! بد صورت پردوں کو جنم میں جانے کا مشورہ اس لئے دیا تھا کہ گلابیاں بچنے کی میری علت نہیں۔

تمہاری سیکرٹری سیما

25 فروری 98ء

بیاری سونیائی

کیا میں آپ کو صرف سونیا کہہ سکتا ہوں؟

آپ کی تصویر موصول ہوئی۔ بہت خوب صورت اور شاندار تصویر ہے لیکن تصویر کتنی ہی اچھی ہو، آپ کے حسن کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ کیراے چارہ تو خود بھی مرعوب ہو جاتا ہو گا! آپ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہوں گی۔

میں کلام پر جالتے ہوئے آپ کی تصویر کو اپنے ساتھ آڈیو ویڈیو شاپ لے گیا۔ کھانے کی چھٹی کے دوران میں، میں نے اسے فریم ہوائے کے لیے دیا۔ ارجنٹ۔

دیکھنا دار نے غزے تو کیے لیکن اسے کلام کرنا ہی پڑا۔ چھٹی کے بعد مجھے دیر تک فریم والے کے پاس بیٹھنا پڑا اس کا بس چلنا تو وہ تصویر خود ہی رکھ لیا۔ وہ یقیناً بہت خوش نصیب سمجھ رہا تھا۔

تصویر میں نے اپنے کمرے میں لگا لی ہے۔ اور بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ ایک بار پھر شکریہ۔

آپ کی شمع حسن کا سب سے بڑا پروانہ۔ ساحر انجمن

○

25 فروری 98ء

ڈیزر دالوال

شایبہ دالوال نے ذرا سے کا اسکرپٹ مجھے بھجوا دیا تھا۔ میں نے اسے پڑھا۔ اسکرپٹ کافی دلچسپ ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ تم جیسی اُستار کو اور اوپر لے جاسکتا ہے۔ میں اب یہ اسکرپٹ نہیں بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم جوابی کال کرو گی۔ سیما سے گپ شپ کرنا مجھے اچھا لگتا ہے لیکن جب تم سے کلام کی بات کرنی ہو تو اس طرح ٹرغائے جانے پر مجھے کوفت ہوتی ہے۔ میں نئے معاملے کے سلسلے میں تمہاری رائے جانتا چاہتا ہوں۔ ویسے یہ ڈراموں کی طرف آنے کا خیال ہے بہت اچھا۔ ورائٹی اسی طرح بنتی ہے۔

ہاں! فلمی ڈائریکٹری چھپ کر آگئی ہے۔ تمہارے تعارف میں سلی پیدائش کی کمی بری طرح ٹھکتی ہے۔

دلچسپ کٹور

○

26 فروری 98ء

ڈیزر دالوال

تم خوش نصیب ہو کہ دنیا کی سب سے چڑچڑی اور بد مزاج عورت تمہیں خوش مزائی سے خط لکھ رہی ہے۔

آج دن کا آتماز ہی خراب ہوا۔ میں بغیر کسی معقول وجہ کے بے چاری سیما پر

خوب برسی۔ خیر! ایسا بھی نہیں کہ وجہ نہ ہو۔ اگرچہ وہ اتنی معقول نہیں تھی۔ سیمانے میری پڑوس سے ایک ایسی جنگ شروع کر دی ہے جو میرے لیے اھصاب شکن ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بے چاری شاید خود کو کسی ریاست کی نواب زادی سمجھتی ہے۔ کیا خیرے ہیں اس کے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ اچھا پڑوسی بڑی نعمت ہوتا ہے اور برا پڑوسی۔ سوچتی ہوں! یہ اپارٹمنٹ اب سچ ہی دنوں۔

خیر! سیمائی خیر لینے کے بعد میں اسٹوڈیو گئی۔ وہاں اس بونے سے ککراؤ ہو گیا۔ ارے وہی ڈیزہ فٹ۔۔۔ بے رام۔ ہے تو وہ اتنا سا مگر خیرے اس کے توبہ توبہ لیکن کہتے ہیں کہ یوگا کا ماہر ہے۔ اس نے میرے لیے یوگا کی جو مشقیں تجویز کیں، وہ میرے بس کی ہیں عی نہیں اور میں نے یہ بات کہہ دی۔ اس پر وہ بولا کہ اشار بنانا آسان نہیں بنانا اشار رہتا ہے۔ بات میرے ہی کو لگی پھر اس نے حوصلہ افزائی بھی کی۔ کہنے لگا۔ ہر مشق شروع میں مشکل لگتی ہے مگر اوپر والے نے ایسا بتایا ہے کہ چند روز میں ہی ہر مشقت کو قبول کر کے اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس نے میرے بدن کی مستقبل کی جو پانچ تیشیں بتائیں انہیں من کر میں لیا گئی۔ اب کیا کیا جائے۔ روشن جان، فلمی دنیا میں ان رہنے کے لیے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

روشن، آج کل مجھ پر عمر کا خوف طاری ہو رہا ہے۔ خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگی ہوں میں۔ ایک بات بتاؤ۔ جب مجھے خوز پر ترس آنے لگتا ہے تو تمہیں اچھا لگتا ہے نا؟ اچھا ہی لگتا ہو گا اور سنو، ہریال آیا تھا میرے پاس ایک فلم کے لیے۔ پتا ہے پچاس لاکھ کی آفر کر رہا تھا۔ میں نے بھی کہا کہ اتنے معاوضے میں تو میں اپنا چالیس فیصد کلام مکمل کرا دوں گی۔ باقی کلام کسی سستی اداکارہ سے کرا لے۔ یہ سن کر شاید تم حیران ہو گے مگر یہ سچ ہے فلم کے لیے میں معاوضہ سوا کروڑ لے رہی ہوں۔ ٹی وی کیلئے رعایت کر دیتی ہوں اور اسٹیج کے لیے اور زیادہ۔ یہ اس لئے کہ میں خود کو آل راؤنڈر سمجھتا چاہتی ہوں۔ اسٹیج کا تو ہمارے ہاں رواج ہی ہے مگر روشن، سچ یہ ہے کہ اسٹیج پر کام کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ ہر لمحے الٹ رہو۔ ری ٹیک کی گنجائش نہیں۔ ایک بار پردہ اٹھ جائے تو پھر کچھ ہو نہیں سکتا۔ یادداشت کی آزمائش بھی ہوتی ہے اور حاضر جوابی کی بھی۔ پتا ہے، ایک بار میں مکالمہ بھول گئی لیکن فوراً ہی میں نے تہلیل

مکالمہ گھڑ لایا اور وہ اصل مکالمے سے بھی بہتر تھا۔ ڈائریکٹر نے میرے ہاتھ جوڑ لیے اور ٹی وی میڈیا کا فائدہ یہ ہے کہ مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں ہر گھر میں پہنچ گئی ہوں۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ فلمیں کم کروں مگر صرف معیاری۔ اپنا رول دیکھوں گی۔ مکمل اسکرپٹ کے بغیر فلم سائن نہیں کروں گی۔

اب خط ختم کرتی ہوں۔ سیمائے معذرت کرنا اسے مٹا بھی ہے۔ پچھلے پانچ منٹ میں بے چاری تین بار فریج کے پاس آ چکی ہے۔ بے وجہ۔ صرف مجھے متوجہ کرنے کیلئے۔ روشن، میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں مگر یہ محبت میرے مسائل حل نہیں کر سکتی۔

تمہاری سابق محبوبہ سونیا کرن



27 فروری 98ء

دوست ساجر

شاید میرا خط تمہیں حیران کر دے گا۔ کب سے میں نے تمہیں خط جو نہیں لکھا لیکن دہلی ایسا مصروف شہر ہے کہ آدمی کو فرصت ہی نہیں ملتی اور اچھے پیارے دوستوں کی سستی اور کلابی بھی معاف کر دینی چاہیے۔ تم بھی معاف کر دو۔ اس خط کا ایک مقصد تو تمہاری خیریت دریافت کرنا ہے۔ دوسرے میں اور تمہاری بھائی بیٹا 3 تاریخ کو چند روز کے لیے ممبئی آ رہے ہیں۔ سوچا ہے کہ تم سے بھی مل لیں گے۔ کچھ پرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔

دوست، میں تمہیں کسی زحمت میں نہیں ڈالتا چاہتا مگر بیٹا بت ضد کر رہی ہے۔ تمہارے لیے کوئی بڑی بات بھی نہیں۔ سونیا کرن سے تمہارے تعلقات اتنے گہرے ہیں کہ تمہارے لیے ہم کو ان سے ملوانا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ سمجھ گئے نا۔ آخر سونیا جی کے تم بہترین دوست ہو اور زی۔ ٹی وی کے پس پردہ کام کرنے والوں میں ناپ کے آدمی ہو۔ سونیا جی تمہاری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔ تمہاری بھائی بھی خوش ہو جائے گی۔

یہ میرا وعدہ رہا ہے کہ میں تمہیں سونیا جی کے سامنے شرمندہ نہیں کروں گا۔

اگرے کے پاگل خانے کا کوئی حوالہ نہیں دوں گا۔ اب تو میں بھی وہ نوکری چھوڑ چکا ہوں اور دنیا کو تمہارے متعلق کچھ معلوم ہی نہیں۔ ٹھیک ہے نا۔ پھر یہ ملاقات کچھ رہی؟

تمہارا دوست ہری

یکم مارچ 98ء

ڈیر ہری

ٹامسنگ نے بات خراب کر دی۔ سونیا تم سے مل کر یقیناً خوش ہوتی۔ میں بھی تمہارے ساتھ بیٹھ کر پرانے دنوں کی یادیں تازہ کرتا لیکن آج ایک ٹی وی سیریل کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں مجھے سونیا کو لے کر نئی تل کے لیے روانہ ہونا ہے۔ اس سیریل سے مجھے بڑی امیدیں ہیں۔ اس کا اسکرپٹ بہت زبردست ہے اور سونیا کا رول بہت بھرپور ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم آؤ گے تو ہم موجود نہ ہوں گے اور ہم واپس آئیں گے تو تم جا چکے ہو گے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

سونیا نے اصرار کر کے اپنی تازہ ترین تصویر پر تمہیں آؤگراف دیا ہے۔ اس کے اصرار پر یہ تمہیں بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے، پسند آئے گا۔ یہ خط اور تصویر کوریئر سروس کے ذریعے بھجوا رہا ہوں تاکہ تمہیں جلد ہی کیلئے روانہ ہونے سے پہلے مل جائے۔

تمہارا دوست۔ سائر انجیل

یکم مارچ 98ء

میری سونیا

مج بڑی گزب ہو گئی۔ میں دیر سے سو کر اٹھا تھا اور کلام پر جانے کی فکر تھی۔ میری جلد بازی کے نتیجے میں ایک چادر نے آگ پکڑ لی مگر میں آگ بجانے میں کامیاب ہو گیا۔ ویسے تو زیادہ نقصان نہیں ہوا لیکن ایک نقصان میں دل پر لے بیٹھا ہوں۔ میرے لیے وہ بہت بڑا نقصان ہے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے افسوس بھی ہو رہا ہے اور

شرمندگی بھی کہ آپ کی تازہ ترین تصویر بھی جل گئی۔ مجھے اندازہ ہے کہ تصویر کتنی جیتی تھی مگر میرے نزدیک اس کی قیمت اور زیادہ تھی بلکہ میرے نزدیک اس کی وقعت کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔

وہی ہی ایک اور تصویر حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ آپ ایک اور تصویر بھجوا سکیں تو جو کہیں، میں اس کی وہ قیمت ادا کروں گا۔ خواہ وہ میری حیثیت اور استطاعت سے بڑھ کر ہو۔ امید ہے، نوازش فرمائیں گی۔

آپ کا ادنیٰ پرستار۔ سائر انجیل

③

2 مارچ 98ء

سونیا جان

فصل باتیں سوچنا چھوڑ دو۔ تم آج بھی اتنی ہی حسین اور بلوکار ہو، جتنی پہلے تھیں اور تم یہ بات خوب جانتی ہو۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تم سدا ہمار ہو۔ گزرتا وقت تمہاری عمریں اضافہ نہیں کرتا بلکہ تمہیں اور تازہ کر دیتا ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں غیرت سے ہوں لیکن کبھی کبھی پریشان ہو جاتا ہوں۔ کل چپہ اور ایبتہ رات کے کھانے پر ہمارے ہاں آئے تھے۔ سگیتا انہیں دیکھ کر وہ مرعوب ہوئی کہ بس کیا کہوں۔ تم یقین نہیں کرو گی ایک گھنٹے تک تو اس بے چاری کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ یہ مبالغہ نہیں ہے، حقیقت میں سچ سچ یہی ہوا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے سگیتا سے یہی بات کسی مگر وہ تو اور بھگ گئی۔ عجیب حال ہو گیا اس کا اپنا کرا بند کر کے بیٹھ گئی اور مگی رونے لگی تو جانتی ہی ہو عورتوں کے رونے کے معاملے میں، میں کیسا ہوں۔ مجھے چپ کرنا اور بھلانا تو آتا ہی نہیں۔ انا روئی ہوئی عورت گلے پڑ جائے تو ہونٹ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے تم بہت یاد آئیں۔ تم اتنی۔ پراعتلو تھیں کہ کبھی وزیراعظم اور صدر مملکت سے بھی مرعوب نہیں ہوئیں۔ وہ ایسے مکار کا ڈنر تو تھیں یا وہی ہو گا۔ وزیراعظم کی بیوی کو تم نے اتنا بڑبا تھا کہ ان کی طبیعت بگڑنے لگی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ روشن، آپ

نہیں کر سکتا۔ 40 سال کی عمر تو اپنی جگہ حقیقت ہے جو بس اگلے سال بدلے گی۔۔۔
اور وہ 41 سال میں۔

تم نے سگیتا کے بارے میں جو لکھا ہے تو وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ سگیتا کی عمر میں میرا رد عمل بھی یہی ہوتا۔ یعنی میں گنگ ہو کر رہ جاتی لیکن جیسے تم نے سگیتا کو اس کی کمزوری کا احساس دلایا، مجھے دلائے تو باپنٹل پہنچ جاتے۔ میں سر پھاڑ دیتی تھمارا۔ لہذا سگیتا کے معاملے میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرو۔

اجتاہد کے سامنے کوئی عورت بات کر سکتی ہے۔ میں نے اس کے سامنے بڑے بڑوں کے ہونٹ ملتے دیکھے ہیں مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کیوں آئے تھے؟ سنو، اگر تم اسے لے کر کوئی قلم بھانا چاہتے ہو تو میرا مشورہ ہے کہ یہ خیال دل سے نکال دو۔ اجتاہد بہت بڑا اداکار تھا مگر اس کا دور ختم ہو چکا ہے۔ وقت کبھی الٹا نہیں چلتا روشن۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔

بے حد محبت کے ساتھ۔ تمہاری سونیا

8 مارچ 98ء

ذیر مس مودی

میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں تمہارے خط کا جواب نہ دوں۔ تم شاید سمجھتی نہیں ہو کہ مس سونیا جیسی بڑی ہستی کی سیکریٹری ہونا کتنی خوش قسمتی کی بات ہے۔ یا پھر یہ خوش قسمتی تمہارے دماغ پر چڑھ گئی ہے۔ سونیا جی کی سیکریٹری ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم لوگوں کے ساتھ بد تمیزی کرتی پھرو۔ تمہیں اپنا دماغ درست کر لینا چاہیے۔

اطمانا" عرض ہے کہ میں کسی بھی فنکار کے فین کلب کا ممبر نہیں ہوں۔ یہاں تک کہ آسمان کے ستارے جیسی سونیا جی کے فین کلب کا بھی نہیں۔ میں ایسا چھوٹا اور کھٹیا سوچ والا آدمی نہیں، جیسا تم نے مجھے سمجھا۔

پھر تم نے سونیا جی کی تصویر کو غیر اہم اور عام سی چیز قرار دینے کی کھستائی کیسے کی۔ اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ تم سونیا جی کی وفادار بھی نہیں ہو۔ سونیا جی تو ایسی

خوش نصیب ہیں کہ آپ کو ایسی شریک زندگی ملی۔
تم نے اپنا خط یہ کہتے ہوئے ختم کیا تھا کہ تمہیں سیما کو ملنا، اس سے معذرت کرنا ہے۔ میں یہ خط اس لیے ختم کر رہا ہوں کہ مجھے اپنی اہل اور کم عمریوی کی ناز برداری کرنی ہے۔ اس کا دل بھلاتا ہے تاکہ جیون خوش گوار رہے۔
تم فضول باتیں سوچنا چھو دو۔ تمہارے پاس ہر وہ چیز موجود ہے جس کی کوئی عورت تمنا کر سکتی ہے۔ بشمول میری محبت کے۔
تمہارا اور صرف تمہارا۔ روشن

5 مارچ 98ء

ساتر انجان صاحب

سونیا جی کو آپ کے گھر میں ہونے والی آتش زلی کا بہت رنج ہوا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ صرف ان کی تصویر جلی۔ باقی سب معمولی چیزیں تھیں۔ تصویر کی ایسی کوئی بات نہیں۔ سونیا جی نے ایک اور تصویر پر ردحکلا کر دیئے ہیں وہ میں آپ کو اس خط کے ساتھ بھجوا رہی ہوں۔ سونیا جی کو اپنے پرستاروں کا بہت خیال رہتا ہے اور وہ انہیں اپنی تصویر جیسی معمولی چیز کے مقابلے میں بہت زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ آپ ان کے فین کلب کے ممبر ہیں اس لیے وہ سری تصویر کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔

خلوص کیش۔ سیما مودی

سیکریٹری برائے سونیا کمال

6 مارچ 98ء

میران روشن

تم نے مجھے بھلانے اور حوصلہ دینے کی بہت اچھی کوشش کی لیکن تم کبھی مجھ کا ایسا جھوٹے نہیں رہے۔ جب بھی جھوٹ بولتے تھے، صاف پکڑ لے جاتے تھے۔ آج بھی تمہارا وہی حال ہے۔ تمہارے خیال کو بہت اچھی افسانہ نگاری کا نمونہ بہر حال کہا جاسکتا ہے۔ میری جان، حقائق تو حقائق ہی ہوتے ہیں۔ کوئی چاہے بھی تو انہیں تبدیل

میں کہ انہیں اپنے ملازمین سے محبت سے لبریز خالص ترین وفاداری ملنی چاہیے اور
تھیں اپنی اوقات میں رہنا چاہیے۔ یاد رکھو، تم سونیا جی کی نوکر ہو ان کی نمائندہ
تھیں۔

نقطہ۔ سارا انجیل

10 مارچ 98ء

سارا انجیل صاحب!

بھئی تم تو مجھے کوئی افسانوی کردار لگتے ہو۔ حقیقت کی دنیا میں تو ایسے لوگ پائے
نہیں جاتے۔ اچھا سنو۔ اور بھی کئی اداکارائیں ہیں جو اپنے پرستاروں کو اپنی تصویریں
بھجوا دیتی ہیں۔ کیوں نہ کچھ عرصہ تم انہیں ٹرائی کرو۔ اس سے ہمیں یہ فائدہ ہو گا کہ
تم سے کم از کم وقتی طور پر پیچھا چھوٹ جائے۔ گف نفسیاتی مریضوں سے تعلق رکھ
آسمان نہیں ہوتا۔ مگر کیا کروں، مجھے تنخواہ اس بات کی بھی تو ملتی ہے۔ دیے مجھے اپنی
اوقات خوب معلوم ہے اور میں کبھی اس سے باہر ہوتی بھی نہیں۔ البتہ تھیں اپنی
اوقات کا خیال رکھنا چاہیے۔ سونیا جی کے پاس تم جیسے لاکھوں کے نہیں، کروڑوں کے
خلف آتے ہیں۔

خلوص کیش۔ سیما مود

13 مارچ 98ء

میری زندگی کی روشنی سونیا جی

میں وہ شخص ہوں جو آپ کو کبھی پریشان نہیں کرنا چاہے گا لیکن مجبوری ہے
میں آپ کی سیکریٹری کا توہین آمیز خط اس خط کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ یہ اس
لے کہ آپ اس کو سمجھ لیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ آپ کو کیا سمجھتی ہے
اور آپ کے معاملت کو جس طرح پھنڈل کرتی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ عورت اس
تک آپ کی سادہ کو خاصا نقصان پہنچا چکی ہو گی۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس معاملے کا بالکل علم نہیں ہو گا۔ بات اتنی سی ہے کہ

میں نے آپ کی تازہ ترین تصویر مانگی تھی۔ اور آپ کی تصویر میں اکثر منکواتا رہا ہوں
اور مجھے تصویریں ملتی بھی رہی ہیں مگر اس بار مجھے توہین اور تذلیل کا سامنا کرنا پڑا جبکہ
اس کا کوئی ظاہری سبب بھی موجود نہیں۔ یہ بات ہے حد تشویش ناک ہے۔

میری مائیں تو اپنی سیکریٹری کی ذرا اچھی طرح خبر لیں۔ اسے گوشلی کی ضرورت
ہے۔ وہ اتنا بھی نہیں جانتی کہ آپ جیسی پراسرار اور میرے جیسے سر پر دانے کا تعلق
لنا اہم ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے نزدیک آپ بھی محترم نہیں
ہیں۔ اس نے ایک ہی پل میں آپ کو عام اداکارائوں کے ساتھ گھڑا کر دیا۔ اس سے
پہلے وہ آپ کی تصویر کی توہین کر چکی تھی۔ اسے تو فخر ہونا چاہیے کہ وہ آپ کی
سیکریٹری ہے لیکن وہ یقیناً ناشر گزار عورت ہے۔

مجھے ایک بار پھر اظہار افسوس کرنا پڑ رہا ہے کہ میں نے آپ کو اس معاملے میں
لوٹ کیا مگر کیا کروں۔ بات اہم تھی اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ رنہ میں آپ کو کبھی اس
طرح ڈسٹرنب نہ کرنا۔ میں نے آپ کو خبردار کر دیا ہے آگے آپ جائیں۔

آپ کا دیوانہ۔۔۔ پروانہ۔ سارا انجیل

14 مارچ 98ء

دنیا منلو

آج میں تمہارے کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ تمہاری سیاہ
بیز کی سلاخی پھر اوڑھ گئی ہے۔ اس کا مطلب تو تم سمجھتی ہی ہو گی۔ تم پھر سے پہلے
گی ہو اور وجہ یہ ہے کہ آج کل کھانے پینے کے معاملے میں بہت غیر محتاط ہو گئی ہو۔
خاص طور پر زیادہ کھاری ہو۔ بہر حال اب احتیاط شروع۔ شام کی چائے کے ساتھ
نہیں کچھ نہیں ملے گا صرف وہ وقت کھانا کھاؤ اور وہ بھی اہلی ہوئی بڑیاں۔ باقی تمام
بڑیاں میں گھر لے جا رہی ہوں۔ میں قلم اشارت تو ہوں نہیں کہ وزن بڑھنے کی فکر
اوں۔ ڈٹ کر کھلاؤ گی۔

ارے ہاں میں نے تمہارے مشورے پر عمل کیا اور تمہارے اس دیوانے اس دیوانے
نے خط کا جواب نہیں دیا۔ مگر! خبر باقی باتیں میچ کر لوں گی۔

اور سنو رات کو اپنے سینڈل پارٹمنٹ کے دروازے پر نہ چھوڑ دیتا مجھے ڈر ہے' وہ کسی کو پہانج نہ بنا ڈالیں اور کہیں وہ بد نصیب میں ہی نہ ہوں۔

تمہاری نصف بہتر۔ سیما مووی

19 مارچ 98ء

سیما

کل صبح سویرے ہی آ جاتا اور اگر میرے سینڈلوں سے الجھ کر گرو تو احتیاط! آہستہ سے گرٹل میری نیند خراب نہ ہو اور تمہارے ہاتھ پاؤں بھی سلامت رہیں شاید تمہیں یاد ہو گا کہ کل میرے اسٹیج ڈرامے کی رسرسل شروع ہو رہی ہے۔ بڑا بارہ بجے حیف پر پختا ہے۔ تم میرا لباس منتخب کر دینا اور جیولری وغیرہ بھی پھر ساڑھے دو بجے مجھے چنگا دینا۔ برقیقت پر۔ چاہے مجھ پر پانی کی باٹی اڑا دینی پڑ جائے۔

اور تم نے فریج صاف کر دیا، بہت اچھا کیا مگر یہ بھول گئیں کہ کچن کے کینہ میں چاکلیٹ موجود ہے۔ ———

20 مارچ 98ء

بیاری سونیا جی

صرف یہ پوچھنے کے لیے خط لکھا رہا ہوں کہ آپ نے اپنی سیکریٹری کی خبر لی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نرم طبیعت کی اور محبت والی ہیں لیکن اپنے نوکروں کا زیادہ نرمی نقصان دہ بھی بن جاتی ہے۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ میں ایک آکا ویڈیو شاپ میں کام کرتا ہوں (عارضی طور پر۔ کیونکہ میرے ذہن میں اور منصوبہ ہیں) خیر تو ہمارے ہاں حال ہی میں ایک نئی لڑکی کو ملازم رکھا گیا ہے۔ آپ یقین کریں وہ بہت کوڑھ مغز لڑکی ہے۔ کام کی مصروفیت کے ساتھ مجھے مستقل اس کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ اسے کچھ بھی نہیں آتا۔ کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ کل اس نے ہمارے میجر کے بچے کے بعد دو گھنٹے کی چھٹی مانگی۔ آرائش

کے لیے اور وہ واپس آئی ڈھائی گھنٹے کے بعد۔ اس دوران میں میری جان پر بنی رہی۔ اپنا کام بھی کرنا تھا اور اس کا بھی اور جب میں نے اس سے شکایت کی تو وہ الٹا مجھ پر بگڑ گئی۔ مجھے بائیں سنا ڈالیں۔

اس سے اندازہ لگا لیں کہ خوشہند لوگوں کو انسانیت والا سلوک راس نہیں آتا۔ کم ظرف کو رعایت دیں گے تو وہ سر پر چڑھ کر بیٹھ جائے گا۔ میری مائیں، آپ پہلی فرصت میں اپنی اس سیکریٹری کو ذرا طبیعت سے جھاڑ دیں۔ اس میں آپ کی اپنی بہتری ہے۔

اب مجھے کچھ اندر کی بات بتائیں۔ میں نے ایک میگزین میں پڑھا ہے کہ ایک زمانے میں آپ کا ونود کمنہ کے ساتھ پکڑ چل رہا تھا۔ سچ بتائیں، یہ افواہ ہے یا حقیقت۔ آخر میں آپ کے بارے میں جاننے کا حق رکھتا ہوں۔

آپ کا بچاری۔ ساحر انجمان

20 مارچ 98ء

سونیا جی

تم پر کیا نہیں، کس مٹی کی بنی ہوئی ہو اور مجھے تھکان سمجھتی ہو۔ صبح کچن میں برتنوں کو دیکھ کر مجھے پتا چل گیا کہ تم نے کتنی بد پرہیزی کی ہے۔ اوجھر کچھ اور کپڑے تمہارے تنگ ہو گئے ہیں اور اس حد تک کہ سلاخیں اوجڑ رہی ہیں۔ خود پر نہ سہی، مجھ پر رحم کرو۔ تم نے اتنی علوتیں بگاڑ دی ہیں میری۔ اب تو مجھے کہیں ملازمت بھی نہیں ملے گی۔

سیکریٹری سیما مووی

25 مارچ 98ء

سارہ دیدی

میرا یہ رائٹنگ پیڈ کیسا لگا؟ یہ سونیا نے جھپوایا ہے۔ قیمت بھی پتا ہے؟ ڈیڑھ روپے کا ایک کھڑ پڑا ہے۔ سچ کہہ رہی ہوں دیدی، خلاق نہیں۔ مل میں نے خود دیکھا ہے۔ اپنی آنکھوں سے۔

بچوں کی تصویریں بیچنا کا شہر ہے۔ دولہا بھائی آج کل بہت اچھے ہو رہے ہیں لیکن آنکھوں سے کچھ اور پتا چل رہا ہے۔ ان سے کہو کہ چنانچہ کر دیں ورنہ میں ان کی والدہ کو خط لکھ دوں گی۔ پھر وہ ان کی خوب خبر لیں گی۔

ایک عجیب چیز دیکھو۔ پاگل پن۔ سونیا کے ایک پروانے کا میں نے پچھلے خط میں تذکرہ کیا تھا اب اس کا ایک خط ہمیں بھجوا رہی ہوں۔ اس میں اس نے اپنے حسن کی تعریف کی ہے۔ سونیا کہہ رہی تھی کہ اب شاید ہمیں اس کی تصویر منگوانی پڑے گی۔ آٹو گراف کے ساتھ۔ دنیا میں پاؤلوں کی کمی نہیں ہے۔ بے ناد دیدی۔

بچوں کو پیار۔ سیم

25 مارچ 98ء

سونیا جان

شوٹنگ سے چند لمحوں کی فرصت ملی ہے تو تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ یہی سب خیریت ہے۔ گھینٹا کو گھر بھجوا دیا تھا وہ وہاں کوئنگ کی کلاسز لے رہی ہے۔ میں ان دنوں ایک بہت اچھے اسکرپٹ پر کام کر رہا ہوں لیکن میرا پروڈیو سر خوش نہیں ہے اس کے خیال میں یہ آرٹ فلم کا آئیڈیا ہے جبکہ میں کہتا ہوں کہ اسکرپٹ آرٹ فلم کا ہو اور ٹیسٹ منٹ میں کرکٹ شازم کا خیال رکھا جائے تو ایسی فلم بن سکتی ہے جسے عوام و خواص اور تاتدین یکساں طور پر سراہیں مگر پھر سوچتا ہوں، شاید میرا ہی دلغ چل گیا ہے۔

اور سونیا جو تمہارا ایجنٹ ڈرامہ ہے، میں اس پر فلم بنانے کے حقوق خرید رہا ہوں۔ یوں ہمیں ایک بار پھر ساتھ کام کرنے اور وقت گزارنے کا موقع ملے گا مجھے تم بہت

21 مارچ 98ء

سیمائی

کھانے کے لیے نہیں جیتی، جینے کیلئے کھاتی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں درزی سلائی ہی ہلکی کرتے گئے ہیں۔ اپنی ملازمت کی فکر مت کرو۔ تمہارے بغیر تو میں رہ ہی نہیں سکتی۔ تمہیں کبھی کہیں جانے نہیں دوں گی اور لباس کی سلائی کی بھی پروا مت کرو۔ اصرار مکنی تو کیا ہوا، نئے کپڑے سلوا لیں گے۔ بس مجھے یہ فکر ہے کہ میرے کپڑے تمہارے نہیں آ سکتے۔ تم پہنے کی کوشش کرو گی تو سلائی رہ جائے گی، کپڑے پھٹ جائیں گے۔ ویسے ایک بات بتاؤ تم خود کو ریکھا تو نہیں سمجھتیں۔ ذرا آئینہ دیکھ لیتا (اپنے گھر میں کلوز اپ دکھانے والا نہیں۔ میرے ہاتھ روم میں فل شاٹ دکھانے والا نقد آدم آئینہ) اوکے؟

سونیا

21 مارچ 98ء

شعب محبت سونیا جی

کلام پر جانے سے پہلے یہ چند سطریں سمجھت رہا ہوں۔ فی الوقت تو صورتحال یہ ہے کہ زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ دکان والی لڑکی دیل جان بن گئی ہے۔ کل اس نے مینجر سے شکایت کی کہ وہ اوپر چڑھ کر کچھ کیٹ اتار رہی تھی اور میں نیچے سے اس کے اسکرٹ کے اندر جھانک رہا تھا۔ آپ یقین کریں، میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ سچ نہیں بلکہ شاید وہ خود یہ چاہتی تھی کہ میں اسے اس طرح دیکھوں۔ مجھ سے بایں ہو کر اس نے شکایت کر ڈالی۔

میں جانتا ہوں کہ میں اس لڑکی کو اچھا لگتا ہوں۔ میں اپنے منہ میں مضمون نہیں بناتا لیکن ہر شخص کا کہنا ہے کہ میں غیر معمولی طور پر پرفکشن اور خوش شکل ہوں۔ رنگ گھورا، آنکھیں سبزی مائل براؤن اور کسرتی جسم۔ جبکہ وہ لڑکی بس لڑکی ہے۔ یہ تو طے ہے کہ وہ کسی بھی طرح مجھے بھانپ نہیں سکے گی۔

اب میں چلتا ہوں اور یہ وعدہ ہے کہ کل آپ کو خط ضرور لکھوں گا۔
محبت کے ساتھ، آپ کا پروانہ۔ سارا اچھا

یاد آتی ہو۔ تم جوان ہو، تم بے حد حسین ہو، تم بے حد پرکشش ہو۔ میں اسحق ہوں کہ تمہیں پا کر کھو دیا۔

محبت — محبت — روشن

26 مارچ 98ء

جان سے پیاری سونبائی

میں معذرت خواہ ہوں کہ اتنے دن خط لکھنے کا موقع نہ نکل سکا مگر کیا کروں، گزشتہ چند روز بہت پریشانی میں گزارے۔

بالآخر دکان میں اس نئی لڑکی سے جھڑپ ہو ہی گئی۔ اس روز میں نے ایک گاہک کے لیے اس سے ایک اہم نکل کر لانے کو کہل بس غضب ہو گیا وہ بولی کہ جلو خود ہی نکل کر لے آؤ۔ حوصلہ تو دیکھیں اس کا۔ میں فوراً مینجر کے پاس گیا اور تمام صورتحال اس کے سامنے رکھ دی۔ اب میں کیا بتاؤں کہ اس لمحے مجھے کیسا شاک لگا رہا ہے مینجر نے اٹھا مجھے ڈانٹا کہنے لگا کہ میں اس بے چاری کا پیچھا چھوڑ دوں۔ میں تو حیران رہ گیا۔ میں اس دکان پر چھ ماہ سے کام کر رہا ہوں جبکہ یہ لڑکی بالکل نئی ہے پھر بھی مینجر نے اس کی طرف داری کی ہے۔

سونبائی، میں تمہارا لگنے اور افسانے بنانے کا قائل نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ مینجر اور اس لڑکی کے درمیان ضرور ایسے دیسے تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں تا میری بات! اس کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ مجھ پر اس لڑکی کو فوقیت دے۔

اس لڑکی کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ آپ کتنی اچھی اور کتنی بلند ہیں۔ آپ میں گھٹیا پن نام کو نہیں۔ آپ تو اشار ہیں۔ ستارہ۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ مسائل آپ کے ساتھ بھی ہوں گے۔ اس پر مجھے آپ کی سیکرٹری کا خیال آ گیا۔ آپ نے اسے ڈانٹا ہو گا کہ خط لکھنے والوں کے ساتھ صحیح برتاؤ رکھنا ہو گا۔ اخلاق سے کام لینا ہو گا۔ بدتمیزی سے پرہیز کرنا ہو گا۔ یہ باتیں، یہ سب سن کر وہ کیا ہوئی؟ مجھے یقین ہے اس نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا ہو گا مگر میری بات یاد رکھیں۔ یہ نچلے درجے کے

لوگ ہر الزام کسی اور پر ڈال دینے کے عادی ہوتے ہیں۔

اب آپ سے انتہا ہے کہ میرے لیے بھی وہ منف نکل ہی لیں۔ چاہے دو سطریں لکھیں مگر مجھے خط ضرور لکھیں۔ اور میں آپ کے اور وفود کتنے کے چکر کے بارے میں جاننے کے لیے مارا جا رہا ہوں۔ پلیز، آپ مجھے بتادیں۔ سونبائی، میں وہ آدمی ہوں کہ آپ کے احمق کو کبھی نہیں پہنچاؤں گا۔ پہنچا بھی کیسے سکتا ہوں۔ آپ سے محبت جو کرتا ہوں۔

بیش کے لیے آپ کا جاں نثار۔ ساحر انجیل

29 مارچ 98ء

روشن ڈارنگ

تم نے ایک کمرشل فلم کی بہت اچھی تعریف کی ہے۔ آرٹ اور کمرشلزم کو یکجا کرنے ہی میں کھلمبائی ہے۔ وہ فلم کیا ہو گی جسے عوام و خواص باکس آفس پر کھلیا کرائیں اور ناقدین فن بھی اس کے قصیدے پڑھیں۔ بلاشبہ تم ہمیشہ ہو۔ اپنے بارے میں کبھی ایسی ویسی بات کیا کرو۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے اور سنو کھانے سے پہلے دودھ پینے کا معمول پر قرار ہے نا۔ نہیں تو اسے پھر شروع کر دو۔ تمہارے السر کے خیال سے کہہ رہی ہوں۔

خیر، تمہارے متعلق بہت باتیں ہو گئیں۔ اب میرا پرنسپل موضوع شروع۔ یعنی میں! میرا دن حال ہے۔ کبھی تو ڈپریشن جانتے لگتا ہے مجھے۔ ڈراما ”دیوار کیا گری۔“ کی ریسرل شروع ہو چکی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اسے فلمانے کے حقوق خرید رہے ہو۔ اس کی کمانی بڑی پاور فل ہے۔ میرا رول بھی بہت جاندار ہے۔ پھر تم جیسا انکسپر ہو تو ایوارڈ تو ملنا ہی ہے۔ مجھے بھی اس بات کی خوشی ہو گی کہ ہمیں ایک بار پھر ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ تم سے ملنے، تم سے بات کرنے کو ترس کر رہ گئی میں تو۔ بہت ہی چاہتا ہے تم سے ملنے کا۔

اے ہاں، ڈرامے میں مجھے پروں کا لباس پہن کر رقص کرتے ہوئے انٹری دینی ہے۔ اس پر مجھے پھر اپنی عمر کا خیال ستانے لگا ہے۔ کیا یہ مناسب ہو گا کہ کوئی بڑھیا

یہ الگ بات کہ وہ لڑکی اپنے پرستار کے خط کا جواب نہیں دیتی (نفاق کر رہا ہوں۔ مائٹ نہ کیجئے گا) لیکن مرحلہ میں آپ کے خط کا شکر ہوں۔ میرے لئے بھی چند لمبے نکل لیں۔

وہ جو آپ سے دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

ساز انجیل



31 مارچ 98ء
سونیا جان

اب بھی جواب سے محروم ہوں!

دکان پر حالات غیر تسلی بخش ہیں۔ کاش آپ جانتیں کہ آپ کے لکھے ہوئے دو لفظ میرے لئے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ کاش—

محبت ہی محبت۔ ساز انجیل



4 اپریل 98ء
ساز صاحب

مجھے افسوس ہے لیکن سونیا جی اتنی معصوم ہیں کہ ذاتی طور پر خط لکھنے کا وقت نہیں نکال سکتیں۔ مائٹ نہ کیجئے گا۔

خیر اندیش۔ سیما مودی



7 اپریل 98ء
سونیا جان

یہ پھر آپ کی سیکریٹری درمیان میں آگئی۔ میرا خیال ہے، آپ کی ڈانٹ ڈپٹ کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا یا پھر اس کی جھڑپ ہو کر آپ اپنی فطری نرم دلی سے کام لے گئی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ اسے نوکری سے نکالنے کی دھمکی زیادہ کارگر ثابت ہوگی۔ ایسا کر دیکھیں۔

پردوں میں لپٹی ہوئی لڑکی طرح گھومتی ہوئی اسٹیج پر آئے اور دیر تک گھومتی چلتی رہے۔ جیسے چالی ختم ہونے کا انتظار کر رہی ہے۔ (وہ بھی مرنی کی طرح) تمہاری کیا رائے ہے؟

مجھے خوشی ہے کہ تم سکیٹا کے ساتھ کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہو۔ سکیٹا کو کنگ سیکر رہی ہے تو صرف تمہارے لیے۔ بس تم خود کو اور اپنے مزاج کی حاکمیت کو قابو میں رکھو۔ تم جانتے ہو کہ تم میں کی ایک کمزوری ہے۔

تمہاری اپنی سونیا



29 مارچ 98ء
سونیا جان

کبھی ہیں آپ کہ خط لکھنا ہی نہیں آتا آپ کو— شاید خط لکھنے کی چور ہیں۔ ارے۔ برا نہ مانیں۔ میں تو ذوق کر رہا تھا۔ درحقیقت آپ دنیا کی سب سے اچھی! سب سے پیاری اور سب سے حسین لڑکی ہیں لیکن آپ سوچیں تو کب سے میں آپ کے اور دونوں کے بارے میں پوچھے جا رہا ہوں مگر کوئی جواب ہی نہیں ملتا۔ دیے بھی اپنی پریٹلنی کے وقت میں مجھے آپ کی اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ کم از کم خط تو لکھ سکتی ہیں۔

دکان پر حالات بہت خراب ہیں۔ اس لڑکی نے زندگی اجیرن کر دی ہے۔ وہ ہر لمحہ مجھ پر چڑھ کر رہتی ہے۔ الزامات اس کے علاوہ ہیں۔ میرے پیٹے پیچھے تو وہ لوہا زیادہ برائی کرتی ہے میری۔ میجر کو پوری طرح میرے خلاف کر دیا ہے اس نے۔ میں بس اتنا کہتا ہوں اس سے کہ سوچ سمجھ کر بولو۔ آؤی جو ہوتا ہے، وہ کان ہے۔ جو آؤی اپنے سے بڑی تہذیب لکھتا ہے، اسے عزت کبھی نہیں ملتی۔

خیر، مجھے چھوڑیں۔ آپ کے ڈرامے کی سیرس شروع ہو چکی ہے۔ اسٹیج ڈرامے کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ آپ کو اسکرین پر دیکھنے میں وہ لطف کمال جو اسٹیج پر جیتا جاتا دیکھنے میں آئے گا اور اس ڈرامے کی کامیابی میں کوئی شک نہیں کیونکہ اس میں دنیا کی سب سے خوبصورت اور سب سے مقبول لڑکی لاکاری کے جوہر دکھائے گی۔

یہ عورت آپ کے فین کلب کو اور آپ کے عالم پرستاروں کو ذہن میں رکھ کر مجھ سے بات کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں آپ کا سب سے بڑا پرستار ہوں لیکن میں آپ کا سب سے بڑا چاہنے والا بھی ہوں۔ اب تو میں آپ کا دوست بھی ہوں۔ ایسا دوست جسے آپ ہر مشکل میں مدد کے لئے پکار سکتی ہیں۔ جب بھی آپ کا ضرورت پڑے گی، میں آپ کے لئے حاضر ہوں گا۔

میں بچ کہہ رہا ہوں سونا جی۔ میں آپ کا سب سے قریبی دوست، آپ کا راز دار، ثابت ہو سکتا ہوں اور اگر آپ چاہیں تو میں آپ کا محبوب بھی بن سکتا ہوں۔ یہ بات کہنے میں، میں نے بہت دیر لگائی مگر یہ سچ ہے۔ آپ یقین کریں، میں آپ کو بہرہ خوش رکھ سکتا ہوں۔ جوان ہوں، خوبصورت ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کو دل چاہے چاہتا ہوں۔ مجھ سے آپ کو جسنی ہی نہیں وہی خوشی بھی مل سکتی ہے آپ اس عورت کو، اپنی سیکریٹری کو سمجھائیں کہ میرے ساتھ توہین آمیز رویہ رکھے۔ کون جالے، آنے والے دنوں میں وہ میری بھی ملازمہ ہو۔

اس محبت کے ساتھ جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔
آپ کا عاشق۔ سائر انجیل

10 اپریل 98ء

سائر انجیل

بہن بہت ہو گئی۔ میں نے تمہارے خط سونا جی کو نہیں دکھائے اب تک لیکن اب تم حد سے گزرتے جا رہے ہو۔ جس قسم کی پیشکشیں تم کر رہے ہو وہ محکمہ ڈاک کو پسند نہیں آئیں گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم ایسے خط لکھنے سے۔۔۔ بلکہ کسی بھی طرح کے خط لکھنے سے باز رہو۔ تم اپنی جوانی اور خوب روئی کو جہاں جی چاہے لٹو، ہمیں کوئی پروا نہیں۔

سیا سودگی

12 اپریل 98ء

میری جان سونا

اب مجھ میں آیا کہ مجھے جواب کیوں نہیں مل رہا تھا۔ تمہاری حامد سیکریٹری نے اعتراض کر لیا کہ وہ میرے خط تم تک پہنچنے ہی نہیں دیتی ہے اور میں سمجھ گیا کہ وہ کیوں جلتی ہے۔ وہ خود مردوں کی قرت سے محروم ہے۔ اسے افسوس ہوتا ہے کہ مجھ جیسا جوان اور خوبصورت عاشق اسے کیوں نہیں ملا۔

سونا، یہ طے ہو گیا کہ یہ عورت آپ کے قریب رہنے کے لائق نہیں۔ یہ کسی ایسے شخص کو آپ کے قریب نہیں پہنچنے دے گی جس سے اس کی پوزیشن کو خطرہ لاحق ہو لیکن کیوں؟ میری مائیں تو اپنی جیوری چیک کر لیں۔ میرا خیال ہے، بیک جا کر بھی چیک کر لیں۔ یہ عورت ضرور بے ایمانی کرتی رہی ہے اور ہرگز قتل اعتبار نہیں ہے۔ میری جان، میں آپ کیلئے پریشان ہوں۔ ایک ایسی عورت ہر وقت آپ کے ساتھ رہتی ہے، آپ کے معاملات میں دخیل ہے، یہ تصور ہی میرے روکنے کڑے کر دیتا ہے۔ مجھے آپ کے تحفظ کی فکر ہے۔ اس سلسلے میں مجھے اور آپ کو مل کر کچھ سوچنا اور فیصلہ کرنا ہو گا۔

ممکن ہے، آپ اسے ٹکالنے سے خوفزدہ ہوں۔ آپ کو اس کی طرف سے انتقامی کارروائی کا ڈر ہو۔ اگر میں آپ کے ساتھ ہوتا تو یقیناً آپ کو بڑی ڈھارس ہوتی۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی آپ کو کسی بھی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

میں یہ خط گھر کے پتے پر نہیں بھیج رہا ہوں۔ ورنہ یہ اس عورت کو مل جاتا۔ میں اسے آر کے اسٹوڈیو کی معرفت بھجوا رہا ہوں۔ اب میں اپنا پتا بھی نہیں لکھوں گا۔ میرا پتا تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ وہی جس پر آپ نے اپنی تصویر مجھے بھجوائی تھی۔ سونا، ہمیں مل بیٹھ کر بات کرنی چاہئے۔ ہر مسئلے کا حل ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ محبت تو فاتح عالم ہے۔

نظہ۔ سائر انجیل

12 اپریل 98ء

سونیا

تمہاری انٹری کے بارے میں بہت لوگوں کی رائے لی۔ سب مجھ سے متفق ہیں۔ تم پر ہوں والا لباس بھی بچے کا اور رقص بھی۔ تم اپنی عمر کا دھیان چھوڑ دو۔ یہاں تو پچاس سالہ ریکسا بھی ابھی تک ہیروئن آ رہی ہے۔ تمہاری ابھی ایسی عمر نہیں ہے اور دیکھنے میں تم تیس کی بھی نہیں لگتی۔

امید ہے، میری بات سے تمہیں سہارا ملے گا اور تم فضول سوچیں ذہن سے جھٹک دو گی۔

محبتوں کے ساتھ۔ تمہارا روشن

12 اپریل 98ء

بیادی سونیا

رات جلد پ کے ہاں پارٹی میں تمہارا تذکرہ چھڑ گیا۔ سب تمہیں یاد کر رہے تھے کہ کاش تم ہوتیں اور چلتے بٹلتے بے حال کر دیتی۔ کابل نے پھر بل کٹا دینے ہیں۔ جوزف کے بل سفید ہو رہے ہیں اور وہ بہت بلو قار لگنے لگا ہے۔ اجیت میرے ساتھ چھپر چھاڑ کر رہا۔

نیلیم تمہارے ڈرائے پر بڑے خراب تبصرے کر رہی تھی لیکن میں جانتی ہوں کہ تم بے جان کردار میں بھی جان ڈال دیتی ہو۔ بس وہ تمام ترکیبیں اور کر یاد رکھنا جو تم نے مجھے دیکھ کر سیکھے ہیں پھر کون تمہیں برا کہتا ہے۔

مجھے ایک شو میں بلایا گیا ہے مگر میں ہچکچا رہی ہوں۔ گانا اور چلتا اب میرے بس کا نہیں۔ کلائیڈی میں نے کبھی نہیں کی۔ میں کیا کروں گی شریک ہو کہ۔ میری موجودہ صورت کو دیکھ کر کون یاد کر سکے گا کہ میں وہ نیو چوہدری ہوں جو دلوں پر راج کیا کرتی تھی۔

خیر! سچ ڈراما مبارک ہو۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔ فرمت ملے تو چھوٹا سا ایک خط مجھے لکھ دیتا۔

تمہاری۔ نیو چوہدری

14 اپریل 98ء

لہتی

آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ شو میں ضرور شرکت کریں۔ لوگ آج بھی آپ کو ہار کرتے ہیں۔ آپ کو کیمرے کا سامنا کرنا آتا ہے۔ آپ اب بھی دیکھنے والوں کو دیوانہ بنا سکتی ہیں۔ کتنا ہی وقت گزر گیا ہو، وہ لواہیں تو آپ کے پاس اب بھی ہیں جو دل لٹ لیا کرتی تھیں۔

اور ہاں، یہ ترکیبیں اور گر دالی بات کیا لکھ دی آپ نے۔ آپ جانتی ہیں کہ میں کبھی کسی سے متاثر نہیں ہوئی۔ اور شاید آپ بھول گئیں کہ ”دیوانہ دل“ میں میں نے آپ کی کتنی مدد کی تھی۔ حالانکہ آپ اس وقت تک دل برداشتہ ہو چکی تھیں مگر پھر جانی ہوئی ترکیبوں نے قلم کو بھی ہٹ کر لیا تھا اور آپ کو ایوارڈ بھی دلایا تھا۔

آپ کے دنیا میں شکرگزاری رہی ہی نہیں۔

میں آپ کے شو کا بے چینی سے انتظار کروں گی اور ضرور دیکھوں گی۔ آپ کی۔ سونیا کرن

14 اپریل 98ء

مہری جان سونیا

حالات میرے اندازے سے کہیں زیادہ خراب ہیں۔ میں نے خط پوسٹ نہیں کیا۔ خدا نے لے کر اسٹوڈیو بھی نہیں، صحیفہ چلا گیا جہاں دیوار کیا گری۔ کی ریسرسل ہ رہی ہے۔ میں اسٹیج سے اندر کی طرف گیا تو مجھے جسم میں سنسنی دوڑانے والی وہ آواز سنائی دی جس سے مجھے محبت ہے۔ آپ کی آواز۔ خوشی سے میرا برا حال تھا۔ میں آپ کے اتنا قریب تھا۔ وہ ہمارے ملن ک۔ بلکہ خفیہ ملاقاتوں کا نکتہ آغاز تھا۔ میرا دل خوشی سے تاج رہا تھا۔

مگر پھر کیا ہوا وہ منہوں عورت جو سخت گیر بھی لگتی ہے، میرے پاس سے گزر کر اہل شخص کی طرف بڑھی۔ اس شخص نے اسے سیما کہہ کر پکارا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی اور سونیا جی، پتا ہے کیا ہوا؟ اس نے ہودہ شخص نے آپ کے نام آنے

اور دلکش نوجوان، حسین مگر ذرا زیادہ عمر کی اواکارہ کو جن نظروں سے دیکھ رہا ہے انہیں دیکھ کر پتھر بھی پھل جاتے۔ نوجوان کے انداز میں دلچسپی ہے۔ کیرا فوراً ہی کٹ کرتا ہے اور اواکارہ کو سڑک پار کر کے چھپر کی طرف جاتے دکھاتا ہے۔ گزرتے وقت کو دکھانے کیلئے کچھ شاخیں فیڈ ان اور فیڈ آؤٹ ہوتے ہیں پھر اسی کافی شاپ میں فیڈ ان ہوتا ہے۔ اواکارہ اگلے روز بھی ریسرسل کے دوران میں دہلی آئی ہے۔ آج اس کی عمر فیڈاکم لگ رہی ہے۔ نوجوان بھی موجود ہے مگر اواکارہ کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ — منصف، ہڈا بیکار اور اسٹیج ڈیزائنر۔

نوجوان اواکارہ کو دیکھ کر مسکراتا اور ہاتھ لراتا ہے۔

”تم بھی آ جاؤ۔ ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔“ میں کہتی ہوں۔

”جی نہیں“ میں آپ کو شیئر نہیں کر سکتا۔“ نوجوان کے لیے مجھ میں بے پائی ہے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے معذرت کر لی اور نوجوان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

اب اگلا دن۔۔۔ اگلا سیشن۔۔۔ ہم بیٹھے کافی پنی رہے ہیں۔ میں نے اس کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ ڈانس ڈائریکٹر مجھے کتنا پریشان کرتا ہے۔ مصروفیت کتنی زیادہ ہے۔ زندگی کوئی ذاتی چیز نہیں رہی، قومیتی ہوئی صنعت کی طرح ہو گئی ہے۔ کاسیائی کے نام پر میں کتنی ناکام ہوں۔ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی۔ میں اس سے فلم انڈسٹری کی شکایتیں کرتی ہوں۔ ان لوگوں کی شکایتیں کرتی ہوں جو ہر وقت شامی رہتے ہیں اور وہ نوجوان لگاؤ میں ہمدردی لئے، ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے محبت سے مجھے تکتا رہتا ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ وقت مجھ پر سے معکوس انداز میں گزر رہا ہے۔ میں جوان ہوتی جا رہی ہوں۔

یہ مجھے کیا ہو گیا ہے روشن۔ مجھے تو نوجوانوں میں بھی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس نوجوان میں کوئی بات ہے، جو میرے دل کو جھولتی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ (تم تو جانتے ہی ہو کہ میرے سامنے کسی کو بولنے کا موقع ہی کب ملتا ہے) وہ بس مسکراتا رہتا ہے۔ جیسے کوئی راز چھپائے بیٹھا ہو۔۔۔ کوئی بے حد حسین راز!

کبھی میں سوچتی ہوں کہ نوبت یہاں تک آگئی کہ میں اپنے سے آدھی عمر کے

والے تمام خط اس چیز کو دے دیے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا اس کی اہمیت۔ آپ خلاف سازش میں وہ سب چیزیں اکیلی نہیں۔ چھپر کا ایک آدمی بھی اس سے ملا ہوا۔ اور بھی بنائے کتے ہوں گے۔

میں چھپر سے نکل آیا۔ میں خط پوسٹ نہیں کر سکتا۔ ورنہ یہ لوگ سمجھ لے گے کہ ہم ان کی سازشوں کے متعلق جان گئے ہیں۔ کوئی جگہ بھی محفوظ نہیں۔

لیکن سوچا جی، میں خط لکھتا رہوں گا۔ ہماری محبت ہمارے درمیان ذہنی اور قلبی رابطہ پیدا کرے گی اور میرے خیالات آپ تک پہنچ جائیں گے۔ اس وقت تک میں خط لکھتا اور آپ کی امانت جان کر سنبھل کر رکھتا رہوں گا۔ پھر میں خط آپ کا پتہ چلانے کا کوئی طریقہ سوچ ہی لوں گا۔ بس آپ ان دشمنوں سے محتاط رہیں۔

میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ یقین رکھیں، اب میں آپ سے زیادہ دور رہ رہوں گا۔ ہر لمحہ آپ کے قریب ہی رہوں گا۔

بے حد محبت کے ساتھ۔ آپ کا عاشق

18 اپریل 98ء

روشن جان

خوش قسمتی سے آج فارغ ہوں۔ فرصت کا اس سے بہتر کیا فائدہ اٹھایا جائے ہے کہ ہمیں خط لکھوں، سو لکھ رہی ہوں۔ بات یہ بھی ہے کہ مجھے تمہارے مشورہ کی ضرورت ہے۔ مسئلہ اتنا ڈرامائی انداز کا ہے کہ تمہیں سمجھانے کے لئے مجھے اس اسکرین پر لکھنا پڑے گا تو سنو۔ ایک چالیس سالہ بے حد خوبصورت لیکن دل والے وقتوں میں ماند پڑتی ہوئی فلم انڈیا ایک اسٹیج ڈرامے میں کام کر رہی ہے۔ ریسرسل کیلئے تھیر جاتی ہے۔ وقفہ ہوتا ہے تو وہ چھپر کے دروازے پر آتی ہے۔ سلائی ایک کافی شاپ ہے۔ وہ سڑک پار کر کے وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اب کیرا پین کر کے بے حد خوبصورت لڑکے کو دکھاتا ہے۔ وہ اواکارہ کو بے حد حسین مسکراہٹ سے دیکھتا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں کہ اس میں تمہاری کتنی زیادہ مشابہت ہے۔

اب کیرا میڈیم شٹ میں ان دونوں کو ایک ہی میز پر بیٹھے دکھاتا ہے۔

کسی نوجوان کو ایک کٹنی شاپ میں دیکھوں۔ اور اس پر سرمٹوں مگر پھر عجیب سی بے پروائی مجھ پر چھا جاتی ہے۔ طویل عرصے سے میں بے کیف مشینی زندگی گزار رہی ہوں۔ اب— چند روز سے زندگی خوبصورت لگنے لگی ہے۔ امید جاگ اٹھی ہے کیا یہ غلط ہے روشن؟ کوئی برائی ہے اس میں؟ بس یہ خیال مجھے ستاتا رہتا ہے۔

سینما کے خیال میں یہ سب احتمالات ہے لیکن وہ ایک نارمل عورت ہے۔ نارمل رہتا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ اس کے شوہر کو ایک عام سی بیماری نے اس سے چین لیا مگر میرے شوہر کو شوہر بننے نے مجھ سے چھینا۔ (میرا اشارہ تمہارے کیہیز کی طرف نہیں ہے جان۔ اپنے کیہیز کا حوالہ دے رہی ہوں۔ جاتی ہوں کہ کتنی بڑی محنت تھی میں)

یہ تباہ روشن کہ کیا خوابوں کا یہ شہزادہ مجھے مل سکتا ہے۔ یہ بات بن سکتی ہے۔ تم بتا سکتے ہو کیونکہ سیکھتا بھی کم عمر لڑکی ہے۔ عمر میں تم سے آدمی بھی نہیں ہے اور تم اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار رہے ہو لیکن یہ بھی ہے کہ بڑی عمر کے مرد کا کم عمر لڑکیوں سے شادی کرنا فطری سمجھا جاتا ہے۔

خیر— میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ کل پھر ملوں گی۔ تم تباہ، ملوں یا نہیں۔ پلیز— پلیز۔ جواب ہاں میں دیتا کہہ دو کہ— جو کچھ تم کو گی، میرے نزدیک وہی مناسب ہے لیکن تھوڑی سی رقبت بھی بتا دیتا۔ مجھے خوش کرنے کے لئے۔ میری خاطر۔ پلیز۔

پگلی دیوانی! سونیا

18 اپریل 98ء

میری جان سونیا

میں نے کام شروع کر دیا ہے۔ جلد ہی سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ تمہیں پتا چل جائے گا کہ دشمنوں کے مقابلے میں تم تنہا نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ سونیا اور تمہیں تحفظ فراہم کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔
'کاش' میں جس میں تاسکا کہ میرے یہ محبت مبرے ہاتھ کتنی اہلیت رکھتے ہیں۔

ماضی میں میری محبتوں کو یہ کس کس طرح تحفظ فراہم کرتے رہے ہیں اور مستقبل میں تمہارے تحفظ کی خاطر یہ کس حد تک جاسکتے ہیں۔ میں ایسا شخص نہیں جس کے ساتھ جو کوئی چاہے زیادتی کر دے۔ ایک مثال سنا ہوں تمہیں۔

ایک بار ایک دکاندار نے مجھ پر چوری کا الزام لگایا اور سونیا میں چور نہیں ہوں جبکہ وہ خود چور تھا۔ وہ گھپیل، دو نمبریل ایک نمبر کی قیمت پر بیچتا تھا۔ خیر اس نے میرے والدین سے شکایت کی۔ میں نے بت انکار کیا مگر والدین نے میری ایک نہ سنی۔ وہ لوگ خوش قسمت ہوئے ہیں جنہیں محبت اور اعتبار کرنے والے ماں باپ ملیں۔ میں اس معاملے میں بہت بد قسمت ہوں۔ برہنہ پلٹا نے اس دکاندار کے دعوے کے مطابق اس کے نقصان کا ازالہ کر دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی لیکن میں نہیں بھولا۔

وہ ملاح بعد اس دکان میں ایسی آگ لگی کہ کچھ بھی نہیں بچا۔ سب جل کر خاک ہو گیا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم۔ سونیا کاش میں تمہیں یہ خط بھیج سکتا یہ مصیبت کے اس وقت میں تمہارا حوصلہ بوجھت۔ برہنہ میں نے یہ خطوط بہت احتیاط سے چھپا دیئے ہیں۔ ان کا ضائع ہونا تو دنیا سے ظلم اور ادب کیلئے ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔ یہ تو محبت کی ایک عظیم اور لازوال داستان کے امین ہیں۔

دکان پر صورتحال اور خراب ہے۔ کئی گاہکوں کے سامنے میری اس چھچھوری لڑکی سے زبردست جگ ہوئی۔ اس نے جو گالیاں کہیں وہ میں اس خط میں نہیں لکھ سکتا ہوں۔ چپے میں نے سنی ہیں اور برداشت کی ہیں، میرا ہی دل جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی کچھ کرنا ہو گا مگر تم میرے مسائل کی فکر نہ کرو۔ بس اس پر یقین رکھو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم محفوظ ہو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں تم سے کتنا قریب ہوں۔

تمہارا عاشق۔ ساحر انجنیر

○

محبت نے سونیا کو تو بڑا سارا دیا ہے۔ وہ اب بھی اس لڑکے سے ملتی ہے۔ کل میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی۔ حبیبر کے باہر بچ کتنی ہوں، بیس سال پہلے میں نے اسے دیکھا ہوتا تو خود بھی اس پر حرمی ہوتی۔ اچھا۔ اب مجھے گھر جانا ہے۔ لوکل گاڑی نہ نکل جائے پھر خط لکھوں گی۔ بچوں کو پیار۔

تمہاری۔ سیما

20 اپریل 98ء

میری جان سونیا

تم اس سے ضرور ملو۔ عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا جس کے ساتھ خوشی ملتی ہو، اس سے ضرور ملنا چاہیے۔ زندگی میں ایک بار تو وہ کرو جو تمہیں اچھا لگتا ہے ورنہ دہی کچھ کرتی رہو جو اچھا دکھتا ہو اور یہ تھوڑی سی رقیبت کا کیا مطلب ہے۔ میں تو بہت زیادہ رقیبت محسوس کر رہا ہوں۔ محبت تو کبھی ختم ہوتی ہی نہیں۔ اور پھر محبت ہی تمہاری مگر ہی محبت مجھے رقیبت کے بلجود بھڑی کو اولیت دینے پر مجبور کرتی ہے۔ خوش رہو۔ خوشیاں ملو۔

بیٹھ تمہارا۔ روشن

22 اپریل 98ء

میرے روشن

تمہارے خط کا شکریہ تم ایسے بے لوث آدمی ہو۔ تم نے مجھے بیشہ وہ کہہ دیا جس کی میں مستحق بھی نہیں تھی۔ اچھا! اب ہو جائے کام کی بات۔ اس کا نام اب ہے۔ وہ کتا ہے کہ اس کی عمر 29 سال ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بڑھا کر بتا رہا ہے۔ ہر رات حبیبر سے باہر میرا انتظار کرتا ہے۔ میں ریسرسل کے بعد نکلتی ہوں تو وہ مجھے گھر تک چھوڑنے جاتا ہے۔ روشن، میں بہت خوش ہوں مگر کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ میں الزہرا کا مظاہرہ کر رہی ہوں جو مجھے زہب نہیں دیتا۔ پھر بھی ایک بات

20 اپریل 98ء

بیٹے سائر

رات رندھیری نے تمہارے پلاٹ کو فون پر بتایا کہ دکان میں تمہارا روپیہ اور کارکردگی کتنی خراب ہے۔ دیکھو بیٹے، تمہارے پلاٹ نے رندھیری سے کہا تھا کہ اگر وہ تمہیں ملازمت دیں گے تو یہ احسان ہو گا ان کا۔ اور تم نے یقین دلایا تھا کہ اس بار تم کوئی گزیدہ نہیں کرو گے مگر رندھیری کی بات سے کچھ اور ہی پتا چلتا ہے۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ اب تمہاری طرف سے کوئی معمولی سی گزیدہ بھی ہوگی تو وہ تمہیں نوکری سے نکال دیں گے۔ تم نے اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکی کو جو کچھ کہا، اسے سن کر میں بھی شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ ایسی زبان ہمارے گھر میں تو بولی نہیں جاسکتی۔ تم یہ بات جاننے ہو۔

بیٹے سائر، تم مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے کیوں نہیں سوچتے۔ اب تم بچپن کے ہو چکے ہو۔ کیریئر بنو اور گھر بنو۔ یوں کب تک زندگی گزرے گی۔ کیا مجھے اور تمہارے پلاٹ کو تم سے باہری کے سوا کچھ نہیں ملے گا؟ پلیز میرے بیٹے، ایسا مت کرو ہمارے ساتھ۔ ہمیں تمہاری طرف سے دکھ اور پریشانی کے سوا کچھ نہیں ملا ہے۔ کبھی خوشی بھی دے دو۔

فقط تمہاری۔ ماما

20 اپریل 98ء

سارہ دیدی

آج کل دل بہت گھبرا رہا ہے۔ شاید تھائی کا احساس بہت شدید ہے۔ ان دنوں راجو زیادہ ہی یاد آ رہا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس کو گئے کیلئے برس ہو گئے۔ مجھے تو کل کی سی بات لگتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تھا وہ کہتا ہے، سب ٹھیک ہے لیکن کوئی گزیدہ ضرور ہے۔ شاید اعصابی کمزوری ہے۔ میرا تصور کچھ زیادہ ہی کام کر رہا ہے۔ کل رات مجھے ایسا لگا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ سوچتی ہوں، کاش ایسا ہی ہو۔ کوئی زبردستی ہی کر لے ورنہ میں نے تو خود کو راجو کی پیوہ کے سوا کبھی کچھ سمجھا ہی نہیں۔

کوں اگر یہ پاگل پن ہے تو بھی مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ شاید میں بہت تنہا ہو م
تھی۔ اور بہت بور۔ میری طرف جو بھی بڑھتا تھا مجھے اشارہ سمجھ کر بڑھتا تھا۔ یہ مجھ
اس لئے اچھی لگی کہ اسے کو اس کی پروا نہیں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ سبکیت
میرا پیار کنت

تمساری سوا

22 اپریل 98ء

ساحر

وہ دن پہلے میں نے تمہیں غلط لکھا کہ خود کو ٹھیک کر لو اور اپنی ذمے داریوں
پوری طرح احساس کرو لیکن تم پر اثر نہیں ہوا۔ دند جرجی نے ابھی فون کیا تھا کہ
رہے تھے کہ اب وہ تمہیں نکالنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا
کہوں۔ تم کتنا پریشان کرتے رہے ہو ہمیں۔ میں نے سوچا تھا اب شاید اس کا صلہ
اور ہم تم پر فخر کر سکیں مگر تم نے ہر امید خاک میں ملا دی۔ تمہارے پلا بہت غصہ آ
رہے ہیں اور میں مایوس ہوں۔ تمہارے پلا کہتے ہیں کہ اب وہ تمہاری مدد نہیں کرے
گے۔ اب بے روزگاری بھی تمہیں اپنے طور پر بھگتنی ہو گی۔ تمہیں اب سلیقہ آ جا
چاہئے کہ لوگوں کے درمیان کیسے رہا جاتا ہے۔

مگر میں سوچتی ہوں کہ تم ایک بار اس ماہر نفسیات سے مل لو، جس نے پہلی جا
تمہاری مدد کی تھی۔ یاد ہے نا؟ کاش کچھ ہو سکے۔

تمہاری۔ م

22 اپریل 98ء

ڈیئر سٹ سونیا

مبارک ہو، بہت مبارک ہو۔ میں ایک بار پھر آزاد ہوں۔ آڈیو وڈیو شاپ کے
میئنجر نے میری چھٹی کر دی۔ اس فلاحی کی وجہ سے۔ اچھا ہوا۔ اب میں اس کے
باتوں مزید ذلت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس کی تفصیل بھی سن لو۔ اس روز
میں لچ سے واپس آیا تو نے اہموں کا شیفٹ کھول کر ریک میں سبایا جا رہا تھا میں
جانتا تھا کہ وہ بدکردار لڑکی یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ چیزوں کو ان کے مقام پر رکھ
سکے۔ میں نے چپک کیا اور دیکھ لیا کہ کچھ اہم غلط جگہ پر رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے
میئنجر کی توجہ اس طرف دلائی۔ چپکے سے لیکن وہ منحوس لڑکی دبے پاؤں چلتی میرے
پیچھے آکھڑی ہوئی تھی اور سب کچھ سن رہی تھی۔ بس پھر کیا تھاؤں۔ اس کی زبان موڑ
لگی سلائی مشین کی طرح چلنے لگی۔ اس نے الزام لگایا کہ میں نے یہ حرکت کی ہے۔
یعنی اہم اور سب سے اوجھر کر دیے ہیں، صرف اسے نکالنے کے لئے اور میئنجر کو دیکھو اس
نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی۔ درجنوں گواہوں کے سامنے اس نے کہا کہ اس
کا بھی یہی خیال ہے۔ بس پھر کیا تھا میں تو غصے سے پاگل ہو گیا۔ میں نے فوری طور پر
اسے استعفیٰ تمنا دی۔ سونیا میں نے اس دکان کی خاطر اپنی انگلیاں تھکا ڈالیں اور اس کا
یہ صلہ ملا مجھے۔ خیر، بھاڑ میں جائیں۔ اب وہ دکان چلائیں گے تو پتہ چلے گا انہیں۔

میری جان، میں بھی کتنا خود غرض ہوں کہ اپنے دکڑے لئے بیشمار مجھے معاف کر
دینا لیکن تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تمہاری خاطر اب تک میں کتنا کچھ کر چکا ہوں۔
تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں تم سے کتنا قریب ہو چکا ہوں اور اب جلد ہی میں اپنے
منصوبے پر عمل کرنے والا ہوں۔ اب تو مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔

فکر مت کرو۔ جدائی کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں۔ عنقریب ہمارا ملن ہو گا۔
دو جوں کا بھی اور جسموں کا بھی۔ ہم خوب محبت کریں گے۔ جی بھر کے۔

تمہارا دلوانہ۔ ساحر انجن

25 اپریل 98ء
روشن

پچھلے دو دنوں کا حال کیا بتاؤں مگر ہر حال یہ خط ہمیشہ کی طرح شکایت نامہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے، میں تو اس پر ہنستی ہوں مگر لگتا ہے کہ یونہی جتنے جتنے پاگل خانے چلی جاؤں گی۔ بھی سمانے آئے کو سخت چنبد کیا ہے بلکہ وہ گھٹیا پن کرتی ہے اس بے چارے کے ساتھ۔ بڑے گمرے مگر کرتی ہے اس پر۔ سیما کو میرے ساتھ دس برس ہو گئے مگر اس کا یہ رخ پہلی بار میرے سامنے آیا ہے۔ یہ درست ہے کہ اسے بھی اسے پسند نہیں کرتا مگر ہر حال وہ لڑاوی تو ہے۔ سیما خواہ مخواہ اس پر چوٹیں کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ اس سے بد تمیزی کرتا ہے۔ میں وضاحت طلب کرتی ہوں تو یہ کہتی ہے اب بتاؤ، یہ بھی کوئی بات ہے لفظ تو پکڑے جاسکتے ہیں مگر لہجہ اچھے تو لگتا ہے کہ سیما احساس عروہی کا شکار ہو گئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میرے ہی میرے مسائل بڑھانے کی تو کیا انجام ہو گا۔ سیما کو نکلنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ اتنا کچھ جانتی ہے میرے بارے میں۔ مجھے سمجھتی ہے۔ کسی اور کے ساتھ میرا گزارہ ہو ہی نہیں سکتا یہ زندگی اتنی پیچیدہ کیوں ہوتی ہے روشن۔ محبت ملتی ہے تو صبح روپ، صبح مثل اور مناسب عمر کے ساتھ کیوں نہیں ملتی۔ اور ملاشیں کیوں ہوتی ہیں۔ میں اور تم ٹیلیفون کیوں ہوئے؟ سوری میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں روشن۔ اب تو تمہاری سنگیتا سے شادی ہو چکی ہے مگر نہ جانے کیوں، میں اب بھی تمہارے خواب دیکھتی ہوں۔ جیسے تم واپس آ گئے ہو۔ بستر پر لیٹے ہو۔ میں کراٹ بدلوں کی تو مجھے تمہارا چہرہ نظر آئے گا۔ ہمیشہ کی طرح اور پھر میں خود کو تھا محسوس کروں گی اور نہ ہی مجھے عمر کا احساس ہو گا۔

بس بہت ہو گئی اب کہیں رونے ہی نہ لگوں میں۔ کون سوچ سکتا ہے کہ کامیابی کی بلندیوں کو چھوئے والے پتھر پر تمارے روتے بھی ہیں مگر اندر کا حال کسی کو کیا معلوم۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن اس سے مجھے کیا فائدہ؟ تم اسے خوش رکھو مگر میرے بدلے تمہیں ملی ہے۔ ٹھیک ہے نا۔

تمہاری سولیا

27 اپریل 98ء

سارہ دیدی

تمہارا کھینچا ہوا سویٹر ملا بہت خوبصورت ہے۔ جتنا تمہیں خوب آتا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔

میں واقعت اور زندگی کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ میں نے تمہیں سونیا کے نئے دوست کے متعلق لکھا تھا نا وہ بہت باتوں اور چمچور ہے۔ کل میں سونیا کیلئے کافی بنا دی تھی کہ وہ کچن میں آ گیا اور لگا مشورہ دینے۔ کہنے لگا، اس میں براہی ملا دو۔ کبخت انگریزی بول کر کثرت سے پڑھتا ہے مگر تمیز ذرا نہیں۔ اب تو وہ صاحب کتب اور ڈاک میں بھی گھسنے لگا ہے۔ میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا تو ڈھٹائی سے کہنے لگا۔ یہ سب اتنا چپ ہے کہ میں باز رہی نہیں سکتا میں بہت پریشان ہوں دیدی۔ اوپر والا مجھے اس مقام پر بھی نہ پہنچائے جہاں میں سوچوں کہ بس مرد کی ضرورت ہے۔ خواہ کیسا ہی ہو۔ (سونیا کی طرح)

میرے خوف کا وہی حال ہے۔ گزشتہ رات عجیب ہی ہوئی۔ اسٹیشن سے گھر تک تمام راستے کوئی میرا پیچھا کرتا رہا۔ بہت کم لائن گئی ہوئی تھی۔ گھپ اندھیرے میں میں پیچھا کرنے والے کو دیکھ نہیں سکتی۔ تم نہیں، اس شر کا کیا بنے گا اگر یہ مکان راجو کی نشانی نہ ہوتا تو میں اسے بچ کر کسی گھوٹانے آبلہ علاقے میں جا رہتی لیکن کیا کروں، میں میری یادیں بس ہیں۔ اچھا دیدی، دولہا بھائی کا کیا حال ہے۔ بچوں کو پیار دینا۔ تمہاری بہن۔ سیما

27 اپریل 98ء

ذیر منظور

تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہاؤس جاب بھی کسی ڈھنگ کے اسپتال میں کی جائے مگر اپنے نصیب کو کیا کروں۔ یہی ڈراؤنا اسپتال ملنا تھا مجھے۔ خیر جیسے تیسرے وقت کزاروں گا اور میں سے چھٹکارا پاسے ہی تمہارے کلینک کا رخ کروں گا۔ اصل مل تو اپنی پرنکشن میں ہی ہے۔

30 اپریل 98ء

میری جان روشن

کمل ہو تم؟ مجھے تمہاری ضرورت ہے اور کسی کو بھی نہیں معلوم کہ تم کمل ہو۔ پلیز مجھ سے رابطہ کرو۔

میں ابھی تک سیما سے نہیں مل سکی ہوں۔ بہرحال تفصیل معلوم ہو گئی ہے۔ سیما پر چاقو سے حملہ کیا گیا تھا۔ بڑی بیداری سے اس پر وار کئے گئے مگر ڈاکٹر مجھے تسلی دے جا رہا ہے۔ اے آگیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے مجھے دلاسا دے۔ بہرحال اس کی موجودگی سے بھی ڈھارس تو بندھی ہے۔

رہنما کیلئے تو جانا پڑا لیکن آدمی اندر سے غمگین ہو تو کام میں دل کمل لگتا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ میں بڑی اشار ہوں۔ کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی مگر میں نے جان لیا ہے کہ اندر دکھ چھپا کر ظاہر میں ہنسنا کتنا دشوار فن ہے۔ رہنما کے بعد میں بھر اپتل گئی مگر میں اپنی سب سے اچھی دوست سے مل بھی نہیں سکی۔ اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکی۔ اب مجھے پتا چلا ہے کہ سیما میرے لئے کتنی اہم ہے۔ ایک دہی تو ہے جو پورے غلوں سے میری خدمت کے بارے میں پتا نہیں کس دہی نے اس بے چاری کا یہ شکر کیا ہے۔

مجھے احساس جرم بھی سنا رہا ہے۔ پچھلے دنوں اس کے ساتھ میرا سلوک اچھا نہیں رہا تھا مگر اب میں جانتی ہوں کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں روشن۔ فوراً فون کرو۔

سونیا

سونیا

میں اور شام تمہاری طرف سے فکر مند ہیں۔ پچھلی رات فون پر تم سے بات کرنے کے بعد میرے دل میں تمہاری باتیں کرتے رہے۔ تم ایسا کرو کہ چند روز کیلئے ہمارے ہاں آ جاؤ۔ مجھے ان حالات میں تمہارا وہاں تنہا رہنا اچھا نہیں لگتا۔ بس آ جاؤ۔ تمہاری۔ نیلم

ابھی یہاں ایک کس آیا۔ چاقو کا۔ میرا تو دل گھبرائے لگہ کسی شخص نے اسٹیشن کے باہر سنسان علاقے میں ایک عورت پر اپنے چاقو کی دھار کس طرح آزمائی تھی۔ چرو ایسے بگاڑ دیا کہ جڑے کی بڑی صاف دکائی دے رہی تھی۔ ایسے کس آتے ہیں یہاں۔ اچھا۔ اب میں دیکھنے کی نیند لے لوں۔ رات کی ڈیوٹی میں بھی چھین نہیں۔

تمہارا کلاس فیلو۔ ڈاکٹر ندیم

28 اپریل 98ء

روشن جان

تمہیں فون کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر بات نہ ہو سکی۔ بہت خوفناک بات ہوئی ہے۔ کسی نے سیما پر حملہ کیا اور فم کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سیما کا جیون تھا کہ وہ بچ گئی۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب وہ رات کو لوکل سے اترنے کے بعد اپنے گھر جا رہی تھی۔ وہاں راستے میں اندھیرا ہوتا ہے۔ کب سے میں سیما کے کمرہ رہی ہوں کہ مکھن چار دیویرے ساتھ رہ مگر سختی یہ نہیں تھی۔ اب وہ اسپتال میں ہے اور ابھی تک اسے ہوش نہیں آیا ہے۔ ڈاکٹر کچھ بتاتا بھی نہیں اور ملنے بھی نہیں دیتا۔ بس اتنا معلوم ہے مجھے کہ اسے نیند کی دوا دی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے یقین تو دلا ہے کہ سیما بالکل ٹھیک ہو جائے گی مگر مجھے اطمینان نہیں ہوا۔

کسی نے ایسا کیوں کیا؟ اور ملا کیا ہو گا اسے۔ دو ڈھائی سو روپے! روشن، پلیز تم مجھے فوراً فون کرو۔ اب سیما نہیں ہے تو میرا ہے کون۔ مجھے اے کا بھی پتا نہیں مل رہا ہے کہ وہ کمل ہے۔ رہنما کے بعد میں اس کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ آیا ہی نہیں۔ چلو اچھا ہی ہے۔ اس عالم میں تمہارے سوا میں کسی سے بات کر بھی نہیں سکتی۔ میں تمہاری گل کی شہرہ ہوں۔

تمہاری۔ سونیا

نلی گرام

سونیائی

آج شام ہم مجبئی پہنچ رہے ہیں۔ سیدھے اسپتال جائیں گے۔ آپ کی پیشکش کا شکریہ لیکن ہم سیمائے گھر میں ہی قیام کریں گے۔ آپ نے جو کچھ کیا، اس پر ہم بے حد شکر گزار ہیں۔ آپ ہمیشہ سکھی رہیں۔

سیمائی بہن۔ سارہ بیدی

30 اپریل 98ء

مینجر مینٹن ہوٹل

میں 29 مئی سے 31 مئی تک کے لئے آپ کے ہوٹل کا بہترین سوئٹ ریزرو کروانا چاہتا ہوں۔ اس میں تمام سہولتیں موجود ہونی چاہئیں۔ ایک ہزار روپے کا چیک بھجوا رہا ہوں۔ باقی رقم چیک آؤٹ کے وقت ادا کی جائے گی۔ ہر چیز کا خیال رکھیں۔ اس ویک اینڈ پر میری مہمان کوئی معمولی ہستی نہیں، انٹرنیشنل اسٹار سونیا کرن ہوں گی۔ خیال رہے کہ میں اور سونیا جہاں بھی جاتے ہیں، ہمیں بہترین سروس ملتی ہے۔

آپ کا مخلص۔ سائر انجیل

30 اپریل 98ء

پریم گھر گلڈور شاہ

میں 29 مئی کو اپنی ایک مہمان کے ساتھ ہوٹل مینٹن پہنچ رہا ہوں۔ سوئٹ ریزرو کرا لیا گیا ہے۔ ہم آدھی رات کے قریب وہاں پہنچیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وقت تک آپ ہمارے سوئٹ کو پھولوں سے اس طرح سجا دیں کہ یہ موقع یادگار بن جائے۔ یہ آپ کی خوش ذوقی اور ہنرمندی کا امتحان ہے۔ دو سو روپے کا چیک بطور ایڈوانس منسلک ہے۔

مخلص۔ سائر انجیل

30 اپریل 98ء

جلان آرزو، میری سونیا

اب تک جنہیں معلوم ہو گیا ہو گا اور میرے غلوں اور محبت پر جنہیں کوئی شبہ نہیں رہا ہو گا۔ تم نے دیکھا، میری محبت کی موج دھنوں کو خوش و غشاگ کی طرح بنا لے گئی۔ تم میری جان ہو، میری تنہائیوں کی ساتھی ہو، میرا تمہارا جسم اور روح کا انوٹ رشتہ ہے۔

سب کچھ بہت آسان قلم اخلاق پڑھانے والے لوگ دوسروں کو یقین دلانے ہیں کہ تشدد بہت بدصورت اور بے رحمانہ ہوتا ہے مگر حقیقت یہ نہیں۔ وہ تو بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ جیسے کلاسیکی رقص جیسے مرد اور عورت کی خوبصورت یکجائی۔ میں سب کچھ تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔

میں شام چار بجے تمہارے پتے پر پہنچا قلم بدصورت عمارت سر اٹھائے کھڑی تھی۔ گرد و پیش زرد و دھوپ میں ملبا ہوا بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں پارک میں بیچ پر بیٹھ گیا۔ میری جیب میں چاقو تھا اور نظریں بلڈنگ کے گیٹ پر تھیں۔ مجھے اطمینان تھا کہ میرا یہ چاقو تو میری محبت اور عشق کا ثبوت فراہم کرے گا۔

میں وہاں بیٹھا رہا۔ پھیری والے گزرتے رہے۔ کچھ بچے پارک میں کھیل رہے تھے۔ میں نے سوچا، کسی دن میرے بچے بھی یہاں کھیلیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ کیہیڑ کی موجودگی میں تم بچوں کی دیکھ بھل کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتیں مگر تم اس کی فکر نہ کرو انہیں اور گھر کو میں سنبھال لوں گی۔ بس مجھے ایک چھوٹی سی خوشی ضرور دے۔ دنپ میں تمہارا کیہیڑ خراب نہیں ہونے دوں گا۔ ہم محل مند انسان ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم عوام کی بھی ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں تو مجھ پر بہت بھاری ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ میں خود غرض نہیں ہوں۔ ہم کوئی عام لوگ نہیں کہ دوسرے کی پروا کئے بغیر زندگی گزار دیں۔ ہم بڑے لوگ ہیں۔

خیر پانچ بجے میں نے اس عورت کو تمہاری بلڈنگ میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بے شمار پیکٹ اٹھائے ہوئے تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ تمہارے پیسے سے اپنے لئے شاپنگ کرتی پھر رہی ہے۔ اس نے رک کر چوکیدار سے کچھ بات کی۔ وہ دونوں ایک

ہے۔

تمہارا جاں نثار عاشق
ساجرانجن



یکم مئی 98ء

روشن جان

تمہارا شکر یہ کہ آج بھی رات تک تم مجھ سے فون پر بات کرتے رہے۔ مجھے جب بھی ضرورت پڑی ہے، تم نے میرا ساتھ دیا ہے۔ سنو، سبکدوش کو برا تو نہیں لگا؟ وہ بدگمان تو نہیں ہوئی؟

آج میں سیمائے ملی۔ اف روشن کیا بتاؤں اس کا چہرہ انجوس سے ڈھکا ہے اور وہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہی ہے۔ میں نے اس کی پہلی جھلک دیکھی تو پھوٹ پھوٹ کر رو دی لیکن پھر میں اس کے پاس بیٹھی اور اسے مسکراتے دیکھا تو کچھ جان میں جان آئی۔ اور روشن اس نے مجھے روکتے دیکھا تو ایسی الکی گلیاں دیں مجھے کہ میں نے کبھی سنی بھی نہیں۔ مجھے بت اچھا لگ۔ دنیا میں نہ سیمایا کوئی ہے میرے لئے اور نہ ہو گا البتہ تمہاری بات اور ہے۔ تم تو مرد ہو نا۔ میں تم دونوں کے احسانات کا حق ادا نہیں کر سکتی۔



یکم مئی 98ء

میری دس بھری

رات میں نے خواب دیکھا۔ پتا ہے کس کا؟ تمہارا۔ اور میں نے تمہیں ساحل سمندر پر غسل کے لباس میں دیکھا۔ تم رست پر لپٹی ہوئی تھیں۔ تمہارا بدن شعلہ جوالہ لگ رہا تھا۔ اوه کھلے ہونٹ مجھے پکار رہے تھے۔ تمہاری خوشبو میری سانسوں کو چھو رہی تھی۔ میں لپکا۔ کچھ دیر کڑوا میں تمہیں دیکھتا رہا۔ پھر۔ پھر کچھ

دوسرے کی طرف جس سازشی انداز میں جھکے اور راز دارانہ انداز میں بات کی، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ چوکیدار بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے میں نے فیصلہ کیا کہ بعد میں موقع آنے پر چوکیدار کو بھی چپک کر دلوں گا۔

سات بجے کے ڈرا بعد تمہاری سیکرٹری باہر آئی۔ میں منہاں فاصلے سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ وہ لوکل ٹرین میں بیٹھی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ پورے سفر میں، میں نے اس پر نظر رکھی۔

وہ بڑا تکلیف دہ سفر تھا۔ حقیر بدوادر لوگ اپنے گھنٹیا کھوسوں سے فارغ ہونے کے بعد اپنی چوہے کے بلوں جیسی کھولیں کا رخ کر رہے تھے۔ اوپر والے کا کرم ہے سوینا اس نے تمہیں اس زندگی سے محفوظ رکھا اور عذریہ میں بھی اس انداز کی بدلو دار زندگی سے بچا چھڑا لوں گا۔ بس پھر میں ہوں گا اور تم ہو گی۔

خیر سفر ختم ہوا۔ تمہاری سیکرٹری اتری۔ اس کے پیچھے میں بھی اتر آیا۔ میرا ہاتھ جیب میں تھا اور اس میں موجود چاقو پر میری گرفت بست تھی۔ یقین کرو، ایک لمحے کو تو مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں اس کے پیچھے چتا رہا وہ میڑھیاں اتر کر دوسرے پلیٹ فارم پر پہنچی اور وہاں سے باہر نکل گئی۔ وہاں آگئی تھی۔

باہر تھائی بھی تھی اور اندھیرا بھی۔ میں نے دبے پاؤں فاصلہ کم کیا اور اسے پکارا۔ سید اس نے پلٹ کر دیکھا۔ میرا چاقو ہوا کو چیرنا ہوا پکا اور اس کے چہرے کو کلاتا ہوا نیچے آیا۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس کے چہرے پر کتنے وار کئے۔ مجھے تو وہ دھند میں لپٹا ہوا خواب سا لگ رہا تھا۔ ہاتھ کی حرکت کلاسیکی رقص جیسی تھی۔ خوبصورت۔ اور رقص کی کرامت کے عین مطابق۔ پھر میں احساس فتح سے شرابور ہو گیا۔

وہاں ایسی خاموشی چھا گئی۔ مقدس اور پرسکوت، جیسے مرد اور عورت کی یکجائی کے بعد ہوتی ہے اور مجھے سکون بھی دینا ہی ملا۔ جیسے تم اور میں جسمانی طور پر ملے ہوں۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں۔ یہ خط میں تمہارے گھر کے پتے پر پوسٹ کروں گا اور اگر تمہارا جواب نہیں ملا تو سمجھ لوں گا کہ چوکیدار کے بارے میں میرا اندازہ درست ہے۔ پھر اس کا بھی کچھ کروں گا۔ اب مجھے اجازت دو۔ ہر مصروفیت تمہارے ہی لئے

ہوا، وہ تم سمجھ سکتی ہو مگر میں اسے لفظوں میں بیان کر کے اس کی خوبصورتی کو بدصورتی میں تبدیل نہیں کر سکتا۔

میں اپنی لذت کا حال کیا لکھوں۔ ابھی تک اس کے سحر میں کھویا ہوا ہوں۔ تم نے بعد میں مجھے بتایا کہ تمہاری زندگی میں مجھ جیسا نہ بھی آیا ہے، نہ آئے گا۔ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ سچ ہے۔ تمہارے تحفظ کی خاطر جو کچھ میں نے کیا، وہ تو محض آغاز ہے کون کسے گا ایسا۔ یہ وہ محبت ہے جسے میں اور تم الگ الگ اس دنیا میں اجنبیوں۔ کسی اور سارے کی مخلوق کی طرح ہم ترستے رہیں مگر اب یہ محبت ہمیں مل گئی ہے۔ ہمیشہ کیلئے۔ اسے ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

تم فکر نہ کرو سونیا، میرا مسودہ تمہارے محافظ کے قہر کا پہلا شکار تھی، آخری نہیں۔ وہ تو تنبیہ تھی ان لوگوں کے لئے جو میرے اور میری محبوبہ کے سچ میں آنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تمہارے وصل کا خواہش
ساترا انجان

3 مئی 98ء
سونیا جان

دنیا میں اور کوئی ایسا نہیں جس سے میں گھنٹوں باتیں کروں اور نہ تھکوں۔ ایک تم ہی تو ہو۔ کاش موضوع گفتگو سیمانہ ہوتی۔ کاش ہم خوشگوار وقت گزارتے۔ سیمانہ میری طرف سے بہت بہت پوچھ لیتا اور ہاں، ہمارے احسانات کے بارے میں سوچ کر خود کو ہلانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس لئے کہ تم بھی ہم سے محبت کرتی ہو۔ محبت تو محبت ہی کے عوض ملتی ہے۔ اوکے؟

تمہارا روشن

3 مئی 98ء

میرے روشن

سیما جتنی تیزی سے سنبھل رہی ہے، اس پر مجھے یقین نہیں آتا کہ میں نے کبھی اسے اتنا سخت جان نہیں سمجھا تھا۔ ہر سال مجھے بہت خوش ہوئی۔ یہ تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں کہ میں نے سیمانہ کی بہن کو خط لکھ کر بلوایا تھا۔ وہ دہلی میں رہتی ہے اور سیمانہ بہت ملتی ہے۔ وہ ایسے 'لی' جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔ اسپتال جیسی خوفناک جگہ بھی ہم تینوں گھنٹوں خوش گپیاں کرتے ہیں۔ ہنسنے بولنے ہیں۔

روشن، یہ اسے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کبھی تو وہ مجھے نعمت کی طرح لگتا ہے اور کبھی دہل لگتا ہے۔ پچھلی رات ہم اسپتال سے نکلے تو میں اتنی تھک چکی تھی کہ چنانچہ بھی دوپہر ہو رہا تھا۔ بس چلتا تو میں سیمانہ کے ساتھ ہی لیٹ کر سو جاتی اور پتا ہے، اسے نے کیا فرمائش کی؟ کہنے لگا، کافی شاپ چلیں۔ وہاں چل کر پانی یادیں تازہ کریں گے۔ آپ مجھے وہیں ملی تھیں نا۔ میں اس کا دل رکھنے کو چلی گئی اس کے ساتھ۔ وہاں کھانا اور عزیز سے ملاقات ہو گئی۔ وہ دونوں اسے کہ ہم عمر ہی ہیں مگر ان کے انداز میں پختگی اور اطوار میں شائستگی ہے۔ جبکہ اسے کہ انداز سے لڑکھن جھلکتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہے۔ اسے تمام وقت اپنی سیاحت کے قصے سناتا رہا۔ پور کر کے رکھ دیا سب کو مگر اسے احساس بھی نہیں ہوا۔ میں شرمندہ ہوتی رہی۔ رات کو دو بجے بڑی مشکل سے میں نے اسے اٹھنے پر آمادہ کیا ورنہ وہ تو رات جگمگے کے موڈ میں تھا۔ روشن اب ہوا تو میں سن سکتا کہ وہ سوچتی رہی کہ کاش اسے تم جیسا ہوتا۔

اب خط ختم کرتی ہوں۔ کپڑے دھلائی کیلئے بھجوانے ہیں۔ میلے کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ یہ اور بڑا مسئلہ ہے کہ کب کون سا لباس پہنوں۔ اب سیمانہ کی قدر مکمل رہی ہے مجھ پر۔ یعنی اس کے بغیر میں تو کسی کام کی نہیں ہوں۔ ادھر پرستاروں کی ڈاک کا ڈھیر لگ رہا ہے۔ میں نے صرف تمہارے خط نکالے ہیں اب سوچتی ہوں، ڈاک بھی چیک کر لی لوں۔

شکر گزاری اور محبت کے ساتھ
تمہاری اپنی سونیا

ہر صبح اس امید کے ساتھ اٹھتا ہوں کہ تمہارا خط آج آئے گا لیکن ابھی تک جوائی خط سے محروم ہوں۔ توقع تھی کہ میری محبت کے ”عملی ثبوت“ کے بعد تم مجھے جوائی خط ضرور لکھو گی۔ میں تم سے جواب میں کچھ نہیں مانگتا مگر محبت بلا قیمت دی جاتی ہے۔ لیکن قبولیت کی کوئی علامت تو برصاں ظاہر کرنا چاہیے۔ یہ تو سمجھتا ہوں کہ ہمیں مختل رہنا ہو گا اور سمجھ داری سے کام لینا ہو گا۔ ابھی پولیس سے بھی نمٹنا ہے اور ان لوگوں سے بھی جو تمہاری سیکریٹری کے ساتھ سازش میں شریک تھے۔ مگر ایسا بھی کیا کہ تم سب سے چھپ کر چپکے سے مجھے ایک دو سطر خط بھی پوسٹ نہ کر سکو۔ سونا! اگر کہیں تم میرے پچھلے خط کی بے باکی کی وجہ سے خط لکھنے سے گریز کر رہی ہو تو میں تم سے معذرت ہی کر سکتا ہوں۔ میرا ہرگز ایسا کوئی مقصد نہیں تھا کہ تمہاری توجہیں کروں۔ لیکن میرا نظریہ ہے کہ جب دو انسان باہم محبت کرتے ہیں تو دونوں اور دھوئوں کے ساتھ ان کے دل بھی ایک ہو جاتے ہیں۔ تمہیں شاید میری بے باکی بری لگی ہو مگر جاہل یقین کرو! یہ بری ہے نہیں۔ اس کا مطلب احترام کی کمی نہیں، محبت کی شدت ہے۔ یہ بری یا احترام کی کمی کا باعث ہوتی تو مجھے وہ خواب نظری نہیں آتا۔

میری جان پلیز۔۔۔ میرے خط کا فوراً جواب دو ورنہ اب میں سوچ رہا ہوں کہ کوئی اور بھی موجود ہے جو میرے خطوں کے اور تمہارے بیچ حائل ہے۔ اگر ایسا ہے تو بھی تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارے دشمنوں سے کیسے نمٹنا جائے۔

محبت بھرے بوسوں کی برسات کے ساتھ۔ تمہارا قانع
ساحر انجین

خبریں ہی خبریں ہیں۔ سیمہ بالکل پہلے جیسی ہو گئی ہے۔ وہ سخت برہم ہے کہ اسے اسپتال میں رکھا جا رہا ہے۔ اسے کریڈ ایگڈ اس رات کے واقعات اسے کچھ زیادہ یاد نہیں۔ کہتی ہے، کسی نے اس کا نام لے کر اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور فوراً ہی اس پر چاقو کے پے در پے وار کیے جانے لگے۔ پولیس کا خیال ہے کہ سیمہ اس سے زیادہ جانتی ہے لیکن خوف زدہ ہے اس لیے زبان کھولتے ہوئے ڈر رہی ہے۔

مکرم میں جانتی ہوں کہ سیمہ کیسے نڈر ہے۔ وہ بھلا کسی سے ڈرے گی۔ اب بھی تم اسے ہشتے ہوئے دیکھو گے تو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ اس عالم میں بھی وہ ہنس سکتی ہے کہ آدھے چہرے میں جھنجھٹ بھی نہ ہو، ورنہ ٹانگے کھل جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہشتے ہوئے اس کی آواز ہی عجیب ہو جاتی ہے۔ کوئی بزدل آدمی ایسی صورت حال میں ہٹنے کا تصور کرتے ہوئے بھی ڈر جائے گا۔ مگر سیمہ تو سیمہ ہے۔

اب آؤ باقی مہملات کی طرف۔ آج مجھے بتایا گیا کہ ”دوڑا کیا گری“ 15 مئی سے باقاعدہ پیش کیا جانے لگے گا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا لیکن پروڈیوسر بہت سیرس ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس طرح لوگ بلگ کر رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ڈراما میڈیوں اسٹیج کی زینت بنا رہے گا۔ روشن، میرا رول ہے حد پاور فل ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں اس میں زندگی کی لازوال پرفارمنس دوں گی۔

اور اب زندگی کی شکایات! اسے کے دماغ میں جھاننے کمال سے یہ بات سامگنی ہے کہ میں اسے لے کر کسی سفر روانہ ہونے والی ہوں۔ اصل میں اسے خواہش بہت ہے میرے ساتھ ورلڈ ٹور کرنے کی۔ میں نے اسے بٹھا کر سمجھایا کہ اسٹیج ڈراما ہاتھ دینے والی چیز ہوتا ہے۔ ابھی تو صرف گھنٹے سے زیادہ کے لیے شہر سے باہر بھی نہیں نکل سکتی اور کون جانے ڈراما کتنے عرصے چلے۔ پھر اگر یہ نہ بھی ہو تو سیمہ کو اس حال میں ہمو ز کر بھی میں کہیں جانے سے ری، مگر اسے بات سمجھتا ہی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اگر یہ تعلق ختم ہوا تو مجھے دکھ ضرور ہو گا۔ میں جی جی اسے پسند کرتے گی ہوں۔

اب مجھے گھر جانا ہے کپڑوں کی فکر کرنی ہے۔ ڈاک کھول کر چیک کرنی ہے۔ مگر کاغذ بگڑ چکا ہے اسنے دن میں۔ عارضی طور پر سیما کا کوئی متبادل ہو تو بتاؤ اور سنو، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اب سنگیتا کو لے کر کہیں نہ جانا۔ میں چلتی ہوں اور کھانے سے پہلے دودھ پیتا نہ بھولنا۔

تمہاری اپنی سونیا

5 مئی 98ء

سارہ دیدی

تم میری خاطر اتنی دور سے گھریار چھوڑ کر آئیں۔ اس محبت کا کیسے شکریہ ادا کروں۔ مجھے تمہاری آمد نے جو سارا دیا، فائدہ پہنچایا وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں تو اب اس واقعے کو برا بھی نہیں کہتی کہ اسی نے مجھے اور تمہیں۔ برسوں کے ٹھنڈے ہوؤں کو ملایا۔

اور سنو سونیا کیسی کھی جھیں؟ تم نے دیکھا اس نے اس عرصے میں مجھے کتنا وقت دیا۔ کیسی خوش مزاج ہے وہ۔ تمہارے سامنے بھی میرا چڑچڑاپن اور بد تمیزیاں برداشت کر رہی ہے۔ کوئی دنیا میں ہو گا ایلا۔ اب بتاؤ میں اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔

میل اسپتال میں اب بھی میرے ساتھ اٹارڈ جیسا برتو ہو رہا ہے۔ بس پریمیزی کھانے سے بیزار ہو چکی ہوں۔ ناش کوئی ڈھنگ کا کھانا مل جائے۔ کوئی سوٹ ڈش ہی مل جائے۔ میرے لیے خدا سے دعا کرتی رہو۔ بچوں کو پیار۔

تمہاری بہن۔ سیما

7 مئی 98ء

میری سونیا

میں جانتا ہوں کہ اچے کے معاملے میں تم پر کیا گزر رہی ہے کیونکہ میں سنگیتا کو جیسے بھگت رہا ہوں، میرا ہی دل جانتا ہے۔ وہ بے چاری ابھی تک میرے دوستوں کو

قبول نہیں کر سکی ہے۔ شاید ان کی بالغ النظری اس کی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اس نے مانا جانا، میرے ساتھ جانا آنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ بس گھر بیٹھی میری وابستگی کا انتظار کرتی رہتی ہے۔

یہ کیسی عجیب بات ہے جان کہ ہم دونوں ہی آخر میں اپنے سے کہیں زیادہ کم عمر لوگوں میں جا لیجئے۔ کبھی کبھی رات کو نیند اچٹ جاتی ہے اور میں بیڈ روم سے نکل آتا ہوں۔ باہر لاؤنچ میں بیٹھ کر میں ہمیشہ غور کرتا ہوں کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے آخر میں ہمیں توڑ ڈالا کہ جدا کر ڈالا مگر اس سوال کا جواب مجھے آج تک نہیں ملا۔ میں جانتا ہوں کہ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ ایک دوسرے کے لیے ہماری محبت میں کمی تھی۔ بات شاید یہ ہے کہ ہم دونوں نے غلطیاں کیں اور انہیں نہ سمجھا، نہ تسلیم کیا۔ نیز مجھے سنگیتا کو گھر سے نکلنے اور مصروف کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ وہ ہر وقت میرے سر پر سوار رہنے کی کوشش کرتی ہے، جس سے میرے کام میں حرج ہوتا ہے۔ وہ مصروف ہو جائے گی تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہر حال وہ بہت پیاری لڑکی ہے اور میں اس سے محبت بھی کرتا ہوں لیکن شاید مسئلہ بھی یہی ہے کہ وہ لڑکی ہے، پختہ عورت نہیں۔

تم اپنا اور سیما کا خیال رکھنا مجھے ہر وقت تمہاری فکر رہتی ہے۔

تمہارا اپنا روشن

10 مئی 98ء

روشن

تمہارا خط آج صبح ملا۔ ڈاک کے انبار میں سے یہ واحد خط ہے جو میں نے نکال کر کھولا ہے۔ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی میں گرم مزاج اور غصہ ور تھی اور تم بے حد متحمل مزاج تھے۔ اب کیا ہو گیا تمہیں۔ سنو، ابھی سنگیتا کی عمر ہی کیا ہے۔ تم اس سے بڑی توقعات رکھ کر اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ ایک تو تم جیسے اہم اور مصروف آدمی کی بیوی ہونا ویسے ہی آسان کام نہیں۔ یقین کرو، تمہارے دوستوں میں وہ خود کو آؤٹ آف پلٹس محسوس کرتی ہے تو یہ غلط نہیں۔ وہ ہے بھی۔ تمہارے

تمام دوست جہاں دیدہ قسم کے خراٹ مو ہیں اور گھٹیتا بے چاری سیدھی سلوی بھاڑی لڑکی ہے۔ تم تحمل سے کلام وہ جلد ہی وہ خود کو اپنی صلاحیتوں کو دریافت کر لے گی۔ اسے شاپنگ کا چمکا گئے گا، مفلوں میں جائے آئے گی تو اسے پرواہ بھی نہیں ہو گی کہ تم گھروالیں آئے ہو یا نہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس وقت سے لطف اٹھاؤ ورنہ بعد میں اسے ترسو گے۔ تم جانتے ہو کہ قلم اندھڑی کتنی تیزی سے آؤی کو خراب کرتی ہے اور سنو روشن، خامیاں تم میں بھی ہیں۔ حاکمیت تم میں ہلا کی ہے۔ ایسے میں تم یہ بھی بھول جاتے ہو کہ تمہارا واسطہ صنف نازک سے پڑا ہے۔ اور کبھی اپنی سچوں میں گم ہوتے ہو تو مخاطب کو پانچ منٹ گھورنے کے بعد اچانک کہتے ہو۔ پھر سے کتنا میں نے سنا نہیں۔

ابھی سیما نے فون کیا تھا وہ پریشان تھی۔ آخر حملہ آور کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟ اس نے وار کرنے سے پہلے سیما کا نام لے کر اسے پکارا تھا۔ اب تو مجھے بھی اس بات پر پریشانی ہو رہی ہے۔ کسی نے چند سو روپوں کی خاطر اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا۔ یہ سوال بہت اہم ہے۔

میرا خیال ہے، میں ہسپتال چلی جاؤں۔ سیما بہت پریشان لگ رہی تھی مگر اور ڈاک کو بعد میں دیکھوں گی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں روشن۔ بس تم اپنے غصے پر قابو رکھو اور گھٹیتا کا خیال رکھو۔

تمہاری۔ سونیا

10 مئی 98ء

جنرل سیکرٹری

یونین، نگار پارمنٹس

آپ کو یاد ہو گا کہ میں اور میرے شوہر پہلے بھی سونیا کرن کی شکایت کر چکے ہیں۔ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم ایک ادکارہ کے پڑوسی ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیشہ سے بے آرام رہتے ہیں لیکن گزشتہ رات۔ بلکہ آج صبح جو کچھ ہوا، وہ ناقابل برداشت ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کوئی دو بجے کے بعد کا وقت ہو گا کہ اچانک سونیا کرن نے گلا چھاڑ کر چلاتا شروع کر دیا۔ وہ پانی والی مسرت بھری چیخیں نہیں تھیں۔ میرے شوہر اور چند اور پڑوسی ان کے دروازے پر پہنچے۔ انہوں نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ مقصد سونیا کی جی خیریت معلوم کرنا تھا، دروازہ تو نہیں کھلا مگر برتن پھٹنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میرا خیال ہے ان کے ہل کوئی برتن سلامت نہیں رہا ہو گا پھر کالم گھونچ شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد سونیا نے دروازہ کھولا اور پڑوسیوں کو ڈانٹا اور دفع ہو جانے کو کہا۔ اس کے بعد ہم تمام پڑوسی سوئے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

آج تمام پڑوسی میرے اپارٹمنٹ میں اکٹھا ہوئے۔ اب ہم متفقہ طور پر آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ اگر آپ سونیا کو رات گئے کے اس غل غپاڑے سے باز نہیں رکھ پائیں گے تو ہم سونیا کے خلاف قانونی کارروائی کریں گے۔ میں آپ سے تین دن بعد ملوں گی۔ کاش، آپ کچھ کر سکیں۔ ورنہ ہمیں مجبوراً عدالت میں جانا پڑے گا اور یہ بھی ہے کہ اسی مقصد سے سونیا کرن کی شہرت خراب ہو گی اور مقبولیت پر منفی اثر پڑے گا۔

خلوص کیس۔ ریٹائور

ڈیو پولیس اسٹیشن
الیکٹرک شور رانا

کشنر نے حکم دیا ہے کہ تمہیں فوری طور پر مشہور ادکارہ کرن کے گھر پہنچنا ہے۔ جو کس تمہارے ہاتھ میں ہے، اسے بددی پرشلو کے سپرد کر دو۔ باقی ہدایات ہماری ایڈہائیڈ رپورٹ کے بعد دی جائے گی۔

دولن

خط تو سب ضائع کیے جا چکے ہیں۔ ہمارے پاس سارا انجیل کے نام کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ سیما ذہن پر زور دینی رہی ہاں یاد کرنے کیلئے لیکن کچھ بھی یاد نہیں آیا ظاہر ہے، میل تو ٹیکسٹوں خط آتے ہیں۔ سیما کو بس اتنا یاد ہے کہ وہ کسی آڈیو ویڈیو شاپ میں ملازمت کرتا ہے مگر روشن اس شہر میں ایسی جڑاؤں دکائیں ہیں۔

اس نے خط میں لکھا تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ کس پتے پر خط لکھتا ہے۔ یہ کیا بکواس ہے۔ میں کیا جانوں، میں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔

کل ماہر نفسیات ڈاکٹر شرما آیا تھا۔ میں نے اپنی یادداشت کی حد تک خطوں کا مضمون اسے سنایا کیونکہ خط تو اب پولیس کی تحویل میں ہیں۔ شرما کہتا ہے کہ وہ نفسیاتی مریض معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، ایسے مریض بھی خود فریبی کے کسی اور راستے پر بھی چل پڑتے ہیں اور پھر کبھی پہلے راستے کا رخ نہیں کرتے مگر یہ تو محض خیال ہے۔

کوئی حتمیت تو نہیں کہ ایسا ہی ہو گا۔
روشن، میں فوجی جا رہی ہوں۔ میں سو بھی نہیں سکتی۔ اور کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ بے چاری سیما کے سوا۔

میں روشن، تم اپنی شوگر چھوڑ کر مت آؤ۔ کام زیادہ ضروری ہے اور پھر میں میل آگئی تو نہیں ہوں۔ اسے بھی میرے پاس ہے اور وہ انسپکٹر کشور رانا مجھے پولیس والا کم، اور ماہر نفسیات زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس عالم میں مجھے جسادتا ہے۔ تم آؤ مت لیکن پلیز، مجھے ہر رات فون کرتے رہو۔

کمزور اور جھٹاں۔ سونیا

تسے تسے نہیں نے یہ سبق سیکھا ہے کہ جب تک زندگی ہے، زندگی اچھی طرح
نے اور خوشی سننے کی کوشش کی جانی چاہیے۔
اجما دیدی، اب اجازت۔ بچوں کو پیار دینا۔

تمہاری بہن۔ سیما

شاید ماہر نفسیات کے نوٹس بورڈ پر لگا ہوا نوٹس

ایک ہفتہ ہو جانے کے سبب "دیوار کیا گری" کی ہیروئن سونیا کلن چند روز تک ہسپتال میں شریک نہیں ہو سکیں گی۔ لہذا ڈرامے کے افتتاح کی تاریخ تبدیل کی جا رہی ہے۔ اب افتتاح 22 مئی کو ہو گا۔ اپنے ہسپتال شیڈول کے بارے میں معلومات کیلئے کاسٹنگ ڈائریکٹر سے رابطہ کریں۔

11 مئی 98ء

ڈیئر سونیا

آج میں سیما کی عیادت کیلئے ہسپتال گئی تو اس سے ہاتھ چلا سکتی خوف ناک بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پولیس کوئی کوئی نہیں کرے گی کیونکہ معاملہ کسی عام شہری نہیں، تمہارا ہے۔ لیکن میری رائے میں جیسے کچھ دن کیلئے مبینہ چھوڑ دینا چاہیے۔ ڈرامے کو بھول جاتو۔ تمہاری زندگی سب سے زیادہ اہم ہے۔ تم ایسا کرو کہ جب تک وہ پکڑا نہیں جاتا، میرے گھر آکر رہو۔ تمہارا اکیلا رہتا ہر حال مناسب نہیں ہے۔ تم نے فون پر روشن سے بات کی تھی۔ وہ بھی متفق ہے تم آؤ تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔ تمہاری نیو چھوہ

11 مئی 98ء

میرے روشن

صبح تم نے فون پر جو کچھ کہا، اس کا شکریہ۔ لیکن بات غلط تھی۔ سیما ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی ذمہ دار میں ہوں۔ تمہارے خیال میں میرا یہ سوچنا رہا ہے۔ ہے؟ تو پھر شاید میں پاگل پن کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ میں نے جب دم کوئلے اور پڑے تو پاگلوں کی طرح چلانے لگی اور گڑ۔ مجھے سمجھ جانا چاہیے۔ روشن، سیما اس کے خطوں کا مذاق اڑاتی تھی، مگر مجھے تو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ خطرے کو اس وقت تک محسوس ہی نہیں کرتی جب تک وہ سر پر نہ آجیے۔ ام

میرے دماغ میں بار بار ڈنک مارے جاتے ہیں۔ میں تمہارے خط کا اسی طرح انتظار کر رہا ہوں جیسے کوئی ڈوبنے والا کسی ننگے سے آس لگاتا ہے۔ یا جیسے کسی بہت بڑی عمارت کے بلے میں دیہوا انسان تازہ ہوا کی آرزو کرتا ہے۔ کیا تم بھی مجھے ایس کو می؟
تمہارا اور صرف تمہارا۔ سارا انہل

12 مئی 98ء

سارہ دیدی

اس وقت سر میں شدید درد ہے۔ یہ تمہاری فون کل اور سونیا سے ملنے کی مہلتی ہے۔ کاش تم دونوں پر سکون ہو جاؤ۔ اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھ میں آتی تم دونوں کی کہ وہ میرے پیچھے نہیں ہے۔ ویسے بھی اب میں اس اسپتال میں مریض نہیں ہوں۔ میں تو یہاں قیدی ہوں۔ میرا کراہتا رہتا ہے۔ دروازہ لاک رہتا ہے۔ میں باہر قدم بھی لگاؤں تو ایک نرس لپک کر آتی ہے اور مجھے دوبارہ کمرے میں دھکیل دیتی ہے۔ فضا میں محفوظ ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو اور دن میں کئی کئی بار مجھے فون مت کرو۔ اس طرح تو میں پاگل ہی ہو جاؤں گی۔

اور سونیا تم سے بھی دس ہاتھ آگے ہے۔ وہ آتی ہے اور روئے گلتی ہے۔ کہتی ہے کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس کا تصور ہے۔ اب ایسے میں کون پر سکون ہو سکتا ہے۔ سونیا کو سمجھاتی ہوں کہ بھی اس شیطان کے خطنوں کے جوہالت میں نے لپکتے تھے۔ تم نے نہیں۔ کاش سونیا کا احساس جرم دور ہو جائے۔ ورنہ وہ اسی چکر میں لپکتی رہے گی اور میری تعین کرا کے چھوڑے گی۔ آج وہ کہہ رہی تھی کہ یہ پکر ختم ہ جائے تو وہ مجھے دنیا کی سیاحت کیلئے لے جائے گی۔ اب ذرا تصور کرو، یہاں اتنے کام ہمارے ہیں چھوڑ کر تفریح کی جا سکتی ہے بھلا؟ ویسے میرے لیے تو یہ اچھا ہی ہو گا۔ اس بات سے میں نے یہ سبق سیکھا ہے کہ جب تک زندگی ہے، زندگی اچھی طرح گزارنے اور خوشیوں کیلئے کوشش کی جانی چاہیے۔

اجمادیٰ، اب اجازت۔ بچوں کو پیار دیتا۔

تمہاری بہن۔ سیما

میں بتا دوں کہ دلو والوں کیلئے اگلے چند ہفتے سکون اور اطمینان کے ہیں لیکن مکمل اور مستحکم معلومات کیلئے مکمل کوائف جانتا ضروری ہے۔ گھڑو آپ کی حفاظت کرے۔
مخلص۔ بلال خان

12 مئی 98ء

میری جان

ابھی تک مجھے جو بالی خط نہیں ملا ہے۔ اب میں اسے کیا سمجھوں۔ میرے ذہن میں خوفناک خیالات رینگ رہے ہیں۔ میری قسمت کے ستارے، میری محبت، میں تم پر بھی شک کرنے لگا ہوں لیکن اس سب کے باوجود میرا ذہن کہتا ہے کہ سب شکوک و شبہات بے بنیاد ہیں۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ ان سے ایک بار چچا چچا ہی لیا جائے میں جانتا ہوں کہ میرا تمہارے پارٹنر سے بہت زیادہ قریب ہوتا "تمہارے" ہے۔ کس ہو گا لیکن تمہاری بلڈنگ کے سامنے جو پارک ہے وہاں پھول دار گھنٹی جھانڈیاں کی ایک باڑھ بیڑے کلم کی ہے۔ سو میں نے یہی کیا۔ تمہارے چوکی دار پر میں خاص طور پر نظر رکھی۔ یاد ہے تاکہ میں اسے تمہاری سیکورٹی کے ساتھ سازش میں لوٹ پلٹے ہی دیکھ چکا تھا۔

میں تین دن سے اس پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ ڈاک کے پہنچنے کے وقت صرف ایک بار موجود تھا۔ باقی دونوں دن دوسرا چوکیدار تھا۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے۔ یہ کہ میرے خط تم تک پہنچ گئے ہیں۔
تو پھر تم نے مجھے جواب کیوں نہیں دیا؟

ساتھ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ دار میں ہوں۔ تمہارے خیال میں میرا یہ سوچنا درست ہے؟ تو پھر شاید میں پاگل بنی کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ میں نے جب وہ کھولے اور پڑے تو پاگوں کی طرح چلنے لگی او گھڑو۔ مجھے سمجھ جانا چاہیے روشن، سیما اس کے خطن کا مذاق اڑاتی تھی، مگر مجھے تو سمجھ لینا چاہیے تھا۔ خطرے کو اس وقت تک محسوس ہی نہیں کرتی جب تک وہ سر پر نہ آجائے۔

کشور رانا

کچھ علاقوں میں آڈیو ویڈیو کی تمام دکانیں چپک کی گئی ہیں۔ ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ مزید علاقے چپک کیے جا رہے ہیں۔ کسٹمر صاحب ہاتھ رہے تھے کہ تسماری طرف سے ابھی تک کوئی رپورٹ کیوں نہیں آئی۔ انہیں اب اس سے شک کیا جا رہا ہے۔ معاملہ ایک سپر اسٹار کا ہے۔

دلن

دلن

کسٹمر صاحب کو بتا دو کہ کل میری شادی کی گیارہویں سالگرہ تھی۔ میں وقت مگر نہیں پہنچ سکے میری بیوی مجھے سے ہاگل ہو رہی ہے۔ ڈر ہے کہ مجھے تو کبھی عیال چھوٹی پڑ جائے کیس کی صورت میں یہ ہے کہ ہم پوری رفتار سے کام کر رہے ہیں لیکن ہو کچھ نہیں رہا ہے۔

کشور

13 مئی 98ء

روشن میری جان

آج اس کا ایک اور خط آیا۔ جس میں تو معلوم ہی ہے کہ پہلے انسپکٹر کشور میری ڈاک چپک کرتا ہے۔ اس کے بعد مجھے ڈاک کو لینے کی اجازت ملتی ہے۔ پھر اس نے ہی یہ خط کھولا مگر مجھے پڑھنے کو نہیں دیا۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ کچھ لفظ دیکھ کر اور اس کی تحریر پہچان کر ہی قہقہے چڑھ گئی تھی۔ انسپکٹر نے خط چھہ کہا کہ اس میں اچھی خبر ہے۔ انہیں کام کرنے کے لیے ایک کلب مل گیا ہے۔ وہ خوش نظر آ رہا تھا۔

روشن، کاش۔ کاش یہ معیت مل جائے۔ اب تو میں بہت پرسکون ہوں انسپکٹر کشور اور سیمائی مہرانی سے سیماء ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ بڑھتی جا

ہے۔ کل سے میں بھی سیرسل پر چلا شروع کر دوں گی۔ یہ میرے بہتر ہونے کی علامت ہے۔ ٹی بیٹھ کی طرح جھینوں کے ساتھ۔

تسماری۔ سونیا

16 مئی 98ء

میری شیخ محبت سونیا

ذہن بری طرح الجھ گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہارا خط تو ملا نہیں۔ میں نے سمجھ لیا کہ مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ چنانچہ میں بیٹھا اور کوئی منصوبہ سوچنے لگا ہوش و حواس میں رہ کر اپنے خفگی ذہن کو کام میں لاتے ہوئے۔

مجھے احساس ہو گیا کہ اب تمہاری بہت قریب سے گھرائی کی جا رہی ہے۔ اسی وجہ سے تمہارا مجھ سے رابطہ کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ ایسے میں مجھے مبر سے کام لینا ہو گا۔ میں خود غرض تھا کہ تمہاری مجبوریاں سمجھنے کے بجائے تم پر شک کرنے لگا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں شک نہیں کروں گا۔ بے مبر سے ہن اور جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔ تم مطمئن اور خوش و خرم رہو میری جان۔ تمہارا تحفظ اور تمہاری بہتری اس شخص کے ہاتھوں میں ہے۔ جو محبت کا ”آئین انسانیت“ ہے۔

میں نے سمجھ لیا کہ ہاتھ کے پیچھے چھپ کر ہلاک کے دروازے پر نظر رکھنا خطرناک ہے۔ حملت ہے (ہو سکتا ہے کہ میرے خط تک نہ پہنچے کے بجائے خط ہاتھوں میں پہنچ رہے ہوں۔ اس طرح تو میں دھڑلہ چلوں گا اور پھر تمہارا کیا ہو گا تمہارے تحفظ کا کوئی خیال رکھے گا۔ تم تو دشمنوں میں اکیلی گری ہو چکی) چنانچہ میں بس میں بیٹھ کر وہاں سے گزرا اور گردن پیش کا مقابلی نظروں سے چارہ لیتا رہا۔ میں نے پارک کو دیکھا، فٹ پاتھ کو دیکھا، فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی کلاؤں کو دیکھا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مجھے اوپر سے اوپر اور اوپر سے اوپر بسوں میں چڑھ چکے لگنے پڑے۔ سیرسل کام تھا دینے والا تھا جو دیکھنے دینے آئے ہو سن لو۔

برہاد میں نے جینز اور چپک شرٹ پہنے ایک جوان آدمی کو فٹ پاتھ پر کھڑے

دیکھ میرے بدترین اندازوں کی تصدیق ہو گئی۔ سونیا جان، ہماری گھرانی کی جاری ہے مگر جان، تم بالکل خوف زدہ نہ ہو۔ میں تمہارے بہت قریب ہوں اور رہوں گا۔ بس میں جلد بازی نہیں کروں گا ایسے لوگ ہار جاتے ہیں۔ اب میں یہ خط پوسٹ کروں گا اور پھر سکون سے بیٹھ کر آئندہ کے اقدار کے بارے میں سوچوں گا۔ تم بھی پرسکون رہو۔

تمہارا بچنے والا پروانہ۔ سحر انجمان

16 مئی 98ء

جان، جان، جان

ایک ہی دن میں دوسرا خط مگر یہ ضروری تھا کہ تمہیں اگلا کر دوں۔ پہلا خط پوسٹ کرنے کے بعد میں سوچ رہا مگر افسوس، مسائل کا کوئی حل نہیں سوچا لیکن ایک طلب میرے اندر چل اٹھی۔ تمہیں دیکھنے، تم سے ملنے کی طلب۔ اور وہ اتنی شدید تھی کہ اس کی چہن نے مجھے بے چین کر دیا۔ وہ عجیب تڑپ تھی۔ میں بے چین تھا کہ تم سے ملوں۔ دیکھوں کہ تم خیریت سے ہو۔ تمہیں چھوڑوں، تمہیں ہاتھوں میں بھروں اور۔۔۔ اور۔۔۔ تم سے یوں ملوں جیسے بارش پانی مہرے سے ملتی ہے۔

یہ تڑپ اور بے چینی اتنی بڑی کہ میں گھر سے نکل آیا۔ اس بار میں نے تمہیں کا رخ کیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔ تمہیں کے سامنے سڑک پار کر کے ایک کلائی شاپ ہے۔ وہیں سے میں تمہیں کے گریٹ پر نظر کر سکتا تھا۔ میں کلائی شاپ میں بیٹھ گیا۔ مجھے تمہیں معلوم تھا کہ کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ چنانچہ میں نے کمانے کا آرڈر دے دیا۔ آج قسمت میرے ساتھ تھی۔ مجھے وہیں بیٹھے 45 منٹ ہوئے ہوں گے کہ کچھ لوگ تمہیں سے نکلے دکھائی دیئے۔ انداز سے پتا چلا تھا کہ وہ اداکار ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ سیرسل ختم ہو گئی ہے۔ پھر میری دھانیں رنگ لائیں اور تم اپنی خوش بدنی کو سرخ لباس میں چھپائے ہوئے باہر آئیں۔ تمہیں دیکھ کر میرا دل سینے میں رقص کرنے لگا۔ تمہارا لباس میرے لیے نہیں تھا۔ میں تو تمہیں اس کے آپنا اس کے بغیر دیکھنے کی اہلیت بھی رکھتا ہوں۔

مگر پھر میرا دل رونے لگا تم اتنا قریب تھیں۔ اور میں تم تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ بالکل دو جہتوں کا فاصلہ تھا میرے لیے لیکن۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ شاموں کے جو درد محبت کا نقشہ کھینچا ہے، وہ کتنا درست ہے۔ ایک آگ سی تھی سینے کے اندر لگی ہوئی۔

پھر میں نے دیکھا کہ تم اکلی نہیں ہو۔ ایک جوان شخص تمہارے ساتھ تھا۔ اس نے گزرتی ہوئی عیسیٰ کو روکا اور تمہارے لیے دروازہ کھولا پھر خود بھی تمہارے ساتھ بیٹھ گیا۔ سونیا یہ شخص کون ہے؟ کاش۔۔۔ شخص تمہارا کوئی دوست ہو۔ بہر حال جو بھی ہے، مجھے معلوم ہو چاہے گا۔ بس وہ کچھ بھی ہو، تمہارا محبوب نہ ہو۔ محبوب ہوا تو میں بھی اس سے نمٹ لوں گا۔

دنیا میں جتنی محبت موجود ہے، سب تمہارے لیے ہے۔ میری طرف سے۔

تمہارا، تمہارے جسم اور جلوؤں کا طالب۔

17 مئی 98ء

روشن جی

تمہاری سونیا ایک بار آداب عرض کرتی ہے۔ اب وہ ہسٹری کی مریض ہے، نہ ٹوان اور الیگزینڈرا ہوئی لڑی۔ کچ بچ ہوں، اپنے آپ میں واپس آنا بھی بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ مجھے اتنی خوشی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ غیر معمولی بات یہ ہے کہ میری زیر موجودگی میں سیرسل کے دوران میں میرے ساتھیوں نے بڑی تندہی سے کلام کیا۔ پچھلی رات تم نے فون پر اسے کے بارے میں پوچھا اور میں کئی کلائی گئی۔ فون پر تمہیں بتاتے ہوئے میں کھیا رہی تھی۔ بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ خط میں تمہیں سب کچھ بتا سکتی ہوں اور بتا رہی ہوں۔ پتا چلا ہے کہ اسے اپنی عمر کے بارے میں جھوٹ بول رہا تھا۔ گلا اپنا کرم کرے مجھ پر، درحقیقت اس کی عمر صرف بیس سال ہے۔ دو، مفر، بیس، انیس + ایک = بیس۔ ذرا تصور تو کرو یہ جان کر میرے روٹنے کوڑے ہو گئے۔ شکر ہے کہ ہارٹ فیل نہیں ہوا۔ یہ۔۔۔ ان کل تو

17 مئی 98ء

بیاری سونیا

آج تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ شام نے سفر کے تمام انتظامات مکمل کر لیے۔ گرمیوں میں نئی تیل کا لفافہ ہی کچھ اور ہوتا ہے مگر مجھے رنج ہے کہ ہم تمہارا ڈراما نہیں دیکھ سکیں گے۔ افتتاحی شو سے ایک روز پہلے ہماری روانگی ہے۔ مجھے جیسے ان پریشانیوں میں گھرا چھوڑ کر چلے ہوئے احساس جرم بھی ہو رہا ہے لیکن مجبوری ہے۔ شام کی صحت کیلئے یہ ضروری ہے۔ ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی ہے کہ وہ کم از کم ایک ماہ کسی پر نفعا مقام پر گزارے۔

اچھا سونیا، مکان کی چابی تو تمہارے پاس ہے۔ جب بھی ضرورت محسوس کرو، اپنے گھر کی طرح آجانبہ ضرورت کی ہر چیز مکان میں موجود ہے اور فریج میں بھی۔ نئی تیل سے تمہارے لیے کوئی بہت زبردست چیز لاؤں گی۔

بے حد محبت کے ساتھ۔ نیلم راٹھور

○

30 مئی 98ء

روشن

ایک پیش رفت ہوئی ہے۔ پولیس کو ایک سائبر انجمن کا پتا چل گیا ہے، جو ایک آڈیو ویڈیو شاپ پر ملازمت کرتا ہے۔ میں کتنی خوش ہوں، تاہم نہیں سکتی۔ دل اور دماغ پر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ سیماکو یہ خبر سنائی تو وہ بھی خوشی سے پاگل ہو گئی۔ آثار بتاتے ہیں کہ وہ ایک دن میں یہ معاملہ منٹ جانے کا اور ہم سب سکون کی سانس لے سکیں گے۔ پر سون ڈرامے کا افتتاحی شو ہے۔ کاش اس سے پہلے ہی اس منحوس کو پکڑ لیا جائے۔

محبت کے ساتھ۔ سونیا

○

بھئی کسی کی عمر کا اندازہ لگایا ہی نہیں جاسکتا اور بہت صرف اتنی ہی نہیں ابھی تو وہ کالج میں پڑھ رہا ہے۔ تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی اس کی۔ لیکن پڑھائی میں وہ دلچسپی ہی نہیں لیتا۔ (مجھے پڑھنے کے پتھر میں جو پڑ گیا) میرا حل 13 تاریخ کو میں نے اسے علی گڑھ کے لیے رخصت کر دیا اور خود گھر آ کر منہ لیپٹ کر پڑ گئی۔ اس وقت سے برا حال ہے۔ میرا خود سے بھی شرمندہ ہوں۔ تم اگر سیماکو خط لکھو تو پلیز اپنے کے بارے میں کچھ نہ لکھو۔ میں فی الوقت نہیں جانتی کہ اسے معلوم ہو۔ وہ مجھ پر اتنا چلنے کی کہ اس کے ٹانگے مکمل جائیں گے۔

تم اپنا بہت خیال رکھا کرو جان۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ کلام پر دھیان رکھو۔ جلد از جلد ارب پتی ہو جاؤ۔ تاکہ رینارمنٹ کے بعد سنگیتا کے ساتھ شان سے رہ سکو۔ تمہاری اپنی۔ سونیا

○

21 مئی 98ء

روشن — روشن

آج اس منحوس سائر انجمن کے دو خط آئے۔ انپکڑ کشور رانا کو یقین ہو گیا ہے کہ اب مجرم خود کو ظاہر کرنے والا ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ انپکڑ نے مجھے خط نہیں پڑھنے دیے۔ اچھا ہی ہے مجھے تو لگنے دیکھ کر ہی ہول چڑھنے لگتا ہے۔ میں انہیں پڑھنا بھی نہیں چاہتی۔

واقعہ یہ ہے کہ کل میں نے زیادہ ہی امید باندھ لی تھی۔ اب تک آڈیو ویڈیو شاپ میں کام کرنے والے چھ سائر انجمن گرفتار کر کے پوچھ گچھ کے بعد چھوڑے جا چکے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ہمارا دوپانہ سائر انجمن نہیں تھا۔ خیر۔

ناخوش۔ سونیا



نلی گرام

22 مئی 98ء

ڈیر سونیا کرن

کل تمہارے ڈرامے کا افتتاحی شو ہے جو مجھ سے سیکھا ہے یاد رکھنا بھول نہ جاؤ۔

تمہاری نیت چوہدری



نلی گرام

22 مئی 98ء

سونیا جی

میں بالکل ٹھیک اور خوش و خرم ہوں۔ تمہاری کامیابی کی دعا کر رہی ہوں۔ میری فکر نہ کرنا کام پر دھیان رکھنا تم سے محبت کرنے والی سیما۔



189

نلی گرام

22 مئی 98ء

سونیا۔ میری ہنسی

پرجھکو اور پرواز کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تمہیں آکاش کو چھو لیتا ہے۔

تمہارا۔ روشن



22 مئی 98ء

میری سونیا

اس خط میں مشوروں اور نصیحتوں کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ تمہارے ڈرامے کا پہلا حصہ فضول اور بکواس ثابت ہوا۔ دوسرے حصے کا آغاز بھی بہت گھٹیا تھا۔ حیران مت ہو، میں انتہائی شو میں موجود تھا۔ ہر حال دوسرا اور آخری حصہ بہت جاندار تھا اور تمہاری پرفارمنس۔ مگر یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ میں تو اس سے بھرا ہوا ہوں، جو کچھ میں نے شو کے بعد دیکھا اور میں سب کچھ ترتیب دار لکھوں گا۔

ڈارنگ، میں نے پہلی بار اپنی جان کو اتنے قریب سے دیکھنا سچ پوچھو تو پہلے ایکٹ میں، میں نے تمہیں دیکھنے اور نظروں نظروں میں پینے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ پھر بھی میں نے بتاندہ نظروں سے ڈرانا دیکھتے ہوئے کچھ فیصلے کیے۔ کون سے مکالمے غیر ضروری اور کچے ہیں، کن اداکاروں کی شخصیت ڈرامے کو دہانی ہے۔ (بلکہ شخصیت کا نہ ہونا کہو) ان سب باتوں کی طرف۔ میں بعد میں تمہاری توجہ دلاؤں گا۔

پہلے ایکٹ کے بعد وقفہ ہوا تو جیسے مجھ پر جہنم کے دروازے کھل گئے۔ میں نے اس شخص کو دیکھا جس کے ساتھ تم ٹیکسی میں بیٹھ کر اس رات حیدر سے رخصت ہوئی تھیں۔ وہ آدرش رائے کے عتب میں ایک مرد اور عورت کے ساتھ کھڑا اور بج ہو جس پی رہا تھا۔ میں اس کے قریب ہونے لگا۔ اس دوران میں ایک جوڑا اور وہیں پہنچ گیا۔ انہوں نے اس شخص کو انپکڑ کشور رانا کہہ کر مخاطب کیا تو میرے تو چپکے چھوٹ گئے۔ یہ کیل۔ تم تو پولیس والوں میں گھری ہوئی ہو۔

دوسرے ایکٹ کے دوران میں کیسے دل پکا کر کے بیٹھا رہا، یہ میرا دل ہی جانتا

ہے۔ میں نے سوچا، اس شخص کی موجودگی کے بلجود مجھے کسی طرح ہمارے قریب پہنچنا ہو گا اور اشاروں سے تمہیں سمجھاتا ہو گا کہ تم پریشان نہ ہو، میں تمہارے قریب موجود ہوں۔ پرہہ گرا تو میں اس بچے کی طرف کھلے والے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ وہاں پہلے ہی اچھا خاصا جھوم تھا۔ ہمارے دید کے امیدواروں کا جبکہ میں انتہائی قوت کا حق دار ہوں۔ بہر حال تمہاری محبت کی خاطر میں گھٹیا لوگوں کے اس مجمع میں مکمل مل گیا۔

میرا منصوبہ سلاہ سا لیکن بے حد موثر تھا۔ دعوت ٹالنے کے اندر میں نے تمہارے لیے پیغام لکھ رکھا تھا۔ میں تم سے اس پر آؤ گراف طلب کرتا اور آؤ گراف دیتے ہوئے یقیناً تمہاری نظر میرے پیغام پر پڑ جاتی۔ مگر دردناہ کھلا تو میں حیران رہ گیا۔ تم اس پولیس والے کے ہاتھوں میں ہاتھ والے نمودار ہوئی تھیں۔

پہلے تو میں سمجھا کہ تم اس کی قیدی ہو، اور اس کی تحویل میں ہو مگر جب تم نے اس کی مدافعت کے بغیر آزادانہ طور پر کئی لوگوں کو آؤ گراف دیے تو میں گہرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے لیے اس پولیس والے کی موجودگی میں اپنے منصوبے پر عمل کرنا ناممکن تھا۔

پھر ایک غیر معمولی بات ہوئی۔ تم آگے بڑھیں لیکن آگے بڑھتے ہوئے تم نے از خود پلٹ کر اس پولیس والے کا ہاتھ تھام لیا اور تم نے اس سے جو کچھ کہا، اسے سن کر خون میری رگوں میں سرد ہونے لگا۔ تم نے کہا تھا، ”تمہیں بھی پاداشی میں میرے ساتھ چلنا ہے۔ میں کوئی عذر نہیں سنوں گی۔“

کوئی شکار اپنے شکاری سے یہ الفاظ نہیں کہہ سکتا اور پھر تم نے اسے جس مسکراہٹ سے نوازا تھا، اس کے دو معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ میں تو اپنی جگہ ہنجر کا بت بن کر رہ گیا۔ تم میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ساتھ چلی گئیں۔

سوچنا، تاؤں کیا سوچوں۔ اس آنکھوں دیکھی کو کیا سمجھوں۔ کیا نتیجہ نکالوں اس سے۔ کیا وہ دکھلا تھا؟ یا تم اس سے بچھا چڑھانے کیلئے اپنی زندگی کی بہترین اداکاری کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ جو بھی ہے، حقیقت مجھے معلوم ہوئی چاہیے۔

میں اس خط کو فوراً پوسٹ کروں گا اور تمہیں فوراً جواب دیتا ہے۔ مجھ سے رابطہ کرنا خطرناک تو ہے لیکن کوئی ترکیب سوچو۔ تمہارے مستقبل کا جیون ساعی ہونے کی حیثیت سے یہ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں۔ ایک فری ہوادری کی حیثیت سے تمہیں اس کی قیادت کرنی ہے۔ خوف زدہ نہ ہونا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

تمہارے پہلو میں موجود رہنے کا حق دار۔

سارا انجیل

23 مئی 98ء

نیو چمپری

میلی گرام کا شکریہ۔ میرا خیال ہے تم سے میں زیادہ نہیں سیکھ سکی تھی۔ بہر حال انتہائی شو کچھ بہت اچھا نہیں رہا ایک تو میں بڑی عمر کی لگ رہی تھی۔ پر شاید میں نے پرکارم بھی ایسے ہی کیا اب یہ مٹو ریٹرنٹ کیسے لیا جاتا ہے۔ میں اب انہیں خطوط پر سوچ رہی ہوں۔ محبت اور احترام کے ساتھ۔

سوچنا کرن

24 مئی 98ء

سوچنا

مجھ سے یہ انتظار برداشت نہیں ہوتا۔ برے برے اور خوف ناک خیالات میرے دماغ میں کیزے کوئوں کی طرح رینگتے پھر رہے ہیں اور تم نے حد کر دی ہے کہ میرے حکم کے بلجود میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ تمہیں فوراً خط لکھا ہو گا ورنہ مجھے ذہنی سکون نہیں ملے گا۔ ایک بات اور ہے سوچا تو یہ تھا کہ اسے تمہارے لیے بلور سربراہز رکھوں گا لیکن اب میں نے فیصلہ کیا

ہے کہ جنس بتا دیں۔

سونیا میں جانتا ہوں کہ کسی ڈرامے کی تیاری کس قدر تھکا دینے والا کام ہے اس لیے میں نے تمہارے لیے تفریح کا بندوبست کیا تھا۔ تاکہ تمہاری صحت وصل جائے اور چند روز بعد جب ڈراما باقاعدہ اوپن ہو تو تم اس کیلئے تازہ دم ہو جاؤ۔ خرچ کی پروا کیے بغیر میں نے ایک فائبر اسٹار ہوٹل میں تمہارے لیے سب سے شان دار سوٹ کا بندوبست کیا ہے۔ یہ پروگرام 29 مئی کا ہے۔ وہاں بس تم ہوں گے اور کوئی نہیں۔

اب سمجھیں نا، جنس مجھے فوراً۔ فوراً خط لکھنا چاہیے۔

اگر تم نے خط نہ لکھا تو میں کیا سوچوں گا؟ تم ہی سوچو۔ میں بس یہی سوچ سکتا ہوں کہ تم نے مجھے اپنے دشمنوں سے پیچھا چھڑانے کیلئے استعمال کیا ہے اور درحقیقت جنس مجھ سے محبت نہیں ہے اور کیا سوچ سکتا ہوں میں۔

پلیز سونیا، تم ایسا نہ کرنا۔ ہرگز نہ کرنا۔

تمہارا سارا انجمن

کشور

کچھ اور سارا انجمن دریافت ہوئے لیکن ان میں بھی ہمارا مطلوبہ شخص کوئی نہیں ہے۔ چھان بین کے بعد سب کو چھوڑ دیا ہے۔

ولسن

25 مئی 98ء

جان روشن

اب اگر مجھ سے ملو اور میں کسی بچے کی دلاوی یا غلی کی طرح لوگوں تو حیران نہ ہوں صرف اور صرف خوف نے میری عمر کم از کم دس سال بڑھا دی ہے۔

چند روز پہلے انسپکٹر کشور نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اسے ساتھ لیے بغیر باہر

نہ نکلوں۔ یہ بات میرے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ مگر میں اسے نظر انداز بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں سسم گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ منحوس شیطان میری گرفت میں ہے اور سیما کی طرح مجھ پر بھی وار کرے گا۔ بعد میں کشور نے مجھے سمجھایا کہ یہ بات ہرگز نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے خطوں میں تو میرے لیے صرف محبت ہی مہم ہوتی ہے اور وہ مجھ سے جوبلی خط کی التجا کرتا رہتا ہے۔ اوکھا، کاش مجھے اس کا چمکھ معلوم ہوتا تو میں اسے خط لکھ دیتی اور یہ عذاب ختم ہو جاتا۔

بہر حال کشور نے سمجھایا کہ اس کی ہدایت محض رسمی، احتیاطی اور ضابطے کے مطابق ہے مگر میری تسلی نہیں ہوئی۔ بلاخر کشور کو مجھے حقیقت بتانی پڑی۔ اس نے بتایا کہ وہ غیبت صرف مجھے ایک نظر دیکھنے کے لیے پارٹنٹ ہاؤس کے گرد منڈلاتا رہتا ہے لیکن کشور نے قسم کھا کر کہا کہ اس کا مقصد مجھے نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ یہ سن کر میں پوری طرح تو میں البتہ کسی قدر مطمئن ہو گئی۔

اب آج صبح میں کشور کی آمد کا انتظار کر رہی تھی کہ گزریا ہو گئی۔ پتا چلا کہ سرگٹ ختم ہو گئی ہے (ان دنوں میری اسمولنگ بہت بڑھ گئی ہے) اب کیا کروں۔ سرگٹ نہ ہونے کے احساس نے طلب اور شدید کر دی۔ میں نے سوچا، اسٹور قریب ہی تو ہے خود جا کر لے آئی ہوں۔

بس ڈارنگ پھر مجھے اس محبت کی ٹھیک خاک سزا ملی۔ میں لپکتی ہوئی اسٹور میں پہنچی سرگٹ کے پیکٹ خریدے۔ ایک سرگٹ نکال کر سلگائی اور دھواں چھوڑتے ہوئے اپنی پیٹھ تختے لگی کہ میں کتنی بلور ہوں۔ اسی وقت میری نظراس شخص پر پڑ گئی۔ وہ جوان آدمی تھا اور بڑی شدت سے ظاہر کر رہا تھا کہ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہے۔ مگر میں جب بھی نظرس بتاتی تھی تو جسم میں اس کی نظرس پیسے کا احساس ہونے لگتا تھا۔ میں باہر نکلی اور باہنٹی کا ہنٹی قدموں سے گھر کی طرف چلنے لگی۔ حال یہ تھا کہ میرے آنسو بہ رہے تھے۔ میں نے کشور کو بلڈنگ میں داخل ہوتے دیکھا تو ٹیٹنی چلائی اس کی طرف بھاگی۔ لپٹ کر دیکھا تو پیچھا کرنے والا موجود تھا لیکن مجھ سے نظرس چرا رہا تھا۔ کشور لپٹ کر آیا اور میں اس سے لپٹ گئی۔ مجھ پر لرزہ طاری تھا اور پتا ہے، کشور نے کیا کیا؟ اس نے میرا ہاتھ تھا اور براہ راست مجھے اس شخص کی طرف لے

بھی تو سوچ۔ میں ہرگز غیر اہم نہیں ہوں۔ اگر مجھے تمہارا جیون ساتھی بننا ہے تو تمہیں میرے ساتھ دیا ہی برتنو رکھنا چاہیے جیسا میں تمہارے ساتھ رکھتا ہوں۔ مجھے بھی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔ دنیا مجھے کچھ بھی سمجھے مگر تمہارے نزدیک میرے جذبات اور احساسات کی اہمیت بہت زیادہ ہونی چاہیے۔ ورنہ ہم ایک کامیاب جیون ساتھ ساتھ کیسے گزاریں گے۔ اگر تمہارے دماغ میں یہ خیال ہے کہ میں غیر اہم بن کر تمہارے سامنے میں جیون گزار دوں گا تو تم بدترین غلطی کر رہی ہو۔ خیر فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ دراصل مجھے تم پر بہت شرت سے غصہ آ رہا ہے جبکہ میں تمہیں چاہتا کہ جسے میں نے دنیا میں سب سے زیادہ چاہا ہے، اس پر غصہ کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا معذرتوں سے بھرا خط کل مجھے ضرور مل جائے گا۔

بچی اور بوجھل دل کے ساتھ۔

ساترا انجیل



27 مئی 98ء

سونیا

نیند سے محروم ایک پوری رات کے سوچ بچار کے بعد میں مجبور ہو گیا ہوں۔ یعنی جس میں یہ الٹی میٹم دے رہا ہوں کہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر تم نے مجھ سے رابطہ نہ کیا تو میں تم سے ہاتھ دھو لوں گا۔ شاید تم سمجھتی ہو کہ ایک اشارہ ہونے کی حیثیت سے تم اپنے چاہنے والوں کو نظر انداز کرنے کا حق رکھتی ہو۔ جس میں ان کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں لیکن میری بات سنو۔ اشارہ کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ میں بھی ایک طرح کا اشارہ ہوں اور مجھے میرا حق ملنا چاہیے۔ بس سونیا۔ ایک اور دن۔ اتنی ہی مہلت ہے تمہارے پاس۔ تم نے یہ موقع کھو دیا تو پھر مجھے ترستی رہو گی۔ عمر بھر۔ میں تم سے کبھی رابطہ نہیں کروں گا۔

صرف ایک دن اور سونیا۔



ساترا انجیل

چلا۔ میرا دماغ گھوم گیا۔ ہلی ووڈ کی اسپاٹی اور کرائم فلمیں یاد آنے لگیں۔ کیا انشیا کشور مجھے خود اپنے ہاتھوں سے میرے دشمن کے سپرد کر دے گا؟ دونوں ملے ہوئے ہیں شاید؟ مگر پھر مجھے پتا چلا کہ وہ چھپا کرنے والا سادہ لباس میں پولیس والا قتلہ بنے میری حفاظت پر مامور کیا گیا قتلہ۔ بس یہی سبب ہے کہ میں سکون کے مارے بے ہوش نہیں ہو گئی۔

سو میری جان روشن، گنتا ہے پولیس کئی دن سے میری نگرانی کر رہی ہے۔ مجھے سکون تو ملا۔ مگر شرمندگی ایسی تھی کہ نظریں نہیں اٹھائی جا رہی تھیں اور پھر کشور نے جس طرح مجھے بیکر دیا، اسے پولیس میں نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تو مجھے ایک مکمل ڈائریکٹم گنتا ہے۔

اچھا! میں نے بہت دیر تمہارا کندھا استعمال کر لیا۔ اب مجھے رسرسل کیلئے جانا ہے۔ کچھ اداکاروں کو تبدیل کیا گیا ہے۔ کچھ تبدیلیاں اسکرپٹ میں ہوئی ہیں۔ کچھ مکالمے بھی دوبارہ لکھے گئے ہیں۔ امید ہے افتتاحی شمشیں جو کمزوریاں سامنے آئی ہیں، ان کے ڈرامے کی باقاعدہ نمائش سے پہلے دور کر لی جائیں گی۔

بے حد محبت کے ساتھ۔

تمہاری سونیا



29 مئی 98ء

سونیا جان

وہ دن ہو گئے۔ اب بھی جواب سے محروم ہوں۔ اب تمہارے معاملے میں میری قوت برداشت جواب دے رہی ہے مگر اتنی اذیت کے بلوجود بھی میں تمہارے بارے میں برا نہیں سوچتا چاہتا۔ کاش تم دی سونیا ہو، جس سے میں نے عشق کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اب میں تمہاری شخصیت کا دوسرا رخ دیکھ رہا ہوں لیکن یقیناً اسے تاریک رخ نہیں کہا جاسکتا۔ بس تمہاری سوچ شاید بگڑے ہوئے بچوں کی سی ہے، جنہیں بہت زیادہ توجہ ملی ہے۔ وہ دنیا میں کسی اور کو قائل توجہ سمجھتی ہی نہیں۔ بات ٹھیک بھی ہے۔ آخر تم ملک کی سب سے بڑی اداکارہ لیکن سونیا ذرا میری اہمیت کے بارے میں "

28 مئی 98ء

سونیا

افسوس، تم ہار گئیں۔ چلو ٹھیک ہے۔ اب جو ہو گا، اس کی ذمہ داری صرف اور صرف تم ہو گی۔ میں اب وہ بات سوچ رہا ہوں جو شاید کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تم نے مجھے اپنا الو سیدھا کرنے کیلئے استعمال کیا۔ تم نے جھوٹ بولے اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میری معصوم محبت کو اپنے مذموم مقاصد کیلئے استعمال کیا۔ تم جانوروں سے بھی بدتر ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم ایسی ہو۔ تم ایک خود پسند، انا پرست اور بے رحم ہو۔

بہر حال اب نہ تمہیں میری توجہ ملے گی نہ وقت۔ اب اپنے معاملات تم جانو مگر مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہو گا، تم پوری طرح اس کی مستحق ہو۔ میں نے تو سوچا تھا کہ بس ایک دن کے بعد ہماری پرجوش اور عملی محبت کا آغاز ہو گا مگر میں بے وقوف تھا، بلوان تھا۔ تم نے میرے سب خواب چھین لئے۔ میں۔۔۔ ملوہ لوح تھا۔ تمہارے ہاتھوں الو بننا رہا لیکن سونیا بے وقوف بھی جگمگے تو ہیں اور جبکہ جگمگے والا بھی کوئی تم جیسا ہو۔

تمہیں ایک سبق ضرور دینا ہو گا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ضروری ہے۔ اب یہ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ کیا زندگی خود تمہیں اپنی گرفت میں لے کر یہ سبق دے گی یا یہ کلم مجھے اپنے ہاتھوں میں لینا ہو گا اور یہ تم جانتی ہی ہو کہ میں اس طرح کے کلموں میں کتنا ماہر ہوں۔ یقین نہ آئے تو سیما مودی سے پوچھ لو۔ وہ تمہیں بتائے گی کہ میں اپنی توہین کرنے والوں کا، خود کو دکھ دینے والوں کا کیا حشر کرتا ہوں۔

ساحر انجم

28 مئی 98ء

سونیا، میری جان

میں 30 تاریخ کو واپس آ رہا ہوں۔ بس یہی تھا تو سزا سا کلم نمٹاتا ہے اور بس۔ تم مجھے کیڑیڑ اور کلم کی اہمیت پڑھانے نہ بیٹھ جانا۔ بہت ہو گئی۔ تم وہاں پریشان ہو اور

میں یہی کلم کہنے جا رہا ہوں۔ نہ میری یادداشت خراب ہے، نہ ہی میں احسان فراموش ہوں۔ کیا میں بھول جاؤں کہ مجھے یہ کھن ہوا تھا تو کس نے بہتر سے لگ کر میری دیکھ بھل کی تھی۔ وہ تم تھیں؟ اور جب مجھ سے فلم "دور کی آواز" چھنی تھی تو کس نے میرا ہاتھ قلم تھا۔ وہ بھی تم ہی تھیں اور مجھے محبت کرنا، سناٹا کر بیٹنا کس نے سکھایا تھا؟ تم نے اور اب، تمہیں ضرورت ہے تو میں کلم میں الجھا رہوں۔ نہیں، مجھے بھی تمہارے لئے کچھ کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ تم اس سلسلے میں مجھے کوئی پیکیجمرٹ پلاؤ۔ بس میں آ رہا ہوں۔

گھنٹہ کا بھی یہی کہنا ہے اور سونیا کلم سے بچھا چڑھانے کا ایسا موقع کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔

محبت کے ساتھ۔ روشن

28 مئی 98ء

سارہ دیدی

مجھے مبارک باد دو۔ ابھی ڈاکٹر نے آکر خوش خبری دی ہے کہ دو تین دن میں مجھے اسپتال سے رخصت کر دیا جائے گا۔ سچ کتنی ہوں اب تو اسپتال کے اس کمرے کے دروازے پر دیکھ کر میرا دل اگلے لگتا ہے۔

اب ایک اور مسئلہ۔ سونیا ضد کر رہی ہے کہ میں اس کے ساتھ ہی رہوں۔ اس کے گھر۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے سونیا اچھی لگتی ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں لیکن خوشی مجھے اپنے گھر میں مل سکتی ہے وہاں میں اکتو سے رہ سکتی ہوں۔ یہ بات میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کھل ماننے والی ہے۔ وہ تو انسپکٹر کشور رانا نے مجھے بچا لیا۔ اس نے سونیا سے کہا کہ موجودہ صورتحال میں یہ مناسب نہیں ہو گا کہ میں نے اس سے وچ پوچھی تو وہ گل گیا۔

میرے چہرے پر پٹیاں ابھی ایک ماہ اور رہیں گی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں کسی اہرام سے نکلی ہوئی گئی لگ رہی ہوں۔ خوبصورت تو میں پہلے بھی نہیں تھی اب نہالے کیا ہوا ہو گا بس ڈراؤنی نہ لگوں۔ باقی مجھے کوئی فکر نہیں۔

25 مئی 98ء

یا

ایک خط اور سہی حمیس شاید احساس بھی نہیں کہ میں تم پر کتنا وقت اور پیسہ
 بلیغ کر رہا ہوں لیکن کوئی بات نہیں احساس فراموشیوں سے ایسی امید رکھنی بھی نہیں
 آئے۔ غور سے سن لو۔ انوار گرم ہے کہ ایک خند تمہارے لئے روانہ کیا جا رہا ہے۔
 اب حمیس تنبیہ کر رہا ہوں میرا مشورہ ہے کہ اب ہر پیکٹ کو بہت احتیاط سے کھولنا
 ہر مطلب سمجھ رہی ہو نہ میں نہیں چاہتا کہ حمیس کچھ ہو۔ یا چاہتا ہوں۔
 ایک سابق دوست

دوہا بھائی تو ٹھیک ہیں نہ بچوں کو پیار۔

تمہاری بہن۔ سیما

25 مئی 98ء

احسان فراموش کیا

پریشان ہو؟ میں کی چاہتا ہوں کہ تم پریشان اور فکر مند رہو اور یقین کرو،
 حمیس پریشان ہونا بھی چاہئے۔ حمیس مظلوم نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوئے والا ہے۔
 ایک بات بتاؤ یہ جو تمہارا چہرہ ہے۔۔۔ حسین چہرہ جس نے حمیس شہرت کی بلندیوں پر
 پہنچایا ہے، اگر اس کا شہر بھی سیما کے چہرے جیسا ہو تو کیسا رہے گا مگر میرا پروگرام تو
 سیما سے بھی آگے کا ہے۔

بھئی لطف آ جائے گا! میں تو سوچ سوچ کر ہی خوش ہو رہا ہوں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم اس سلسلے میں کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔ تم
 پولیس سے مدد مانگو گی تو حمیس ان کو بہت کچھ بتا پڑے گا یہ بھی بتا پڑے گا کہ سیما
 پر حملے میں تم بھی ملوث تھیں۔ شریک جرم تھیں۔
 والہ۔ کیا چوہین ہے۔ مجھے تو لطف آ رہا ہے۔

ایک سابق دوست

25 مئی 98ء

دشمن جان

میں نہیں چاہتی کہ تم ممبئی والیں آؤ۔ ٹھٹھے دل اور دماغ سے سنو۔ میں
 نہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پہلی بات یہ کہ اب تم سکتی تھو۔ تمہارا اپنا
 گھر ہے، ازدواجی زندگی ہے۔ میں حمیس کسی بھی طرح کا نقصان پہنچنے نہیں دیکھنا
 چاہتی۔ دوسری بات یہ کہ میں یہاں تنہا نہیں ہوں۔ ایک پولیس والا ہر وقت میرے
 ساتھ رہتا ہے۔ سیما اور دوسرے دوست ملجھتے ہیں۔ میں اکیلی تو نہیں ہوں۔

اور اب اصلی بات بھی سن لو میں نے ساری زندگی دوسروں کو اپنی زندگی میں
 جبری کردار کرنے کا موقع دیا ہے۔ کبھی کسی کو حرکت دیتی۔ اولیت نہیں دی۔ تم خوب

30 مئی 98ء

سونیا! میری جان

تم نے کبھی یہ بات نہیں کبھی کہ تم کبھی کسی کی مقروض نہیں رہیں۔ محبت بھی جتنی تمہیں ملی، تم نے کم از کم اتنی ہی دی بھی۔ ٹھیک ہے جان، میں نہیں آؤں گا۔ تم خوش رہو لیکن ارادہ بدل جانے تو کسی وقت بھی فون کر کے مجھے طلب کر لیتے۔ اور ہاں، زندگی اگر تمہاری توقع سے مختلف ہے تو صرف اس لئے کہ دنیا احمقوں سے بھری پڑی ہے اور ان میں ایک احمق میں بھی ہوں۔

محبت کے ساتھ۔ تمہارا اپنا روشن

○

30 مئی 98ء

ڈیئر سونیا

ابھی مجھے ایک بہت بڑی غلطی کا احساس ہوا۔ بہت بڑی زیادتی کا اور مجھے اس کو تلسی پر بڑی شرمندگی ہے۔ مجھے تمہارے ڈرامے کے اختتامی شو کے موقع پر تمہیں کوئی زبردست تحفہ بھیجتا چاہئے تھا۔

ان دنوں تمہیں بہت زبردست بن رہی ہیں۔ آتھیں اسلئے کی ترقی کا دور ہے یہ لیکن میں سوچتا ہوں، زہر زیادہ منسوب رہے گا مگر ٹھہرو۔ ذرا سوچنے دو۔ تم جیسی شخصیت کیلئے کیا تحفہ ہونا چاہئے؟

ارے ولو۔ ہاں، یہ ہوئی نا بات۔ شہدار تم تک یہ خط پہنچے گا تو تم میرا تحفہ بھی وصول کر چکی ہو گی۔ کاش تمہیں پسند آئے۔ اچھا۔ اللوع۔

ایک سابق دوست

○

جانتے ہو کہ میں کچ کدہ رہی ہوں۔ میں نے اپنی ازدواجی زندگی میں تمہاری بلا دستی کبھی قبول نہیں کی۔ کی ہوئی تو ہم آج بھی ساتھ ہوتے۔ علیحدہ نہ ہوتے۔ اب میں چالیس سال کی ہو چکی ہوں اور زندگی دیکھی بالکل نہیں، جیسا میں اسے چاہتی تھی۔ اب اتنی عمر گزار کے خود کو تبدیل کرنا آسان نہیں لیکن باقی زندگی سے طمانیت اور خوشی حاصل کرنے کیلئے یہ ضروری ہے۔ مجھے خود کو تبدیل کرنا ہو گا۔ سو میں کر رہی ہوں۔

مجھے خوشی ہے تمہارے ممبئی آنے کے اصرار پر یہ تمہاری بے پناہ محبت کا ثبوت ہے۔ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں لیکن میں پرانے معمول جاری رکھنا نہیں چاہتی۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔ اب میں خود غرضی سے کام لیتا نہیں چاہتی۔ تمہیں ضرورت کے وقت اپنا کھیلے بنا لوں، یہ خود غرضی ہی تو ہے۔

آج میں اور کثور، سیما کو اس کے کمرے لگے۔ ایک نرس کے مستقل طور پر اس کے ساتھ رہنے کا بندوبست کر دیا ہے۔ ملازمہ تو ویسے بھی اس کے ساتھ رہتی ہے۔ میں پہلی بار سیما کے گھر گئی تھی۔ وہاں جا بجا اس کے مرحوم شوہر کی اور میری تصویریں دیوار پر آویزاں ہیں۔ جیسے وہ مجھے بھی اپنی جیسی ممبر سمجھتی ہو۔ میں جانتی ہوں کہ اس نے بیشہ مجھے اپنے گھر کا فرد سمجھا ہے مگر پھر بھی تصویریں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔

اب اس منحوس شیطان کا خط تقریباً ہر روز آ رہا ہے۔ کثور کے خیال میں یہ اچھی علامت ہے۔ میں اب بھی ان خطوں کو پڑھنے سے ڈرتی ہوں۔ (کثور مجھے پڑھنے کی اجازت بھی نہیں دیتا) کثور سے مجھے بھی انیسیت ہو گئی ہے۔ وہ اپنے فرض سے بڑھ کر میرا خیال رکھتا ہے۔ اچھا آدی ہے۔

تمہارے لئے محبت۔ محبت۔ محبت۔

سونیا

○

31 مئی 98ء

روشن

یہ سب کچھ بے حد خوفناک ہے۔ بہت ڈراؤناں پتا نہیں، اس معاملے کے ختم ہونے تک میں اپنے اعصاب پر قابو بھی رکھ سکوں گی یا نہیں۔ اؤوہ۔۔۔ تمہاری سمجھ میں کیسے آئے گا کہ میں اعصابی طور پر اتنی شکست ہو رہی ہوں کہ اصل بات بتائی نہیں اور شروع ہو گئی مگر کیا کروں؟

کل شام میں میٹر میں اپنے ڈرائیگ روم میں گئی تو دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔ کسی نے وہاں وہ توڑ پھوڑ۔۔۔ وہ جتنی چٹائی تھی کہ کوئی چیز سلامت نہیں تھی۔ ڈرائیگ ٹیبل کا آئینہ چور چور ہو چکا تھا۔ دروازوں کی تمام چیزیں ٹکری ہوئی تھیں۔ کسی نے پوری طبیعت سے اپنی دھشت نکالی تھی اور کسی نے کیا۔ یہ وہی تھا۔ وہی شیطان۔ پولیس جھوٹ بولتی رہی۔ مجھے بتلائی رہی۔ میں سمجھ گئی ہوں اس کے خطوں میں میرے لئے محبت نہیں ہوتی تھی۔ ہرگز نہیں۔ میں نے کشور رانا کی خبر لی۔ اس نے تردید کی مگر نہیں کہہ سکا وہ کہنے لگا ہم یہی تو چاہتے ہیں۔ کہ وہ تمہارے قریب آئے اور ہم اسے دھریں۔ میں نے کہا۔ تو پھر آج ڈرائیگ روم میں تم نے کیوں نہ چکڑا لیا اسے۔

میں جان گئی ہوں کہ اب وہ مخوس میری جان لینا چاہتا ہے۔ وہ کوئی بلا ہے روشن۔ شیطان ہے شاید۔ کاش! مجھے اس کا پتا معلوم ہو تا مگر وہ سمجھتا ہے کہ مجھے معلوم ہے۔ میں بہت خوفزدہ ہوں روشن۔ بہت زیادہ۔ کہیں خوف سے ہی نہ مر جاؤں۔

تمہاری سونیا

31 مئی 98ء

روشن

یہ کیس ہمارے لئے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس ساحر انجمن کو اب تک گرفتار ہو چاہئے تھا۔ تم اور کچھ آدمی بھی اس کیس پر لگا دو۔ اب تو بہت اوپر سے دیکھ ڈالا جا رہا ہے ہم پر۔ میٹر کی چوٹیں گھنے گھرائی کا بندوبست کرو اور سیما مودی کے گھر کے پاس بھی سلہ لباس والے پھیلا دو۔ ممکن ہے وہ دوبارہ اس پر حملہ کرنے کی ہشش کرے اور کشور رانا کو تلاش کر کے رابطہ کرو۔ اس سے کہو کہ فوراً فون پر مجھ بات کرے۔

کشف پولیس

31 مئی 98ء

روشن

کو کچھ جی خوش ہوا تمہارا؟ مجھے افسوس ہے کہ تحفہ ملنے کے موقع پر تمہارے تاثرات تھے، مجھے دیکھنے کا موقع نہیں ملا مگر تم جانتی ہو کہ ان دنوں میری مصروفیت زیادہ ہے۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے اور یہ سب کچھ میں تمہارے ہی لئے کر رہا ہوں۔ سب کچھ بہت تھکا دینے والا ہے مگر تم فکر نہ کرو۔ تمہارے لئے تو میں ہر حال وقت نکال سکتا ہوں۔ آج کل میں ایک اور تجھے کے بارے میں غور و فکر کر رہا ہوں۔ یہ تحفہ دینا تو نعمت کا ہو گا۔ ایسا تحفہ زندگی میں بس ایک بار ہی مل سکتا ہے۔ تمہارا لگا سکتی ہو اس کے بارے میں؟ ہاں۔۔۔ تم ٹھیک سمجھیں۔ اب میں تمہیں قتل

وہاں جاؤ

سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں کیا انتظامات کرنے ہیں؟ تم کسی سنسنلے سے بھی نہیں گزرتیں اور پھر تمہارے ساتھ ہلائی ہلائی گاڑی بھی ہوتے۔ وہ ذلیل پولیس والا۔

بہر حال تم فکر نہ کرو میں کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لوں گا۔ تم مجھے کسی بھی ج روک نہیں سکتیں۔ اب تک تم یہ تو سمجھ چکی ہو کہ میں کوئی عام آدمی نہیں

او کا جائزہ لیا۔ دوڑیں لگی راتفل کی قیمت کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟ گلو، گلتا ہے
میں سونے سے بنی ہوئی ہے پوری کی پوری۔ میرے تو ہوش اڑ گئے قیمت سن کر۔
ایک ہتھول نظر آیا جو میری قوت خرید کے اندر تھا۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ اس سے
تفادہ کے لئے تمہارے بہت قریب جانا پڑے گا۔ دور سے تو میں تمہیں قتل ذکر
میں نہیں پہنچا سکوں گا اور قریب جانے میں اس پولیس والے سے ٹکراؤ لازمی ہو
ئے گا۔

ایک تنبیہ بھی کر دوں اگر تم پولیس کو میرا پتا بتانے کا سوچ رہی ہو تو بہتر ہے
میں تمہیں خبردار کر دوں۔ میں پوری دنیا کی تباہی کا کہ تمہاری سیکریٹری کے
ہو جو کچھ ہوا اس کا منصوبہ تم نے بنایا تھا۔ میں تو محض آلہ کار تھا تمہارا۔ اور اس
مصلے میں تم نے مجھے جہلانی قربت سے نوازا تھا۔ میرے اس بیان کے بعد تم
بائے موت سے نہیں بچ سکو گی۔ یقین کرو، پھانسی بہت انتہا تک موت لاتی ہے۔
اب ہے، مجھے چند سال کی سزا ہو جائے گی مگر تم تو پھانسی کے تختے پر ہی پہنچ کر رو
کھو پھانسی کے مقابلے میں میری دی ہوئی موت ہے حد آسان اور رحم دلانہ ہو گی۔
اور پھر یہ بھی ہے کہ کون جانے میں تمہیں مارنے کا ارادہ ہی بدل دوں۔ یہ
لہن تو نہیں۔ آخر میں تم سے محبت کرنا تھا کبھی۔ سوچتی رہو۔
ایک سابق دوست

ہوں۔ جینس ہوں تو یہ بھی سمجھ لو کہ میرا طریقہ بھی خاص اہمیت کا ہو گا۔ تم انتظار
کرتی رہو۔

ایک سابق دوست

31 مئی 98ء

ڈیئر ہیری راج

امید ہے، تم اور شینا خیمت سے ہو گے۔ تمہیں یقیناً پچھلی بار سونیا سے اور مجھ
سے نہ ملنے کا اب تک افسوس ہو گا۔ مجھے بھی ہے لیکن میرا وعدہ ہے کہ اگلی بار تم آؤ
گے تو تمہاری آرزو ضروری پوری ہو گی۔

یار ہری، ایک مسئلہ آج پڑا ہے۔ سونیا ایک ڈرامے میں کالم کر رہی ہے۔ اس کا
کروار ایک جاسوس کا ہے۔ اس کیلئے ایک پرانے مگر بھاری ہتھول کی ضرورت ہے۔ تم
تو جانتے ہو کہ آج کل اسلحہ اور طرح کا ہین رہا ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا مگر ہتھول
نہیں ملا۔ آج صبح مجھے یاد آیا کہ تمہارے پاس پرانے طرز کا ایک ہتھول تھا۔ اگر وہ
اب بھی کالم کر رہا ہے تو تم برائے مہربانی مجھے وہ بھجوا دو۔ دراصل ڈائریکٹر اصلی ہتھول
کے استعمال پر بعد ہے۔ تم ہتھول بھجوا دو تو ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں شکریہ
ہوں گا۔ اگلی بار سونیا کے گھر پر دعوت کا انعام بھی پکاؤ؟ اوکے؟

میں جواب کا شکریہ ہوں۔

تمہارا دوست۔ سائر انجیل

یکم جون 98ء

سونیا کزن

تھک کر چور ہو گیا ہوں۔ بہت تھکا دینے والا کالم ہے، کون سا کالم؟ نہیں
سمجھیں؟ ارے بھی یہی کہ تمہیں کیسے قتل کیا جائے۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں کیا
کرنا چھو رہا ہوں تاکہ تم میری کوششوں کو سراہ سکو۔ آج میں باہر نکلا اور تمہاری خاطر

3 جون 98ء

ساحر میرے دوست

مجھے افسوس ہے، وہ ہسپتال تو میرے بیاہ کے ہنگامے میں ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ تمہارے خط کے بعد میں نے اس کی تلاش میں پورا گھر چھان مارا۔ ٹینا بھی بلکان ہو گئی مگر ہسپتال میں مل سکا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ممبئی جیسے شہر میں ہسپتالوں کی کیا کمی؟ بہت پرانے ہسپتال نوادرات کی دکان پر بھی مل سکتے ہیں۔ خیر، میری خواہش ہے کہ یہ ڈراما بھی کامیاب رہے۔ اب تو تم بڑے آدمی ہو گئے ہو۔ یار مجھے بھول نہ جاؤ۔

تمہارا دوست۔ ہری رام

3 جون 98ء

روشن ڈارنگ

فون پر اتنا وقت دینے کا شکریہ۔ مجھے احساس ہے کہ میرا بار بار فون کرنا تمہارے لئے پریشان کن ہو گا لیکن کیا کروں۔ ایک تمہاری آواز سن کر ہی تو حوصلہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر کی دی ہوئی نیند کی گولیاں ہیں۔ میرا خیال ہے، میں دونوں کو ضرورت سے زیادہ ہی استعمال کر رہی ہوں۔

روشن! اب میں سوچتی رہتی ہوں۔ ہم ساتھ تھے تو ہمارے پاس کیا کچھ تھا۔ اور کیا کچھ نہیں تھا۔ میں ایک اعتراف کرنا چاہتی ہوں میری جان۔ ایک ایسی بات جو فون پر مجھ سے ہی کی نہیں گئی۔

وہ جو تمہارا ایکسٹرا کرل کے ساتھ چکر چلا تھا، میں ابتدا ہی سے اس سے واقف تھی۔ تم کہتے ہو کہ اب اور کمال اس سے ملے، مجھے معلوم تھا کہ تم نے جو دو دن اس کے ساتھ شملہ میں گزارے، ان کا بھی مجھے اس وقت علم تھا۔ تمہیں یاد ہے کہ تم شملہ سے واپس آئے تو میں نے کیا کیا تھا؟ میں نے تمہیں تحائف دیئے تھے۔ میں تمہارے ساتھ بہت محبت سے، 'میرانی' سے، 'اچھی طرح پیش آئی تھی۔ کیوں؟ اس لئے نہیں کہ مجھے تمہیں کھو دینے کا خوف رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ تم اس سے نہیں بچو گے۔

محبت کرتے ہو۔ میں تمہیں ہرٹ کرنا چاہتی تھی۔ تمہارے احساس جرم کی آگ کو اور بھڑکانا چاہتی تھی۔

روشن، مجھے معاف کر دو۔ میں جانتی ہوں کہ تم اس پر کیوں ملتفت ہوئے تھے اس لئے کہ میں تمہاری عزت نفس کو روندتی تھی۔ تمہاری مرواگی کو ٹھیس پہنچاتی تھی۔ میں تمہیں آسودگی نہیں دیتی تھی جو میرا فرض تھا۔ بس میں نے تمہارے ساتھ ایک ہی بھلائی کی۔ اور وہ یہ کہ تمہیں آزاد کر دیا۔ اچھا کیا؟ اب اس کے نتیجے میں تم ایک اچھی، باعزت اور خوشیوں بھری زندگی گزار رہے ہو۔ تمہیں وہ سب کچھ مل رہا ہے جو میں تمہیں نہ دے سکی اور میں اس میں خوش ہوں۔ تمہاری خوشی میں۔

یہ نیند کی گولیاں بڑی عجیب چیز ہیں۔ پتا ہے جو میں لکھ رہی ہوں وہ پڑھ نہیں پا رہی ہوں۔ یہ ذہن کی سلیٹ کو ہر تحریر سے صاف کر دیتی ہیں۔ سنو اب اس شیطان کو میں سمجھنے لگی ہوں۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھ پر ہسٹل کے دورے نہیں پڑتے۔ میں جان گئی ہوں کہ وہ کیا کرے گا۔ آج کشور کسی کام سے کمرے سے نکلا تو میں نے اس کی بجٹ کی جیب میں رکھے ہوئے خطوں میں سے ایک نکال کر پڑھ لیا۔ اس نے صاف لکھا ہے کہ وہ مجھے قتل کرے گا۔ میں نہیں سمجھتی کہ کوئی اسے روک سکتا ہے۔ عجب بات یہ ہے کہ مجھے اس کی کوئی پروا بھی نہیں۔ شاید میں اتنے طویل عرصے سے خوفزدہ رہی ہوں کہ احساس بھی ختم ہو گیا ہے اور زندگی کوئی اتنی بھاری چیز بھی نہیں کہ میں اسے بچانے کی جدوجہد کروں۔ بہتر یہی ہے کہ میں زندگی کا بھی پیچھا دیئے ہی چھوڑ دوں، جیسے تمہارا چھپا چھوڑا تھا۔

کاش، مجھے نیند آ جالیا کرے۔ کاش میں اس ڈرامے کو چھوڑ سکوں۔ اگر یہ ڈراما ختم ہوا اور میں پھر بھی زندہ ہوئی تو میں کچھ کروں گی۔ یہ نہیں پتا کہ کیا کروں گی مگر کچھ ایسا کروں گی کہ بچی کچی زندگی بھرانداڑ میں گزرے گی۔ شاید میں یہ بھی سمجھ لوں کہ میں نے اتنی آرزوئیں کیوں کی تھیں۔ اور پتا کچھ بھی نہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ سوری ڈارنگ! میں پھر خود ترسی کا فکرا ہو رہی ہوں۔ ایسے میں اپنا آپ بہت بد صورت لگتا ہے۔

تمہاری بھرم۔ سونیا

4 جون 98ء

لیٹر ہری رام

اب تم فکر نہ کرو تھوڑی سی جدوجہد کے بعد پرتول مجھے مل گیا ہے۔ اس اتوار کوئی وی پر میرا نیا ڈراما دیکھنا نہ بھولنا۔

ساحر انجم

○

5 جون 98ء

میری جلی سونیا

تم کیوں بلاوجہ کا احساس جرم اٹھائے اٹھائے خود کو بلکن کر رہی ہو۔ جو کچھ ہوا اس میں تم قصور وار نہیں تھیں۔ قصور وار میں تھا۔

سنو اس ایکسٹرا گرل کے ساتھ میرا کوئی انٹیر نہیں تھا۔ ہاں میں نے تمہیں یہ قین والے کی کوشش ضرور کی تھی کہ کوئی چکر ہے مقصد بچکانا تھا۔ تمہاری توجہ حاصل کرنا تھا۔ تم نے ایک نئی فلم سائن کی تھی اور دو دن کے لئے آؤٹ ڈور شوٹنگ پر جا رہی تھیں۔ جبکہ میں تم سے دوری نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سوچا شاید رقیبت میں جلا ہو کر تم وہ فلم چھوڑ دو۔ یہ تھی اصل بات۔

ہماری شادی بھڑی تو صرف ایک وجہ سے۔ میں تمہارے قتل نہیں تھا لیکن سونیا میں تم سے محبت کرتا تھا۔ اب بھی کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ یہ وہ حقیقت ہے جو بھی نہیں بدلے گی۔ ہو سکے تو مجھے میری غلطیوں پر معاف کر دینا۔

تمہارا اپنا صرف تمہارا روشن

○

6 جون 98ء

سارہ دیدی

ڈاکٹر میری کنڈیشن سے پوری طرح مطمئن ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ نومبر سے پہلے پلاسٹک سرجری نہیں ہو سکتی۔ موسم گرما کے لئے وہ مجھے ایک خاص قسم کا ماسک

4 جون 98ء

انسپیکٹر کشور رانا

ہم کبھی ملے تو نہیں ہیں لیکن ہمارا ایک دوسرے سے تعلق ضرور ہے اور وہ تعلق سونیا کرن کے حوالے سے ہے۔ میں وہ شخص ہوں جس نے سیما موہی پر چاقو کی دھار آزمائی تھی۔ سچ یہ ہے کہ اب مجھے اپنی اس بے رحمی پر پچھتاوا ہوتا ہے لیکن اس سلسلے میں بے شمار ایسے خالق ہیں جن کے بارے میں تمہیں کچھ علم نہیں۔ باہر سے دیکھنے والے کو اندر کی صورت حال کا کمال پتا چلتا ہے؟ بہرحال خالق صرف میں جانتا ہوں۔

اب ہم اس وجہ کی طرف آتے ہیں جس کی خاطر میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں اپنے گرد چھائی ہوئی شکوک و شبہات کی دھند صاف کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں اس سلسلے میں تمام خالق بتا دوں لیکن وہ میں تمہیں اس خط میں نہیں لکھوں گا۔ یہ سب باتیں تو دیو دی ہو سکتی ہیں۔

اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں کہ تمہیں اپنا پتا بتاؤں تاکہ تم آؤ اور میری سنے بغیر مجھے گرفتار کر لو اس لئے میں تم سے ایک درخواست کر رہا ہوں۔ شانتی مگر کے چوراہے پر ایسٹ روڈ والی سائڈ پر ایک ٹیلی فون بوتھ ہے۔ اس کا نمبر آج میں نوٹ کر چکا ہوں۔ میری تجویز یہ ہے کہ 8 تاریخ کو سہ پہر تین بجے تم اس بوتھ میں میری کل کا انتظار کرو۔ میں تین بج کر میں منٹ پر تمہیں کل کروں گا۔ واضح رہے کہ تین بجے بہرحال میں وہاں پہنچ جاؤ پھر میں تمہیں وہ سب بتا دوں گا جو تم جانتا چاہتے ہو۔

اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ 8 جون کو تین بجے۔ یاد رکھنا۔

”وہ“ تم جس کی تلاش میں ہو

○

جوہو پولیس اسٹیشن
کمل

کشنر صاحب کا حکم ہے کہ تمہیں کشور رانا کی جگہ ڈیوٹی سنبھالنی ہے۔ نگار
لپارٹمنٹس میں سونیا کرن کے گھر۔ کشور رانا چند دنوں میں واپس آ جائے گا تو تم فارغ
ہو جاؤ گے۔ اس کی ٹانگ کا زخم سرس نہیں۔ گولی گوشت کو چھو کر گزری ہے۔
ولسن

○

9 جون 98ء

روشن جلیں

میل تو بڑی بھری ہے۔ پہلے سیما میری نعمت کی لپیٹ میں آئی اور اب انسپٹر
کشور رانا کی باری آگئی۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس شیطان نے کشور پر گولی
ٹیلی فون بوجھ میں کیسے چلائی۔ اور پھر بچ بھی نکلا۔ روشن مجھے تو وہ انسان نہیں، کوئی
بد روح لگتا ہے۔ برصائل اب مجھے لپارٹمنٹ سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ نہ میں
رہسرل کیلئے جا سکتی ہوں، نہ سیما کی مزاج پر کی کو مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں
باقی ہوں کہ میں مرے والی ہوں۔

تم سیما کو میل نہ رہنے دینا اس کی بہن کی طرف بھجوا دینا۔ اب میں سونا
پااتی ہوں۔ اس معاملے کے انجام تک پہنچنے تک ہر روز تمہیں خط لکھوں گی۔

اور یہ تم نے کیا لکھا کہ میں تمہیں معاف کر دوں! غلطی تمہاری نہیں، میری
تمہی۔ برصائل۔

تمہاری دیوانی۔ سونیا

○

بنا کر دیں گے۔ سونیا نے کہہ دیا ہے کہ اخراجات کی بالکل پروا نہ کی جائے۔ وہ بہت
مہیاں اور اچھی عورت ہے۔

زندگی بہت عجیب ہو گئی ہے۔ اب تو میل ہر وقت ایک پولیس والا موجود رہتا
ہے۔ عجیب صورت حال ہے۔ میل میں ہوں، نرس ہے اور پولیس والا ہے۔ ادھر سونیا
ہے اور اس کا بھی ایک پولیس والا ہے، کیسا عجیب گروپ بن گیا ہے لیکن اب ایسا لگتا
ہے کہ یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ وہ دیوانہ پرسوں سونیا کے پولیس والے سے فون پر
بات کرے گا شاید وہی کچھ بتائے گا کہ سونیا کے کہنے پر اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔
ہے نا پاگل۔ سچ پوری طرح دماغ چلا ہوا ہے اس کا۔ برصائل پاگل ہونا بھی اچھا ہی ہے۔
شاید پولیس والوں کی باتوں میں آسانی سے آ جائے۔ وہ اسے یہ سمجھانے کی کوشش
کریں گے کہ اگر وہ سونیا کے خلاف سرکاری گواہ بن جائے تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔
ویسے سونیا کا پولیس والا زبان کا بہت تیز ہے۔ کسی کو بھی قائل کر سکتا ہے۔

دیوی، سونیا کا بہت برا حال ہے۔ وہ ڈرائے کو ملتی کرنے کے لئے بھی تیار
نہیں ہے۔ ہر وقت یہی باتیں کرتی ہے کہ لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ بھی اچھا نہیں
رہا اس نے بہت لوگوں کو مایوس کیا ہے۔ یہ اسی کی سزا مل رہی ہے۔ اب وہ نہ تو
خینڈ کی گولیاں چھوٹی ہے اور نہ کوئی معقول بات سمجھتی ہے۔ میرا دل دکھتا ہے اس
کے لئے۔

اچھا دیوی دعا کرنا ہمارے لئے۔ بچوں کو پیار دینا۔

تمہاری بہن۔ سیما

○

9 جون 98ء

سونیا کرن

میں نے اخبار میں پڑھا کہ تمہاری جگہ سسرسل زمیں چیل کر رہی ہے۔ یہ کیا؟ تم اتنی خوفزدہ ہو کر اپنے کیہ بڑی فکر بھی بھول گئیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارے دوست پولیس والے کو ختم کر دیا۔ وہ ہر وقت تم سے چپکا رہتا تھا۔ اس کی موت سے میں نے تم پر ثابت کر دیا کہ مجھے کوئی روک نہیں سسک سکا۔ ہم بہت آسان قتل میں ایک دکان کی بچی چھت پر چڑھ کر اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ آیا اور میں نے اسے شوٹ کر دیا مگر پتا نہیں کیوں اس کی موت کی خبر چھپائی جا رہی ہے۔ اخبار میں بھی نہیں تھی۔

رات میں نے پھر تمہیں خواب میں دیکھا۔ اس خواب میں تم نے مجھے بار بار اپنی قیمت سے نوازا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ تم نے مجھ سے کہا کہ تم نے میری ہر حرکت کو معاف کر دیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں نے جو کچھ بھی کیا، تمہاری محبت میں کیا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم اب بھی میرے لئے محبت کی علامت ہو۔ حالانکہ تم ہرگز محبت کے قاتل نہیں ہو۔ بہر حال تم فکر نہ کرو جلد ہی میں تمہیں قتل کر دوں گا۔

فقط تمہارا ہونے والا قاتل

10 جون 98ء

روشن چلن

اب مجھ پر ایک نرس بھی مسلط کر دی گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ نیند کی گولیوں میں بھی گریز ہے۔ نرس مجھے ایک گولی دیتی ہے مگر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ نیند آ بھی جائے تو وہ جاگنے سے زیادہ لڑکتا ٹاک ہوتی ہے۔ بار بار اچھتی ہوئی نیند۔ میری مٹی جی مرنے سے پہلے آنکھیں پھاڑنے لگتی تھیں۔ باہر نکلتی رہتی تھیں۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ ہر وقت کھڑکی سے باہر دیکھتی رہتی ہوں۔ بلندی سے دیکھنے پر یہ شہر کتنا خوبصورت نظر آتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، کبھی میں بھی بہت خوبصورت تھی، اور تم بھی بہت اچھے تھے۔ قریب سے دیکھنے پر بھی۔

نرس مجھے ایک جام بھی نہیں پئے دیتی۔ ایک وقت میں نیند کی ایک گولی دیتی ہے۔ ہاں، وہ چائے بنا کر دیتی ہے۔ وہ بھی سبز۔ کیسی عجیب بات ہے۔ سبز چائے۔ ایک بہت بڑی اداکارہ اور سبز چائے۔ رشتن، اب میں خوفزدہ بالکل نہیں ہوں۔ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ خوفزدہ نہ ہونا میں تو ہمیشہ سے خوف کا شکار رہی ہوں۔ تمہیں یہ پتا ہے۔ چھوٹی سی تھی تو ڈر کے مارے گھنٹوں کونوں کھدروں میں چھپی رہتی تھی لیکن اب میں خوفزدہ نہیں ہوں۔

تمہاری سونیا

○

○

ہاپ سامنے آگیا تو ملنے والے تم سے گھبرا کر بھاگ جائیں گے۔ اسی خیال سے تم نے پیشہ خود کو قید کر کے۔ چھپکے رکھا اور شاید اسی لئے تم وہ سونیا بن گئیں جو اب و مگر سونیا، میں پیدا کرنے والے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم میں ایسی کوئی بات نہیں کہ تم منہ چھپاؤ۔ تم کسی سزا کی مستحق نہیں۔ تم نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ پلیز۔ لوہ پر رحم کرو سونیا۔ مجھ پر رحم کرو۔ نیند کی گولیاں زیادہ مت لو۔ یہ بہتہ نقصان دہ ہیں۔ اور سنو۔ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ تم تصور میں بھی نہیں سوچ سکتیں۔

تمہارا اپنا صرف تمہارا۔ روشن

11 جون 98ء

مدرسہ

نیند مجھ سے خفا ہے۔ رات میں پورے پارٹمنٹ میں چکراتی پھری۔ کسی درود کی طرح۔ ٹھوکر لگی، کل دان گرا تو پولیس والا جاگ گیا اور وہ اترھا دھند ریوالور لے کر جھیل ریوالور لے کر۔ ہے نا عجیب بات!

روشن اب میں یہاں نہیں رکوں گی۔ کچھ بھی ہو، مجھے پروا نہیں۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ لوگ مجھے جانے نہیں دیں گے۔ میں نے سوچا ہے کہ رات کو کل جاؤں گی۔ جب نرس بھی سو رہی ہوگی اور پولیس والا بھی۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ مجھے مکمل جانا ہے، مرنے سے پہلے میں کیا دیکھنا چاہتی ہوں۔ روشن، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اچھا الوداع۔

تمہاری اور صرف تمہاری۔ سونیا

10 جون 98ء

سونیا کلن

ایک اور ویسا ہی خواب۔ اس سونیا کا جو تم سے پہلے ہوا کرتی تھیں۔ نرم، مہین، محبت کرنی والی۔ خواب میں ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے۔ تم نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ قائم کر چھپتھپایا اور کلمہ۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تمہاری آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ میں کیا بتاؤں۔ جو کچھ ہمارے ساتھ، ہمارے درمیان ہوا مجھے اس پر یقین نہیں آتا۔ دکھ ہوتا ہے۔ بہت۔ میں ایک ایسی بہتی سے شدید نفرت کرنے پر مجبور ہوں جس کو میں نے دنیا میں سب سے زیادہ چاہا ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں نے جسیں مجھے میں غلطی کی ہو۔ ممکن ہے کہ تم نے مجھے خط لکھنے کے بارے میں سوچا ہو اور یہ سوچ کر نہیں لکھا کہ کہیں اس خط کے ذریعے دشمن مجھ تک نہ پہنچ جائیں۔ میں شلوک میں۔ ادہام میں گھر گیا ہوں۔ کاش! تم سے ملنے کا۔ بات کرنے کا موقع مل جائے خود تمہارے منہ سے حقیقت سن لیتا اگر میں غلطی پر ہوں تو کیا کر سکتا ہوں؟ تم کبھی مجھے معاف نہیں کرو گی؟ سونیا۔ جتنی مجھے جینے کی خواہش ہے، اس سے زیادہ دوبارہ تم سے محبت کرنے کی خواہش ہے۔

سارا انجیل

11 جون 98ء

سونیا جان

میرے لئے کبھی اپنے محسوسات کا بیان، اپنے جذبات کا اظہار آسان نہیں رہا۔ لیکن اب مجھے اس کی ایک بھرپور کوشش کرنی ہے۔ میں تمہارے لئے خوفزدہ ہوں۔ میری زندگی صرف اس باگل وحشی کی طرف سے لاحق خطرے کی وجہ سے نہیں بلکہ تمہارے اندر موجود ایک چیز کی وجہ سے بھی۔ ایک ایسی چیز جو ہمیشہ سے تمہارے اندر رہی ہے لیکن اب دھماکہ خیز مد تک بڑھ گئی ہے۔

وہ چیز ہے سونیا کہ تم ہمیشہ اپنے محسوسات کو چھپاتی رہی ہو۔ ان پر پردہ ڈال کر ان کا رنگ بدلتی رہی ہو۔ تم خود کو چھپاتی رہی ہو۔ یہ سوچ کر کہ اگر تمہارا اصلی

12 جون 98ء

محترم روشن چاؤگلہ

سونیا غائب ہو گئی ہے تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہو گی؟ میں بہت فکر مند ہوں۔ کوشش کی تھی مگر تم سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ فوراً فون کر دیا پلیز۔

ساحر انجمن



13 جون 98ء

میرے روشن

میں کلیا پ ہو گئی اور اب میں اکیلی ہوں۔ یہاں تھلائی ہے اور سکون ہی سکون۔ شام کو میں ساحل پر چلتی پھری۔ یہ سب کچھ خوب صورت ہے روشن اسی لئے تو میں یہاں آئی ہوں۔ سمندر اور آسمان دیکھنے کیلئے۔ کب سے کھلا آسمان نہیں دیکھا تھا میں نے۔ اب زندگی زندگی لگتی ہے۔ خوب صورت لگتی ہے۔

پچھلے چند ہفتوں میں بہت کچھ سمجھ میں آئے گا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس سے پہلے برسوں میں کسی تاریک راہداری میں چل رہی تھی اور اب اچانک ایک روشن ہل میں آگئی ہوں۔ جو ہونا ہے، وہ اب خیر اہم لگتا ہے۔ میں نے آسمان اور سمندر دیکھ لیا اور کیا چاہیے۔ سپناں اور کوڑیاں چن لیں۔ زندگی کی طوالت کی کوئی اہمیت نہیں۔ اصل چیز زندگی کو برتنا ہے۔

میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔ تم، 'سیمہ' آسمان اور سمندر۔ کسی بھرپور زندگی گزارا ہے میں نے اور اب زندگی کو ختم کرنا ہے تو ختم ہونا ہے۔ اب "وہ" آئے اور مجھے ختم کر دے مگر یقین رکھنا میرے ذہن میں آخری خیال تمہارا ہی ہو گا۔

تمہاری۔ سونیا



11 جون 98ء

میری سونیا

میں کیا کروں؟ جو کچھ میں نے انپکٹر کے ساتھ کیا، اس کے بعد وہ تمہیں اپارٹمنٹ سے نکلے اور مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ تمہارا فون نمبر ڈائریکٹری میں بھی نہیں ہے ورنہ میں تم سے فون پر بات کر لیتا۔ کچھ کرو سونیا۔ تمہیں میرا پتا معلوم ہے خط ہی لکھ دو۔ اپنا فون نمبر دے دو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ اتنا کچھ ہو جائے کہ بعد بھی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے بلکہ اب تو احساس جرم مجھے ستا رہا ہے۔ میں کتنا احمق ہوں۔ میں نے سوچا بھی نہیں کہ تم میرا پتا پولیس کو دے سکتی تھیں مگر تم نے نہیں دیا۔ اس کا مطلب ہے، تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے جسکی تو میری فکر کرتی ہو۔ تم صرف اس خوف کی وجہ سے خط نہیں لکھتی ہو کہ پولیس اس کی مدد سے مجھ تک نہ پہنچ جائے اور سونیا، میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔ اگر تم مجھے معاف نہیں کرو گی تو میں جان دے دوں گا۔ تمہاری خاطر۔ تمہارے نام پر۔

تمہارا محبوب۔ ساحر انجمن



12 جون 98ء

میرے روشن

گزشتہ رات زس نے مجھے کڑا لیا مگر آج ایسا نہیں ہو گا۔ میرے پاس فینڈ کی تین گولیاں تھیں جو میں نے مقل سے اتارنے کے بجائے چھپا لی تھیں۔ وہ میں نے پیس کر زس کے کھانے میں ملا دیں۔ سو آج میں نکل جاؤں گی۔ کاش اس کے مارنے سے پہلے میں وہاں پہنچ سکوں۔ میرا ہر قصور معاف کر دینا۔

تمہاری اور صرف تمہاری سونیا



15 جون 98ء

میری سونیا

میں بہت باپس ہوں۔ ایک انسان کی میں نے جان لے لی اور دوسرے کو جسے میں جان سے بڑھ کر چاہتا تھا جیتے ہی مار دیا۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اب ہمارے لیے کوئی امکان یکپالی کا نہیں رہا۔ تمہارے بغیر زندگی بے معنی ہے۔ یہ خط تمہیں ملے گا تو میں مر چکا ہوں گا۔

میں اپنی خوشی سے مر رہا ہوں۔ تمہیں جو اذیتیں دیں، ان کی سزا کے طور پر اور مرتے ہوئے میں خوش ہوں۔ میری موت گواہی دے گی کہ دنیا میں کم ہی لوگوں نے میری طرح محبت کی ہوگی اور میں تمہاری محبت میں سرشار ہو کر جان دے رہا ہوں اس لیے خوش ہوں۔ مجھ سے تمہیں جو دکھ ملے ان پر مجھے معاف کر دینا کاش! تمہاری زندگی خوشیوں سے بچی رہے کیونکہ تم خوشیوں کی حق دار ہو میرے لیے تم ایک دیوی تھیں۔ ہاں کبھی بہت خوش ہو تو دو آنسو میری یاد میں بھی بہا دینا۔ اچھا سونیا۔ میری زندگی، میری جان، میری محبت۔۔۔ وقت جدائی آ پہنچا۔

تمہارا خطاکار۔ سائر انجیل

جوہو پولیس اسٹیشن

کشمور رانا

میں نے سوختہ لاش کی تصویریں حادثہ کو بھجوا دی ہیں۔ ساتھ میں اس خط کی فوٹو کاپی بھی جو مرے والے نے سونیا کرن کے نام پر چھوڑا ہے اور جو لاش کے قریب ملا تھا کسٹمر صاحب کا کہنا ہے کہ اب جبکہ یہ کیس ختم ہو گیا ہے تو تم فوراً واپس آ جاؤ۔

ولسن

18 جون 98ء

سائر دیدی

اس وقت میں سونیا کے گھر میں ہوں۔ ہاتھ روم سے سونیا کے کمرے کی آواز اسی ہے۔ میں خوشی سے بے جا ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے مگر دیدی پچھلے ۲ روز بڑے عذاب میں کئے ہیں۔ سکون اس وقت ہوا جب روش نے فون کر کے کہا کہ سونیا کھل ہے؟ اس سے پہلے مجھے لگتا تھا کہ خوف سے مبرا جاؤ گی۔ میں تو بھی سمجھتی تھی کہ اس غیبت نے سونیا کو ختم کر دیا ہو گا۔ پھر ہمیں پتا چلا کہ اس منحوس نے کبھی کر لی۔ میں کیا بتاؤں دیدی، زندگی میں اتنا سکون پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ میں نے مرنے پر ایسا بھی ہوا ہے لیکن کیسی موت جی اس نے اپنے لیے۔ خود پر ہل چڑھ کر آگ لگائی۔ پاگل ہی تھا۔

سونیا کس عذاب سے گزری ہے پتا ہے، ہم پوتا بچنے تو وہ رانھو جی کے ہنگامے باہر ساحل پر گھر دونا بنا رہی تھی۔ لیکن اس کی نظروں میں عجیب سا خلی پن تھا۔ وہ ”اس“ کی شہر ہو۔ میں نے اسے ”اس“ کی خود کشی کے بارے میں بتایا تو وہ خلی نظروں سے مجھے بچی رہی۔ میں تو سمجھی کہ وہ پاگل ہو گئی ہے مگر پھر وہ چھوٹ نکال کر روئے گی۔ واپسی کے سفر میں، میں نے اسے پھانسی رکھا۔ اسپیکٹر کشور اسے ہل دیتا رہا۔

کل سے سیرسل شروع ہو رہی ہے۔ اگلے پتھے ڈراما پیش کر دیا جائے گا۔ یہ سونیا ہاتھ روم سے نکل آئی۔ میں ذرا اسے دیکھ لوں۔ باقی باتیں اگلے خط میں۔

گوبیار۔

تمہاری بہن۔ سیما

مجھے جیتی رہی ہو۔ روشنیوں کے کلاسیوں کے درمیان۔۔ یوں جیسے تارہ ٹوٹ جاتے اور میں تمہاری روشنیوں کے سائے میں تمہاری شہرت کے دامن میں محو گدھاب میں گم نام نہیں رہوں گا۔ تمہاری شہرت اور مقبولیت میں میرا بھی حصہ ہو گا۔ اب صرف چند گھنٹوں کی دوری ہے میری جان۔۔۔ سونیا! تم میری تھیں میری ہو اور میری ہی رہو گی۔ میری محبت تمہیں امر کرنے والی ہے۔

تمہارا اپنا سارا انجان

وہ خط جو سونیا کن پڑھ نہ سکی۔ یہ اس کی موت کے بعد موصول ہوئے۔

30 جون 98ء

پریم محمد غلام اور شہل

محترمہ سونیا کن

میں نے سارا انجان سے رابطے کی بہت کوشش کی۔ تین خط لکھے جو واپس آ گئے۔ ان پر لکھا تھا کہ سارا انجان اب یہاں نہیں رہتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں نے سارا انجان کے آرڈر کے مطابق ہالٹن ہوٹل کے سوئٹ کو 29 مئی کی شب پھولوں سے سجایا تھا، ان کی بیٹی رقم نکالنے کے بعد بھی میرے نو سو روپے ان کی طرف نکلتے ہیں۔ ہوٹل کے میجر نے مجھے بتایا کہ آپ سارا انجان جی کی مہمان تھیں لیکن آپ دونوں نہیں آ سکے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے نو سو روپے بھجوا دیں گی۔

غلام۔ مانیکل

29 جون 98ء

روشن میری جان

ڈراما عوام کیلئے پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے شو میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ رو گیا ہے۔ تمہیں احساس بھی ہے کہ کتنی ہفتوں میں یہ میں تمہیں پہلا خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ ڈراما خواب ختم ہو گیا ہے پھر سے نارل ہو جانا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ سہا چلا رہی ہے کہ اب ہمیں چل دینا چاہیے۔ اب میں خط ختم کرتی ہوں۔ پہلے شو کے بعد فرصت ملی تو تفصیلی خط لکھوں گی۔ بس اتنا بتا دوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

تمہاری۔ سونیا

29 جون 98ء

سونیا کن

تم یہ خط نہیں پڑھ سکو گی یہ میں صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کہ دنیا کو پتا چل جائے کہ محبت ایسی بھی ہوتی ہے۔

نہیں میری جان! میں مرنے لگی ہوں۔ بالکل نہیں مر رہی ہوں لیکن لاش میری نہیں تھی۔ وہ تو ایک بیہوش تھی۔ کل کے نام۔۔۔ میری طرف سے۔ اس کی جان لیتے ہوئے مجھے افسوس ہوا کہ میں کیا کر سکتا تھا۔ تمہارے ارد گرد موجود خاندانوں کو یہ یقین دلانے کی اور کوئی صورت ہی نہیں تھی کہ اب ان کی موجودگی غیر ضروری ہے۔ خطہ ختم ہو چکا ہے اور تم محفوظ ہو چکی ہو اور تمہیں شو میں بھی تو لانا تھا۔ اس کے بغیر بات کیسے بنتی۔

یہ خط میں پوسٹ نہیں کروں گا۔ یہ میری جیب میں پلایا جائے گا۔ اس وقت جیب ہم محبت کا مکمل نکل کر پتے ہوں گے۔ محبت کا نام اور ہمارے نام امر ہو چکے ہوں گے۔

آج کے شو میں میں پہلی قطار میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرا ہاتھل تمہارے اور میرے دائیں طرف کی محبت ہے۔ یہ ہمیں پیش کیلئے ایک کر دے گا۔ تم ویسے ہی سو کی

30 اپریل 98ء

میری سونیا

جس وقت تمہیں یہ خط ملے گا میں اس کے چند گھنٹے بعد تمہارے سامنے موجود ہوں گا۔ بس بہت ہو گئی۔ تمہیں جو حکایت کرنا تھا وہ تم نے کر لیا۔ اب تم مجھے آنے سے نہیں روک سکتیں۔ اب میں تمہارے لئے نہیں اپنے ہی لئے آ رہا ہوں۔ میں نے اور سگیتا نے باہم رضامندی سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سگیتا بہت پیاری لڑکی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ مجھے لڑکی کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ایک بہت اچھی بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد دوسری شادی کے کامیاب ہونے کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔ خیر۔ مجھے بہت کچھ کہنا ہے اور اتنا کچھ نہ خط میں لکھا جاسکتا ہے نہ فون پر کہا جاسکتا ہے۔ وہ سب میں درود کوں گا۔ فی الحالہ صرف اتنا کہ رہا ہوں کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تم میرا انتظار کرو۔ میں آ رہا ہوں۔ تم سے کبھی جدا نہ ہونے کیلئے۔

تمہارا، تمہارا، صرف تمہارا

روشن

○

کڑکی کی درزوں سے سروی پانی کی طرح دس دس کر اندر آتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کالی سے اٹھا اور کڑکی کی طرف بڑھا۔ اس نے کڑکی کے پاس رکھا ہوا تولیا اٹھایا اور اسے کڑکی کے گلے ہوئے فریم میں ٹھونس دیا۔

برف باری ہو رہی تھی۔ تو لے پر برف کے گالوں کے گرنے کی آواز دہلی دہلی پھنکاروں سے مشابہ تھی۔ تجلے کیوں یہ آواز اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ اس نے باہر دیکھا آسمان پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ نیچے جھیل کے پانی پر برف کے ذرات گر رہے تھے۔ مکان کی اس جانب سے وہ بہت دور تک دیکھ سکتا تھا۔

اسے اس علاقے سے نفرت تھی۔ خاص طور پر نومبر کے مہینے میں جب ہر چیز وحشتی نظر آتی تھی، یہ علاقہ اسے بہت برا لگتا تھا۔ ویسے تو اسے یہاں کا موسم گرا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے صرف ایک بار موسم گرا یہاں گزارا تھا۔ اس عرصے میں یہاں سیاہوں کا بھوم ہوتا تھا۔ لوگ دور دور سے گر میاں گزارنے یہاں آتے تھے تب اس مکان میں بھی قی و مہرنے کی جگہ نہیں تھی۔

اسے ان بورڈز سے بھی نفرت تھی جو اجیت پال نے مکان کے سامنے، عتب میں اور پھلوں میں نصب کرا دیے تھے، جن پر نمایاں حروف میں برائے فروخت لکھا تھا۔ نیچے اجیت کی اینٹ ایجنسی کا فون نمبر لکھا تھا جس پر خواہش مند خریدار رابطہ کر سکتے تھے۔ اس حقیقت سے اسے اور نفرت تھی کہ اجیت اور اس کے ساتھ کام کرنے والے گھنٹام اب خریداری کے خواہش مند لوگوں کو مکان دکھانے کیلئے لے کر آتے تھے۔

اسے بتا دی ہو گی کہ وہ کون ہے؟ ممکن ہے، اس نے کچھ نہ بتایا ہو۔ غور تین فطری طور پر بہت چالاک ہوتی ہیں اور اگر اجیت کو کچھ بھی نہیں معلوم ہے تو یہ اور بہتر ہو گا۔ لطف دو بالہ ہو جائے گا۔ اگر وہ اجیت کو کل کا اخبار کھول کر پڑھتے دیکھے تو اجیت کے چہرے کا تاثر کیا خوش کن ہو گا اس کیلئے!

وہ کھڑی سے مڑا وہ بھاری بھر کمزور تندرست آدمی تھا۔ اس کی ٹانگوں پر درخت کے تنوں کا گھمان ہوا تھا۔ آپ وہ ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ کچھ وزن جھانٹا جائے لیکن اس کیلئے پھر سے خود کو بھوکا مارنا ہو گا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے اصل بال بڑھائے۔ اب تو بال بڑی حد تک سفید ہو چکے ہوں گے۔

وہ اپارٹمنٹ میں ادھر ادھر ٹھہرا رہا۔ بلا خرہ ڈرائنگ روم میں دوربین کے پاس جا رکھا۔ وہ بہت طاقت ور دوربین تھی۔ ایسی دوربینیں عام طور پر دکانوں پر نہیں ملتیں۔ اس نے جھٹکتے ہوئے دوربین میں جھانکا۔

وہ ایک تاریک دن تھا اسی لیے سادھنا نے اپنے کچن میں لائٹ آن کر رکھی تھی۔ اس لیے وہ اسے صاف اور واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ کچن کی کھڑکی میں سبک کے سامنے کھڑی تھی۔ شاید وہ کھانا پکانا شروع کرنے والی تھی۔ وہ خاموش کھڑی پانی کی سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی ہو گی؟ بچوں کے بارے میں۔ سہاس اور تلجھا کے بارے میں؟ کاش۔۔۔ وہ کسی طرح جان سکتا!

اسے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔ وہ نزوس انداز میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ آج وہ بہت کم عمر دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے بال پیچھے کی طرف کر کے جوڑا ہاتھ رکھا تھا۔ بال اس نے اخروٹ جیسے براؤن رنگ کے رکھتے تھے۔ کھر سے کیسا فائدہ اٹھاتے ہیں لوگ اور پھر کھر میں اب کیسے کیسے شیڈ آنے لگے ہیں۔ اگر وہ اپنے بال نہ رنگتی تو اسے کئی بھی بہ آسانی پہچان لیتا۔

وہ سادھنا کی عمر کے بارے میں سوچنے لگا۔ کل وہ 32 سال کی ہو جائے گی لیکن اس کی اتنی عمر گنتی نہیں تھی۔ کچھ لوگ اس معاملے میں بہت ہی خوش نصیب ہوتے ہیں۔

کل! کل اسی وقت وہ سادھنا کو دیکھے گا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے

خوش قسمتی سے وہ پچھلے مہینے ہی یہاں آ گیا تھا۔ اس وقت اجیت اس مکان کی فروخت کیلئے مہم چلائے گا ارادہ کر رہا تھا۔ انہوں نے اسے ٹاپ فلور کا اپارٹمنٹ دے دیا تھا۔ وہاں اس نے دوربین سیٹ کر لی تھی۔

وقت کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ کسی بھی وقت کسی خریدار کو مکان پسند آ جاتا اور وہ اسے خرید لیتا۔ اس کے بعد یہاں رہنے کا موقع اسے کسی قیمت پر نہ ملتا۔ اسی لیے اس نے وہ آرٹیکل اخبار میں اشاعت کیلئے بھیج دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب سادھنا کی اصلیت بے نقاب ہو تو وہ یہاں موجود ہو۔۔۔ تماشاً دیکھنے کیلئے کیسا دھماکا ہو گا۔ اب تو سادھنا مطمئن نظر آتی ہے جیسے محفوظ ہو۔۔۔ جیسے ماضی مٹ گیا ہو۔ اسے کیا معلوم کہ ایسا ہے نہیں؟ ماضی کبھی نہیں مٹتا۔

اسے ایک کام اور بھی کرنا تھا لیکن سادھنا بچوں کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ وہ انہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔ بہت خیال رکھتی تھی وہ ان کا۔ ایسے میں ان کا کام آسان نہیں تھا لیکن ہر حال۔۔۔ کل۔۔۔

وہ منظریانہ انداز میں کمرے میں پھرتا پھرتا ٹاپ فلور کا یہ بید روم اپارٹمنٹ کافی کشادہ تھا۔ وہ پرانا مکان ایک اونچی اور بہت بڑی چٹان پر تعمیر کیا گیا تھا۔ وہاں سے دیریا اور جمیل کا منظر بہت صاف دکھائی دیتا تھا۔

گزشتہ چھ سال سے وہ یہاں آ رہا تھا۔ سیزن ختم ہونے پر وہ یہاں آتا اور موسم خزاں تک یہاں قیام کرتا۔ ہر بار وہ اسی مکان میں ٹھہرتا تھا مگر اس سال وہ یہاں آیا تو اجیت اس مکان کو بیچنے کی فکر میں تھا۔ یہ مکان اس کے لیے آئیڈل تھا۔ اس کی ضروریات کے لحاظ سے، اپنی لوکیشن کے اعتبار سے موزوں ترین۔ اجیت کسی ایسے خریدار کی تلاش میں تھا جو یہاں ہوٹل اور ریٹورنٹ بنانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس بار اسے مکان کا ادنیٰ حصہ کرائے پر دے دینے کا وقت اجیت نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کسی بھی وقت کسی خریدار کو مکان دکھانے کیلئے لا سکتا ہے۔ اگر اسے کوئی اعتراض ہو تو ابھی بتا دے تاکہ اسے کوئی اور مکان دکھا دیا جائے۔

اجیت ہال! اجیت کا خیال آتے ہی وہ مسکرا دیا۔ وہ اکثر سوچا کہ کیا سادھنا نے اجیت کو اپنے بارے میں بتا دیا ہو گا؟ اپنا ماضی اس پر کھول دیا ہو گا؟ اپنی حقیقت

چکار تھی۔

”ہاں۔ آج تمہاری مہمی کا برتھ ڈے ہے۔ شام کو میں بڑا سائیک اور ایک تحفہ بھی لاؤں گا اور میرے ساتھ کھٹام چاچو بھی ہوں گے۔ رات سادھنا؟“ وہ سادھنا کی طرف مڑا۔

”اجیت۔۔۔ پلیز۔۔۔ نہیں۔“ سادھنا کے لیے میں التجا تھی۔
”تجس یاد ہے،“ پچھلے سال تم نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے سال ہم سالگرہ مناویں گے۔“

اجیت کو برسوں سے آرزو تھی کہ خوشی کو خوشی کی طرح منایا جائے۔ اس کا استقبال کیا جائے۔ زندگی کا انداز ایسے ہی تو بدلتا ہے۔ ابتدا میں وہ اصرار کرتا تو سادھنا ایک لفظ کے بغیر بھیل کی طرف چلی جاتی اور وہاں یوں ازخود رنگ کی کیفیت میں مبتلا رہتی جیسے اپنی ہی کسی دنیا میں چلی گئی ہو۔ اس دنیا سے پوری طرح بے خبر۔ ایسے میں وہ اسے بھلی ہوئی کوئی آتما گنتی جسے سکون کی تلاش ہو۔

لیکن پچھلے سال وہ کچھ کھلی۔ وہ اپنے پچھلے دونوں بچوں کے بارے میں بات کرنے لگی۔ ”اب وہ ہوتے تو سکتے بڑے ہو گئے ہوتے۔“ سمجھا گیا وہ سال کا ہوتا اور تباہی دس کی۔ میں تصور میں انہیں اتنا بڑا دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں مگر نہیں دیکھ پاتی۔ میں تو انہیں دیکھتا ہی نہیں دیکھ پاتی جیسا آخری بار دیکھا تھا۔ وہ وقت ہی جیسے دھندلا گیا ہے میرے لیے۔ لگتا ہے۔“ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ وہ حقیقت نہیں تھی۔“

”سب کچھ بھول جا میری جان۔“ اجیت نے اس کے کندھے پھتپھتاہے ہوئے کہا تھا۔ ”جو کچھ ہوا“ اسے یاد بھی مت کرو۔“

اس یاد نے اسے اپنے فیصلے میں اور مستحکم کر دیا۔ اس نے جب کہ سادھنا کا سر محبت سے پھتپھتایا۔ سادھنا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے کا تاثر دیکھ کر وہ بے چینی میں جھلا ہونے لگا۔ ”اجیت“ میں نہیں سمجھتی۔۔۔“

”مہمی۔۔۔ آپ کتنے سال کی ہو گئیں؟“ نوین نے اسے بات پوری نہیں کرنے

دی۔

گا۔ کل وہ سب کے سامنے پوری دنیا کے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔ سب لوگ اس کی اصلیت جان لیں گے۔ وہ خوف سے ہیلی پڑ جائے گی۔ سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑائے گی۔ اس سے بات نہیں کی جا رہی ہو گی۔ پولیس اس سے وہی سوالات کرے گی جو سات سال پہلے اس سے کیے گئے تھے۔ وہ خواہش کرے گی کہ مر جائے۔

”سنو سادھنا دیوی۔“ پولیس اس سے کہے گی۔ ”چچ چچ تا دو سب کچھ۔ سادھنا دیوی، تمہارے بچے کہاں ہیں؟“



اجیت بیڑھیوں سے اتر کر نیچے آیا۔ وہ اپنی ٹائی کی گرہ کس رہا تھا۔ سادھنا میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ ارلہ اس کی گود میں چڑھی بیٹھی تھی۔ نوین اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا ہاتھ کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں بیٹوں کا سا وقار تھا۔
اجیت نے نوین کا سر پھتپھتایا اور جب کہ ارلہ کو پیار کیا۔ وہ بہت خوبصورت بچی تھی۔ نیلی آنکھوں والی۔

سادھنا نے سر اٹھا کر اجیت کو دیکھا اور مسکرائی۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ کوئی اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آج وہ 32 سال کی ہو گئی ہے۔ اجیت کو اس کے بالوں کی جڑوں میں اس کے بالوں کا اصلی رنگ نظر آیا۔ پچھلے سال کئی بار اس نے سادھنا سے خد کی تھی کہ وہ اب رنگ کرنا چھوڑ دے! اس کے بالوں کا اصل رنگ بہت خوبصورت ہے۔ سادھنا کی گھٹائیں جیسا سیاہ! لیکن وہ اسے قائل نہیں کر سکا تھا۔

”بھی برتھ ڈے جاتیں۔“ وہ سرگوشی میں منگلتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے سادھنا نے چہرے پر ہنس دیا۔

نوین نے ہاتھ کرتے ہوئے سر اٹھایا اور حیرت سے باپ کو دیکھا۔ ”کیا واقعی آج مہمی کا برتھ ڈے ہے؟ آپ نے مجھے پہلے نہیں بتایا۔“
ارلہ بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”مہمی کا برتھ ڈے! واؤ۔“ اس کے لیے میں

سادھنا مسکرائی۔ ”تمہیں اس سے کیا عورتوں سے ایسی باتیں نہیں پوچھتے۔ ایسا کرو گے تو دنیا میں کوئی لڑکی تمہیں پیار نہیں کرے گی۔“

”بائیں نا مچی۔“ ارلا ٹھنکی۔

”میں دو اوپر تہیں کی ہو گئی۔“

”اوہ۔ تھری ٹو۔“ نوین نے نعرہ لگا۔

اجیت نے کافی کا طویل گھونٹ لیا۔ ”سنو بیٹے، آج اسکول کی چھٹی کے وقت میں تمہیں لینے آؤں گا پھر ہم بازار جا کر تمہاری مٹی کیلئے تھخہ خریدیں گے۔ اب مجھے جانا ہے۔ ایک خریدار کو شافی ہاؤس دکھانا ہے۔ مجھے جا کر اس کے کانڈرات چیک کرنے ہیں۔ سودا ہو گیا تو مزا آ جائے گا۔“

”مگر وہ تو کرائے پر چڑھا ہوا ہے؟“ سادھنا نے اُٹا۔

”ہاں۔ وہی شخص کرائے دار ہے۔ جسوقت مگر میں نے اس سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے جب ضرورت ہوئی، میں کسی خریدار کو مکان دکھانے کیلئے لا سکتا ہوں۔ اسے اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ مجھے اس سودے پر ٹھکرا کیٹھن ملے گا۔“

سادھنا نے ارلا کو گود سے اتارا اور اجیت کے ساتھ دروازے تک گئی۔ اجیت اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی کی بجلی ٹھک سڑک پر چل دی۔ یہ کیا راستہ اٹھوں پہ پہلے ہوئے جنگل کے درمیان سے گزرتا تھا اور آگے جا کر پکی سڑک سے جاملتا تھا۔ وہ سڑک قہقہے کو جاتی تھی۔ اور اسی پر اجیت کا دفتر تھا۔

میز کی طرف واپس آتے ہوئے سادھنا سوچ رہی تھی کہ اجیت کا کہنا درست ہے۔ گزری ہوئی کل کا نام کب تک؟ اب اسے ماضی کو بھول کر صرف مستقبل پر نظر رکھنی، صرف مستقبل کی فکر کرنی چاہیے لیکن وہ کیا کرتی۔ اس کے وجود کا ایک حصہ جیسے منجمد ہو گیا تھا اور وہ ماضی میں ہی رہ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایشیش کے ساتھ گزرا ہوا وقت دھنلایا ہوا سی مگر اس کے ساتھ موجود ہے۔ پیونر کسی کیپس میں اپنا گھر یاد کرنا اس کیلئے بہت دشوار تھا اور وہ دونوں بچے۔ سمباش اور تلجا۔ وہ کیسے نکلتے تھے؟ دونوں کے بال گہرے سیاہ تھے اور وہ نیچے نیچے رہتے تھے۔ خود اعتمادی اور یقین سے محروم۔ اور ان کی اس کی کا سبب وہ تھی۔ وہ انہیں اس سے ملی تھی اور پھر وہ کھو گئے تھے۔ دونوں کھو گئے تھے۔ کیسا نیاں تھا وہ!

”مچی۔ آپ اتنی اداس کیوں رہتی ہیں؟“ نوین نے پوچھا۔ اس کا انداز بالکل

اجیت کا سا تھا۔

سادھنا نے دونوں بچوں کو محبت سے دیکھا۔ ”نہیں بیٹے، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں اداس تو نہیں رہتی۔“ اس نے ارلا کو گود میں اٹھایا۔ بچی کا کلس زندگی سے بھرپور اور بے حد حدت آفریں تھا۔

”میں آپ کے ختے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“ ارلا نے کہا۔

”زبردست۔“ سادھنا بوڑ۔ ”لیکن باہر جا کر سوچ۔“ تازہ ہوا بہت مفید ہوتی ہے۔ دیسے بھی بعد میں شاید بارش ہو جائے۔“

اس نے بچوں کو کپڑے تبدیل کرائے۔ ان کے سروں پر گرم ٹوپیاں رکھیں۔

”نوین۔ مجھے گھر کی صفائی کرنی ہے۔ تم اری کے ساتھ رہنا۔ اسے اکیلا نہ چھوڑنا۔“

”ٹھیک ہے مچی۔“ نوین نے خوش دلی سے کہا پھر بس کی طرف مڑا۔ ”چلو اری، پہلے میں تمہیں جھولا جھلاؤں گا۔“ باہر جنگل سے ذرا پیچھے اجیت نے شاہ بلوط کے ایک اونچے درخت کی شاخ پر بچوں کیلئے زبردست جھولا ڈال دیا تھا۔

سادھنا نے ارلا کو دستے پہنائے۔ وہ سرخ رنگ کے تھے۔ وہ ادنیٰ تھے اور ان کی پشت پر ایک مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ ”یہ پنے رہتا موسم ایک دم ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے۔ پتا نہیں، مجھے تم کو باہر جانے بھی دینا چاہیے یا نہیں۔“

”مچی پلیز۔“ ارلا کے ننھے منے ہونٹ کا پتہ لگے۔ اسے روٹا آتا تھا تو وہ بہت

اچھی لگتی تھی۔

”اچھا بابا، ٹھیک ہے۔ اب رونے کی اداکاری مت کرو۔“ سادھنا نے جلدی سے کہا۔ مگر آدھے ختے سے زیادہ نہیں۔ ٹھیک ہے؟“ اس نے دروازہ کھولا۔ دونوں بچے باہر نکلے۔ باہر جم کو ٹھکڑا دینے والی بے حد سرد ہوا چل رہی تھی۔ سادھنا کچکا کر رہ گئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

وہ پرانے طرز کا مکان تھا۔ زینہ بالکل سیدھا۔ تقریباً عمودی تھا لیکن سادھنا کو اس کی ہر چیز اچھی لگتی تھی۔ اسے بہت اچھی طرح یاد تھا جب وہ چلی بار میاں آئی تھی تو اس مکان کو دیکھ کر اسے کیسے بے پایا سکون کا احساس ہوا تھا۔ اس بات کو چھ سال ہو گئے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب عدالت نے اس کے خلاف فیصلے کو

سادھنا کو یہ بات بہت اچھی لگی کہ اجیت نے اس کے بارے میں زیادہ تفتیش نہیں کی۔

”تمہائی اور پرائیویٹ کے خواہاں لوگوں کیلئے یہ علاقہ بہت مناسب ہے۔“ اجیت نے کہا تھا۔

سواجیت اسے یہاں لے آیا۔ مکان اسے پہلی ہی نظر میں اچھا لگا اور اس نے اسے کرائے پر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈائنگ روم اسے بہت ہی اچھا لگا۔ جمیل کی طرف کھلنے والی کمری کے سامنے بڑی ڈائنگ ٹیبل رکھی تھی۔ بڑے روم کی کمری بھی جمیل کی طرف کھلتی تھی۔ قبضہ اسے فوراً ہی مل گیا اور وہ مکان میں منتقل ہو گئی۔ اس رات میٹروں میں پہلی بار وہ گہری اور بہت اچھی نیند سوئی۔ وہ ایسی پرسکون نیند تھی جس میں پہلی بار اس نے سہاوا اور تھکا کی فریاد بھری نپاک نہیں سنی۔ اسے ہوش ہی نہیں رہا۔

اس مکان میں پہلی صبح اس نے اپنے لیے کافی بنائی اور کافی کی چالی لے کر کمری کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ ایک خوبصورت اور چمک دار دن تھا۔ آسمان جامنی مائل نیلی رنگت کا تھا۔ جمیل میں کشیدگی نظر آ رہی تھی اور فضا آبی پرندوں کے چھچھوں سے معمور تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور ایسا منظر تھا جس نے اس کا وہ جھوٹا ڈالا جو طویل بے خواب راتوں اور اچھٹی نامکمل نیندوں نے اس پر طاری کر دیا تھا۔ اسے سکون کا احساس ہونے لگا۔

او گاؤں مجھے سکون دے دے۔ یہی ایک دعا تھی جو وہ مقدمے کے دوران میں مسلسل کرتی رہی تھی۔ جیل میں بھی یہی دعا اس کے لبوں پر رہتی تھی۔ ”بھگوان! مجھے حقیقت کو قبول کرنے کا حوصلہ دے اور یہ سات سال پہلے کی بات تھی۔“

اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ میڑھوں کے پاس کمری کی کمری رہ گئی ہے۔ یادوں میں کھو جانا کتنا آسان تھا۔ اس کیلئے ارادے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یادیں خود بخود آئیں اور چھا جائیں۔ وہ دھیرے دھیرے میڑھیاں چڑھنے لگی۔ اسے سکون کیسے مل سکتا تھا۔ اس کے سر پر تو تھکوار لگ رہی تھی۔ کسی بھی وقت پرکاش نمودار ہو سکتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے دوبارہ مقدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ مقدمہ۔ اور وہ بھی اپنے ہی بچوں کو قتل کرنے کے الزام میں اور اگر مقدمہ چلا تو وہ اجیت

کا عدم قرار دے دیا تھا۔ استفسار نے مقدمہ دوبارہ چلانے پر زور دیا تھا کیونکہ ان کا سب سے اہم گواہ پرکاش اچانک ہی غائب ہو گیا تھا۔

وہ بھاگ کر میاں آئی تھی۔ وہ یہ سوچ کر نکل گئی تھی کہ علی گڑھ سے جتنی دور جانا ممکن ہو، چلی جائے۔ وہ یونیورسٹی سے، اس پورے تعلیمی ماحول سے فرار چاہتی تھی۔ وہ ان دوستوں سے دور بھاگ رہی تھی جو راتوں رات انہیں دشمن بن گئے تھے۔ وہ جو ہر وقت ”بے چارے ایشیش“ کا تذکرہ کرتے تھے اور ایشیش کی خوشحالی کا ذمے دار بھی اسی کو ٹھہراتے تھے۔

وہ دار بھنگ چلی آئی کیونکہ اس نے سنا تھا کہ میاں کوئی کسی کے بارے میں تجسس نہیں کرتا بلکہ وہ انہیوں سے تعلق بھی نہیں رکھنا چاہتے۔ بے تکلفی تو بہت دور کی بات ہے اور یہ اس کیلئے بہتر تھا۔ وہ یہی چاہتی تھی۔ اس نے اپنے بال کٹوا لیے اور انہیں رنگ لیا۔ اب اس کے بال اخروٹ جیسے براؤن تھے۔ ان کی وجہ سے وہ بالکل بدل گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بظاہر غیر اہم تبدیلیاں آدی کو کتنا بدل دیتی ہیں! یہ احساس بے حد حوصلہ افزا تھا۔ اب وہ ان تصویروں سے بیکر مختلف تھی جو مقدمے کے دوران میں ملک بھر کے اخبارات کے صفحہ اول پر شائع ہوتی رہی تھیں۔ اب کوئی اسے سادھنا ایشیش کمار کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا تھا۔

اسے مکان کی تلاش تھی اور خوش قسمتی اس تلاش کے بدلے اسے اجیت پال کی اسٹیٹ انجنی میں لے گئی۔ ”میرے پاس ایک بہت اچھا مکان ہے۔“ اجیت نے اس سے کہا۔ ”بس وہ ہے ذرا پرانے طرز کا۔“

”اس میں کوئی حرج نہیں۔“
”وہ مکمل طور پر آراستہ ہے۔ قبضہ بھی فوراً ہی مل سکتا ہے۔ آپ کیلئے کتنے کمرے کافی ہوں گے۔ مزہ۔“

”میں سادھنا رائے۔“ سادھنا نے جلدی سے کہا۔ جمیلی طور پر اس نے اپنے نام کے ساتھ باپ کا نام منسلک کر دیا تھا۔ ”اور سنیں! مجھے کسی بڑے مکان کی ضرورت نہیں میرے ایسے ملنے والے نہیں جو میاں آئیں اور میرے ساتھ قیام کریں۔“

”بس تو ٹھیک ہے۔“

سے۔۔ اور نوین اور ارملہ سے دور جانے پر مجبور ہو جائے گی۔ یہ کیسی بے یقینی ہے۔
وہ زندگی شروع ہی نہیں کر سکتی جبکہ وہ دوبارہ زندگی شروع کر چکی ہے۔

بیڑھیوں پر چڑھ کر اس نے پلٹ کر ایک نظر دیکھا پھر وہ ماسٹر بیڈ روم میں چلی گئی۔ اس نے کمزریاں کھول دیں۔ آسان پر بادل جنگ پر تباہ کسی فوج کی طرح صف آرائی میں مصروف تھے۔ سردی بتاتی تھی کہ درجہ حرارت بہت تیزی سے اور مسلسل گر رہا ہے۔ اب اسے اتنا عرصہ ہو چکا تھا کہ وہ یہاں کے موسم کا مزاج سمجھنے لگی تھی۔ جس طرح کی ہوا چل رہی تھی، وہ طوفان کی تیغ تھی۔

وہ گونگو میں پڑ گئی۔ ابھی موسم ایسا ہے کہ بچوں کو تھوڑی دیر اور کھینے دیا جا سکتا ہے؟ وہ ہمیشہ سے ہاتھی تھی کہ بچوں کو صبح کے وقت زیادہ سے زیادہ تازہ ہوا میسر آئے پھر دوپہر کو کھانے کے بعد ارملہ سو جائے گی اور نوین اسکول چلا جائے گا۔

سادھنا چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے بیڈ شیٹس نکالیں۔ یہ توشیٹ اور بے یقینی جو اس کی بدترین دشمن تھی اور اس کے اندر ہی رہتی تھی، اس پر کسی طرح فتح حاصل کرنی ہے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ بچوں کی طرف سے اتنا پریشان رہنا بھی اچھا نہیں کہ وہ نفسیاتی کپٹیکس بن جائے۔ بستر پر دوسری چادریں بچھانے اور سلی چادروں کو دھاک شٹین میں ڈالنے میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگیں گے۔ یہ سوچ کر اس نے بچوں کے پاس باہر جانے کی جھپتی ہوئی خواہش کو چھپا۔ ذرا سی دیر کی تو بات ہے۔

وہ کام میں مصروف ہو گئی!

کرن شرما نے بک اسٹال سے صبح کا اخبار خریدا۔ جب بھی وہ کچھ خریدنے کیلئے نکلتی تھی تو اس مکان کے سامنے سے گزرتی تھی۔ یہ مکان اجیت پال نے اسی وقت اپنے لیے خریدا تھا جب اس نے اس مکان کی خوبصورت کرائے دار سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ موسم اچھا ہوتا تو سادھنا اس وقت اپنے گھر کے باغیچے میں ہوتی تھی۔ وہ کرن کو دیکھ کر دوش بھی ضرور کرتی تھی مگر آج موسم اچھا نہیں تھا۔

کرن کی عمر چالیس سے کم ہی تھی۔ بچپنے کے اعتبار سے وہ دیکل تھی۔ وہ خاصی پرکشش عورت تھی لیکن بے کاری نے اسے ڈپریشن میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس علاقے میں جمیلیں تھیں، ندیاں تھیں اور پھلی کے شکار کی تفریح میسر تھی لیکن موسم سرما میں پھل شکار ممکن نہیں ہوتا تھا۔ برسوں سے وہ اپنے شوہر کے ساتھ گرمی کا سینہ یہاں گزارنے آتی تھی مگر شرما کی موت کے بعد اکیلے پن نے اسے چائنا شروع کر دیا تھا۔ وہ یہاں صرف اس لیے آئی تھی کہ اس علاقے سے اس کی خوبصورت یادیں وابستہ تھیں۔

یہ اس علاقے میں رہائش اختیار کیے اس کا دوسرا سال تھا۔ ایک پبلشر سے اس کی بات ہوئی تھی اور وہ اس کی فرمائش پر ایک کتاب لکھ رہی تھی۔ اس کتاب میں قتل کے مشہور مقدمات کو زیر بحث لایا جاتا تھا۔ کرن نے یہ کتاب اپنی ذاتی دلچسپی کی بنا پر شروع کی تھی۔ پبلشر سے اس کی جان پہچان تھی۔ اس نے کتاب کا ایک باب پڑھا تو اس میں دلچسپی لینے لگا۔ یوں باقاعدہ معاہدہ طے پا گیا اور اب کرن باقاعدہ اس پر کام کر رہی تھی۔ بلاناٹھ۔ پانچ گھنٹے یومیہ یہاں دار بٹلنگ میں چھٹی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسے عدالتوں سے بھی نجات مل گئی تھی اور یہ طے تھا کہ

گھٹام اسٹیٹ ایجنسی کی ابتداء ہی سے اجیت کے ساتھ تھا۔ اس کی عمر 45 سے تجاوز تھی مگر اس کی شخصیت بہت پرکشش تھی۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے اس سے وہ بالوکار لگتا تھا۔ خوش لباس تو وہ تھا ہی۔ اور شاید اسی لیے وہ اسٹیٹ کا بے حد کامیاب میگزین تھا۔

گھٹام نے اجیت کو بہت غور سے دیکھا۔ کیا بات ہے؟ کچھ پریشان ہو؟ اس نے پوچھا۔

”نہیں تو۔۔ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”تمہارے پر شکنتیں ہیں۔ لگتا ہے کچھ سوچ رہے ہو۔“

اجیت اس کے مقابلے کا پہلے ہی قائل تھا۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔ سادی زیادہ ہے نا اس لیے اور تم سناؤ کام کیا چلا رہا ہے؟“

گھٹام نے فوراً برٹس نیوز شروع کر دیں۔ ”سب ٹھیک ہے۔ میں نے شانتی ہاؤس کی فائل مکمل کر لی ہے۔ سب کالعدمات موجود ہیں۔ یہ بتاؤ اس خریدار نے کس وقت آنے کو کہا تھا؟“

”اوہ بچے۔“ اجیت نے بتایا۔

”اس مکان پر ذرا کام کیا جائے“ اس کی شکل بدلی جائے تو یہ زبردست ہوٹل بن سکتا ہے۔“ گھٹام نے کہا۔ ”پانی کے قریب کی لوکیشن بھاری مقامات پر ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس کیلئے بے مثال ہوئی ہے۔“ ٹاکلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

”جہاں تک میری مطلوبات کا تعلق ہے“ بخاری لال اب تک کی ریسٹورنٹس کامیابی سے چلانے کے بعد اچھے دامن فروخت کرتا رہا ہے۔ یہ لمباریوں کا خاص کاروبار ہے۔ جہاں ریسٹورنٹ نہ چلتا ہو وہاں بھی چلا دیتے ہیں اور جما ہوا برٹس معقول قیمت پر بیچ دیتے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ پیسے خرچ کرنے میں ہچکچاتا بھی نہیں ہے۔“ اجیت نے اپنے آفس کا دروازہ کھولا اور میز پر چائیں۔ چند لمبے وہ سوچتا رہا پھر اس نے گھٹام کے ایکسٹینشن کا نمبر ڈائل کیا۔ ”یار“ سادی بہت ہے۔ کافی نہیں پڑاؤ گے۔“

”کیوں نہیں۔“

کتاب مقبول ہوئی تو اس پر کیس برسیں گے۔

ہوا بہت سرد تھی۔ اس نے اپنی اسکارف کو اچھی طرح کانوں پر لپیٹ لیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ابھی بادلوں نے سورج کا پوری طرح گھیراؤ نہیں کیا تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی دھوپ کی ترازت بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے جمیل کی طرف دیکھا۔ سامنے والی جہازوں کی چمنائی کے نیچے میں جمیل کا منظر بالکل صاف نظر آنے لگا تھا۔ بس اس جمیل کے منظر کی راہ میں وہ پراٹا منٹ ہاؤس رکاوٹ بننا تھا جس کا نام شانتی ہاؤس تھا۔

کرن نے سرگھما کر دیکھا تو اس کی آنکھیں چند حیرا گئیں۔ جس شخص نے شانتی ہاؤس کی اوپری منزل کرائے پر لی تھی اس نے کمزری میں یقیناً کوئی دھاتی چیز رکھی تھی۔ سورج کی کرنیں اس پر پڑ کر منعکس ہوتی تھیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ کرن نے سوچا کہ وہ اجیت سے ٹکے گی کہ اس سلسلے میں اپنے کرائے دار سے بات کرے لیکن اسے ڈر تھا کہ کرائے دار اس پر برا مانے گا۔

اب وہ اجیت کے گھر کی کمزری کے بالکل سامنے تھی۔ سادھنا کمزری کے پاس ٹاشنے کی میز پر بیٹھی اپنے جینے سے بات کر رہی تھی۔ کرن نے جلدی سے نظر ہٹا لی۔ اچھا نہیں لگتا کہ کوئی کسی کے گھر میں اس طرح دیکھے۔ وہ اخبار لیے اپنے گھر کی طرف چل دی۔ آج اسے ایشیٹ مار میگزین پر کام شروع کرنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی کتاب کا سب سے دلچسپ باب ثابت ہو گا۔



اجیت نے اسٹیٹ ایجنسی کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ فکر مندی کا ایک نامعلوم احساس تھا جو اسے سارا ہاتھ وہ کوبش کے باوجود اسے ذہن سے نہیں جھٹک پایا تھا۔ سادھنا کا جنم دن تو مسئلہ تھا ہی۔ وہ سادھنا کو جنم دن منانے پر مجبور رہا تھا حالانکہ سادھنا کی طرح اسے بھی ڈر تھا کہ یہ بدلی ہوئی کرب ناک یادوں کے ابھرنے کا سبب بنے گا لیکن اس کی فکر مندی اس سے بھی سوا تھی۔ سادھنا بہت دور رہ کر لگتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

گھٹام چکچکا۔ ”لوگوں۔ کے خیال میں وہ ایک بے حد پرکشش اور حسین عورت ہے۔ خوش اطوار اور خوش گفتار ہے مگر گھٹام لانا پسند نہیں کرتی۔ بہت لمبے دیسے اپنی ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو مگر میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ مقامی لوگوں کو منہ لگانے کے قابل نہیں سمجھتی۔ پچھلی بار میں اسے کاسنی کی شادی میں لے گیا۔ وہاں جس وقت نصویریں کھینچی جا رہی تھیں تو سادھنا پچپے سے کھک مٹی تھی۔ ہاتھ روم میں جا کھسی تھی۔“

”وہ ڈرتی ہے کہ اسے بچان نہ لیا جائے۔“

”یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں مگر یہ سوچو کہ دوبارہ مقدمہ چلا تو میں چاہوں گا کہ یہاں کے لوگ سمجھیں کہ سادھنا انہی میں سے ہے۔ اس سے سادھنا کو ڈھارس ملے گی۔ یہ ضروری ہے کیونکہ بری ہونے کے بعد سادھنا کو زندگی میں گزارنی ہو گی۔ ہمیں یہیں رہنا ہے۔“

”اور اگر مقدمہ چلا اور سادھنا بری نہ ہوئی تو؟“

”میں اس امکان پر سمجھتا بھی نہیں چاہتا۔“ اجیت نے خشک لہجے میں کہا۔ ”ہاں تو کیا ملے پایا؟ ہمارے ہاں آگے تا؟“

”ضرور آؤں گا۔“ گھٹام نے کہا۔ ”اور میں تمہاری ہر بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن میرے خیال میں نہیں خود سے یہ ضرور پوچھنا چاہیے کہ اچانک تمہارے دل میں سادھنا کے لیے ٹارل زندگی کی خواہش کیوں ابھری ہے۔ اس خواہش کے پیچھے کچھ اور وجوہات اور محرکات بھی ہو سکتے ہیں۔ انہیں بھی ٹٹولو۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”اے جی۔ جب تم سے کانگریس کے صدر نے کہا تھا کہ اس علاقے کے لوگوں کو سیاست میں آنا چاہیے کیونکہ وہ علاقے اور عوام کے مسائل کو زیادہ سمجھتے ہیں اور انہیں حل کرنے کیلئے محنت بھی کر سکتے ہیں تو میں وہاں موجود تھا۔“ گھٹام مسکرایا۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ تم جیسے باصلاحیت آدمی کو اس علاقے کی نمائندگی کرنی چاہیے۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ تم پر اس بات کا اثر نہ ہوا ہو لیکن موجودہ صورتحال

”جس تو اپنی اور میری کافی بیس لے آؤ۔ کچھ دیر باتیں بھی کریں گے۔“

”اوکے ہاس۔“

چند منٹ بعد گھٹام کافی کی دو بھاپ اڑاتی پالیاں لے کر کمرے میں آیا۔ اجیت نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”آؤ بیٹھو۔“

گھٹام بیٹھ گیا۔ ”کوئی خاص بات ہے؟“

”آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ اجیت نے کہا۔ ”آج ہم سادھنا کی سالگرہ منا رہے ہیں۔“

گھٹام نے ایک گہری سانس لی۔ پورے دار بلیک میں ایک وہی تھا جو سادھنا کے بیک گراؤنڈ سے واقف تھا۔ اسے خود سادھنا نے سب کچھ بتایا تھا۔ جب اجیت نے اس سے شادی کو کہا تھا تو اس نے گھٹام کو سب کچھ بتا کر اس سے مشورہ مانا تھا۔

”سالگرہ منانے کے پیچھے کوئی خاص سوچ ہے؟“ گھٹام نے پوچھا۔

”سوچ یہ ہے کہ آخر کب تک سالگرہ نہیں منائی جائے گی۔“ جبکہ وہ ہر سال آتی ہے۔ کیا سالگرہ یا جنم دن جیسی حقیقت سے نظر سچائی جا سکتی ہیں؟ سادھنا کو اب ماضی سے نانا توڑ کر حال میں جینا شروع کر دینا چاہیے۔ کب تک وہ یوں نہ چھپاتی رہے گی۔“

”ماضی سے نانا کیسے ٹوٹ سکتا ہے اور اس کے سر پر دوسرے ممکنہ مقدمے کی تلوار لٹک رہی ہے ہو تو وہ نہ چھپائے گی ہی۔“

”میں تو میں کہ رہا ہوں۔ ایک امکان سے کیوں اتنا ڈرا جاؤ۔ دیکھو گھٹام، وہ گواہ پر کاش اچانک روپوش ہو گیا تھا اور وہ سامنے آنا بھی نہیں چاہے گا۔ یہ کیوں بھولے ہو کہ وہ فوج سے بھاگا ہوا ہے۔ وہ سامنے آئے گا تو اس کا کورٹ مارشل ہو گا اور یقینی طور پر اسے سخت سزا ملے گی۔“

”ہاں“ یہ تو ہے۔“

”اب اور آگے بڑھ کر بات کرو۔ جی بات کہنا یہاں لوگ سادھنا کو کیا سمجھتے ہیں؟ اس کے بارے میں کسی رائے رکھتے ہیں؟“

اس وقت زرد ہو رہا تھا۔ اجیت اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا کر شاید گھٹام کو اس کی مدد کی ضرورت ہے لیکن گھٹام نے نفی میں سر ہلایا اور دروازہ بند کر کے اندر آ گیا۔ اس نے اخبار اجیت کی طرف بڑھایا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مقامی طور پر شائع ہونے والے ہفت روزہ کوستان کا تازہ شمارہ تھا۔ اس کے سچ کے صفحات میں بیسہ کوئی ہیومن انٹرسٹ کی اسٹوری ہوتی تھی۔ گھٹام نے کھلا ہوا شمارہ اجیت کے سامنے رکھ دیا۔

تصویر بالکل واضح تھی۔ دونوں ایک ساتھ بھی ہوئی اس تصویر کو دیکھتے رہے۔ وہ ساوہتا کی تصویر تھی۔ یہ تصویر انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بال اس کے اس تصویر میں بھی براؤن تھے۔ تصویر کے نیچے کیشن تھا۔ کیا یہ ساوہتا ایش کیلئے بھی برتھ ڈے ہو سکتا ہے؟ ایک اور تصویر مقدسے کے دوران کی تھی۔ اس میں ساوہتا عدالت سے تعلق نظر آ رہی تھی۔ تیری چھوٹی تصویر تھی جس میں ساوہتا اپنے دونوں بچوں سمجھا اور تہا کو لپٹائے ہوئے تھی۔ ساتھ ہی اسٹوری بھی تھی۔ آج ساوہتا ایش اپنا 32 واں جنم دن منا رہی ہو گی۔ کہاں؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یاد رہے کہ اس کے دونوں بچوں کی ساتویں برسی بھی ہے۔ ساوہتا کو ان بچوں کا قاتل ٹھہرایا گیا تھا۔



میں بات بنے گی نہیں۔ اس لیے تم تبدیلی لانا چاہتے ہو۔“ اجیت اسے دیکھتا رہ گیا۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ لاشعوری طور پر اس نے یہ ضرور سوچا ہو گا لیکن گھٹام نے اسے جواب دینے کا موقع نہیں دیا۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اجیت چہرے پر شرمندگی کا تاثر لیے سامنے والی دیوار کو دیکھتا رہا۔ وہ ڈپریشن ہو گیا تھا۔

اجیت کو پچھلے ماہ کے دوران میں کئی ایسے مواقع یاد تھے جب بغیر کسی وجہ کے اس نے ساوہتا سے تنہی کی تھی۔ اس پر الٹ پڑا تھا۔ مثلاً وہ دن جب ساوہتا نے وائر کمر میں مکان کو پینٹ کر کے اسے دکھایا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ساوہتا کو پینٹ کرنا چاہیے۔ آرٹ کو اسٹڈی کرنا چاہیے۔ اس وقت بھی اس کا کام ایسا تھا کہ مقامی طور پر اس کی نمائش کا اہتمام کیا جا سکتا تھا لیکن وہ ڈرتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔

پینٹنگ دیکھنے کے بعد اس نے سخت لہجے میں ساوہتا سے کہا۔ ”یہ بہت اچھی ہے مگر اب تم اسے الماری میں کٹھ کپڑے کے درمیان چھپا دو گی۔“

ساوہتا کے چہرے پر ایسا رنگ دوڑا جیسے اس نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا

۔۔۔

اجیت کو خود بھی بہت افسوس ہوا۔ کاش وہ اپنی زبان پر قابو رکھ پاتا۔ ”مجھے افسوس ہے جان بات بس اتنی ہی ہے کہ مجھے تم پر اور تمہاری صلاحیتوں پر فخر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارا فن لوگوں تک پہنچے اور تمہیں وہ داو ملے جس کی تم مستحق ہو۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو مگر میں کیا کروں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ ساوہتا کے لہجے میں بے بسی اور شرمندگی تھی۔

اور بھی کتنے مواقع تھے جب وہ اپنی اور ساوہتا کی نقل و حرکت کے محدود ہونے پر بے بسی محسوس کرتے ہوئے بھڑک اٹھا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور میز پر رکھے خطوط کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سوا دس بجے گھٹام نے پھر اس کے دفتر کا دروازہ کھولا۔ اس کا سرخ و سپید

ایک ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا کہ اسی وقت اس نے ساوہتا کی آواز سنی۔ ”ایک منٹ توین“ مجھے یہاں سے کچھ لینا ہے۔“

ساوہتا کی آواز سن کر وہ اپنی جگہ جم گیا۔ بت بن کر رہ گیا۔ اسی وقت ساوہتا کا جسم اس کے جسم سے مس ہوا اور ساوہتا بڑبڑائی۔ ”آئی ایم سوری۔“ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ جواب میں کچھ کہتا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ساوہتا نے اپنی مطلوبہ چیز اٹھائی اور آگے بڑھ گئی۔ تب کہیں اس کی جان میں جان آئی۔

اس دن کے بعد وہ بہت محتاط ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آئندہ کبھی ساوہتا سے اس کا سامنا ہو لیکن اس کیلئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ باقاعدگی سے یہاں آنے والوں میں شمار ہو تاکہ اس کا آنا جانا مقامی لوگوں کیلئے معمول کے مطابق ہو جائے۔ کوئی غیر معمولی بات نہ رہے۔ اسی لیے وہ دودھ اور ڈبل روٹی لینے کیلئے روز مارکیٹ آتا تھا لیکن وہ ہمیشہ دس بجے کے قریب باہر نکلتا تھا کیونکہ ساوہتا کبھی گیارہ بجے سے پہلے گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ اس صورت میں اس کا سامنا ہونے کا امکان نہیں تھا۔ روز آنے کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ اسٹور کے مالک رضا اوجا جارج اسے اپنے باقاعدہ کسٹمر کی حیثیت سے پہچاننے لگے تھے۔ وہ اس سے خوش مزاجی سے کب شپ بھی کر لیتے تھے۔

اب چند منٹ میں وہ معمول کے مطابق اسٹور پر ہو گا۔ وہ ساوہتا کے گھر جانے والی سڑک تک پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے سڑک سنسان تھی۔ نہ کوئی گاڑی جا رہی تھی نہ آ رہی تھی۔ اس نے اسٹیشن دیکھ کر رفتار بڑھائی اور گاڑی کو اس کی سڑک پر اتار دیا جو ساوہتا کے گھر کے پچھواڑے کی طرف جاتی تھی۔ اس وقت دس بجتے میں نو منٹ تھے۔

اب سے چند منٹ بعد ”کوستان“ اسٹالوں پر آ جائے گا۔ اس شمارے میں ساوہتا کو بے نقاب کرنے والی اسٹوری چھپنے والی تھی۔ یہ اسٹوری جواز بنے گی۔ ساوہتا کے پھٹ پڑنے کا۔ اس کے اندر متشاور رجحان کے اہل پڑنے کا۔ قہرے میں

ٹائٹنگ سب سے اہم چیز ہے۔ ٹائٹنگ صرف ٹائٹنگ کی بنیاد پر قائم ہے۔ چاند، سورج، سب کچھ ٹائٹنگ کے ساتھ گردش کر رہے ہیں۔ سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ اس میں کبھی ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا بھی فرق نہیں پڑتا۔

اس نے اپنی اسٹیشن دیکھ کر ریورس میٹریس ڈال کر گیراج سے نکلا۔ وہ ایسا ابر آلود دریا تھا کہ وہ اپنی دو رین کی مدد سے بھی کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس نے اتنا دیکھ لیا تھا کہ ساوہتا بچوں کو جینٹ پینا رہی تھی۔

اس نے اپنی جیب ٹٹولی۔ بھری ہوئی سویاں موجود تھیں۔ ان کا استعمال ہدف کو فوری طور پر بے ہوش کر سکتا تھا۔

اس نے سر ہٹا کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر اس کا کیوس کا بڑا رین کوٹ رکھا تھا۔ یہ رین کوٹ اس علاقے میں عام تھا۔ وہیں چھلی پکڑنے کی چیز بھی رکھی تھیں۔ کوٹ اتنا بڑا تھا کہ دو چھوٹے بچوں کو بے آسانی ڈھانپ سکتا تھا۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور گاڑی کو سڑک پر ڈال دیا۔ اس کے قہقے میں دیوانگی کی جھلک تھی۔

اس سڑک کے کنارے پر سہ مارکیٹ تھی۔ وہ جب بھی یہاں آتا تو اس مارکیٹ میں خریداری کرتا۔ ویسے تو ضرورت کی بیشتر چیزیں وہ اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا کیونکہ زیادہ باہر نکلتا اس کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ خاص طور پر وہ ساوہتا سے ٹکراؤ کا تو متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی بدلی ہوئی شخصیت کے باوجود اسے پہچان سکتی تھی۔ چار سال پہلے مارکیٹ ہی میں وہ ایک حادثے سے بال بال بچا تھا۔ وہ کافی کے

دی۔ اس نے زب لب بڑھاتے ہوئے گاڑی کو ٹرن کیا۔ یہ خواہ مخواہ کی مداخلت کوئی اچھا لگن نہیں تھی۔

سرخ گاڑی کی رفتار کم ہوئی۔ ڈرائیور اسے راستہ دے رہا تھا۔ سرخ گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔

سرخ گاڑی کے ڈرائیور کا چہرہ وہ پوری طرح نہیں دیکھ سکا۔ اسے صرف ٹاک اور ٹھوڑی کی جھلک دکھائی دی۔ ڈرائیور نے منظر اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا مگر اس ایک جھلک میں بھی اسے وہ جانا بچانا سا چہرہ نگاہ۔ وہ عقب نما آئینے میں سرخ گاڑی کو دیکھتا رہا۔ سرخ گاڑی نے موڑ کاٹا اور عقب نما آئینے سے باہر ہو گئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لے کر عقب نما آئینے کو ایسے زاویے پر سیٹ کیا کہ اب اسے اس میں کیوس کا رین کوفر نظر آ رہا تھا جس کے نیچے اس نے بے ہوش بچوں کو چھپایا ہوا تھا۔ قریب ہی چھپی کپڑے کی راڈ اور کانٹے وغیرہ پڑے تھے۔ کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے عقب نما آئینے کو دوبارہ پہلی پوزیشن پر سیٹ کر دیا لیکن اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا نہیں۔ دیکھا ہوتا تو اسے نظر آ جاتا کہ سرخ کار واپس آ رہی ہے۔

دس بج کر چار منٹ پر وہ اسٹور میں داخل ہوا۔ رہائے اسے گڈ مارٹنگ کہا۔ اس نے دودھ کا پکٹ طلب کیا۔

سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔



سادھنا نیچے آئی۔ اس کے ہاتھ میں تولیے اور بستری چادریں تھیں۔ اس نے چمکائی دھلائی کا فیڈل کر لیا تھا۔ ابھی کپڑے باہر لٹکا دیے جاتے تو شاید سوکھ ہاتے۔ طوفان آنے کے بعد تو بہتوں موقع نہیں ملتا۔

ہاتھ روم میں تولیے اور چادریں اس نے واشنگ مشین میں ڈال دیے۔ ٹرجنٹ کی مناسب مقدار پانی میں ڈالنے کے بعد اس نے مشین کو اشارت کر دیا۔ کپڑے مشین میں پکر کھانے گئے۔

ہر شخص دہلی زبان سے سادھنا کے حلق بابتیں کرے گا۔ لوگ اجیت اور سادھنا کی طرف اشارے کریں گے اور بعد میں کما جائے گا کہ اس کی وجہ سے سادھنا کے اندر دبا ہوا لاوا پھٹ پڑا۔ اور اس نے۔ اس نے کار جنگل میں سادھنا کے گھر سے کچھ پیچھے ہی روک دی پھر وہ کار سے اترا اور اس طرف چل دیا جہاں بچے کھیلتے تھے۔ یہاں بیشتر درخت ٹنڈمڈ تھے لیکن چند ایسے سدا بہار درخت بھی تھے جو اسے بہت اچھی آڑ فراہم کر سکتے تھے۔

جھولے کی طرف سے اسے بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ بچے اسے بعد میں نظر آئے۔ بچی نکار رہی تھی۔ ”بھیا۔ اور اونچا۔ اور تیز جھلاؤ۔“
دو دبے پاؤں پوچھا۔ اس کی طرف لڑکے کی پشت تھی۔ آخری لمحے میں بچے نے پلٹ کر اسے دیکھ لیا۔ اس کی نگاہوں میں دہشت جھلکی لیکن اس نے فوراً ہی ایک ہاتھ سے بچے کا منہ دبا دیا اور دوسرے ہاتھ سے دوا میں ڈوبی ہوئی سوئی اس کے دستانے پہنے۔ ہوئے ہاتھ کی پشت میں اتار دی۔ لڑکے نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن دوا سریع الاثر تھی۔ وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔
جھولا واپس آ رہا تھا۔ بچی ہنس رہی تھی۔ ”بھیا۔ جھوننے دو نا۔ ہاتھ مت روکو۔“

اس نے جھولے کو رسی سے پکڑ لیا اور نھسی سی بچی کو چڑیا کی طرح دیوچ لیا۔ بچی چیختی ہی والی تھی کہ اس کا ہاتھ بچی کے منہ پر جم گیا۔ ساتھ ہی اس نے دوا میں ڈوبی ہوئی دوسری سوئی بچی کے ہاتھ میں جھبر دی۔ ایک لمحے کے بعد بچی اس کے ہاتھ میں جھول گئی۔

اس نے دیکھا بھی نہیں کہ بچی کا ایک دستانہ جھولے کی رسی سے الجھ کر رہ گیا ہے۔ اس نے دونوں بچوں کو اٹھایا اور انہیں لے کر اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔

اس نے بچوں کو اسٹیشن ویگن کی کچھلی سیٹ پر بڑے رین کوٹ کے نیچے چھپا دیا۔ اس وقت دس بجتے ہیں پانچ منٹ تھے۔ اس نے گاڑی بیک کی اور ریورس گیر میں اسے سڑک۔ تک لایا۔ اسی وقت اسے ایک چھوٹی سرخ کار اپنی طرف آتی دکھائی

ایک تصویر ایسی تھی جو سب پہچان سکتے تھے۔ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ مقدمے کے بعد اس نے بال چھوٹے کرا کے رنگوائے تھے تو کس نے اسے دیکھا تھا پھر یہ تصویر کیسے اکٹھی گئی۔ کس نے کیسینی۔ اور کب کیسینی؟

بہر حال مسئلہ یہ تھا کہ اب یہاں لوگ اسے پہچان لیں گے۔ اب نوین کی کلاس میں بچے سرکوشیاں کریں گے۔ نوین کی طرف اٹھیں اٹھیں گی۔

بچے۔ ہاں اسے بچوں کو پہچانا چاہیے۔ نہیں۔ بچوں کو داپس لانا چاہیے۔ نہیں غصہ لگ سکتی ہے۔ وہ لڑکھائی ہوئی باغی نظر، عقبی دروازے کی طرف گئی اور سے کھولا۔ ”نوین۔ اری۔ یہاں آؤ۔ اب گمراہ جاؤ۔“ اس کی آواز بچ میں تبدیل ہو گئی۔ بچوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ان کی آوازیں بھی نہیں سنائی دے رہی تھیں۔ کہاں ہیں بچے؟

وہ گمراہ کر نکلے۔ جھوٹا اب بھی متحرک تھا مگر خالی تھا۔ بچے کیسے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ارے۔۔۔ دستانہ۔ اری کا دستانہ جھولے کی سی پر لٹک رہا ہے۔

اسے اچانک جمیل کا خیال آیا۔ اور وہ لرز رہ گئی۔ بچے وہاں تو نہیں جا لیتے۔ انہیں سختی سے منع کیا گیا ہے لیکن پھر بھی بچے تو بچے ہی ہیں۔ تنبیہ کے وجود جمیل کی طرف جا سکتے ہیں اور اگر وہ بچے گئے ہیں۔ جمیل کی طرف۔ تو میں بھی نکلا جائے گا۔ سباش اور تجا کی طرح۔ پانی میں۔ ان کے چہرے ہیکے د سوجے ہوئے ہوں گے۔ اور جسم بے حس و حرکت ہوں گے۔

اس نے سی سے بچا ہوا ارٹا کا دستانہ لوہا اور عقبی جھل میں گھس گئی۔ فوراً جمیل تک پہنچنا تھا۔

وہ جمیل سے کچھ دور تھی کہ اسے پانی کی سطح کے نیچے کوئی چیز چمکتی نظر آئی۔ اود سرخ رنگ کی کوئی چیز ہے۔ دستانہ! وہ دیوانہ وار سوچ رہی تھی۔ اور اس آنے کے ساتھ کیا اری بھی ہے۔

اس پر دشت طاری ہوئے گی۔ وہ پانی میں اتر گئی۔ پانی جیسا سرد تھا۔ دھتھی رہی۔ کندھوں تک پانی میں پہنچ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا مگر وہم کو کبھی کوئی

اسے بچوں کا خیال آیا۔ اب بچوں کو اندر بلا لیتا چاہیے لیکن دروازے پر اسے ”کوستان“ کا تازہ شمارہ نظر آ گیا جو اخبار والا کسی وقت ڈال گیا تھا۔ اس نے میگزین اٹھایا۔ ہوا اتنی سرد تھی کہ اسے قہر قہری چڑھتی محسوس ہوئی۔ وہ میگزین لے کر کچن کی طرف لپکی۔ اس نے چائے گرم کرنے کیلئے چولہا جلایا۔ پھر اس نے اخبار نما میگزین کو کھول کر اندر کے صفحات پر نظر ڈالی۔ فیشن کے صفحات میں اسے خاصی دلچسپی تھی۔

مگر اس کی نظریں پھرا گئیں۔ وہ تصویروں پر اور خبر کی سرخی پر جم گئیں۔ کیا وہ کوئی ڈراما خواب دیکھ رہی ہے؟ یہ حقیقت تو نہیں ہو سکتی۔

لیکن وہ حقیقت تھی۔ انکسین بار بار ملنے کے باوجود وہ تصویریں اوجھل نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ اشیش اور پرکاش کی تصویریں بھی چمکی تھیں۔ اس کے ساتھ بچوں کی تصویر تھی جس میں وہ انہیں لٹائے ہوئے تھی۔ سباش اور تجا۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بچتے لگیں۔ اس کی اور بچوں کی یہ تصویر اشیش نے کیسینی تھی۔ وہ پورا سٹراس کی ٹکاؤں میں پھر گیا۔

”میری طرف توجہ مت دے۔ سمجھو میں موجود ہی نہیں ہوں۔“ اشیش کہہ رہا تھا۔

مگر بچے جانتے تھے کہ وہ موجود ہے۔ وہ ڈر رہے تھے۔ سم کر وہ اس سے لپٹنے لگے تھے۔ اسی وقت کلک کی آواز سنائی دی تھی۔

”نہیں۔ نہیں۔“ اس نے گمراہ کر ہاتھ بڑھایا۔ چائے کی دیبھی الٹ گئی۔ اس نے دیبھی اٹھائی۔ گرم چائے سے اٹھیلوں کے جلنے کا اسے مہوہم سا احساس ہوا۔

اسے میگزین جلا دینا چاہیے۔ نوین اور ارٹا کی نظراس پر نہیں پڑنی چاہیے۔ وہ میگزین لے کر ڈانٹنگ روم میں آتش دان کی طرف لپکی۔ اس نے وہیں رکھی مچاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دیا سلائی جلی اخبار سے شعلہ اور دھواں اٹھا۔ اس نے جلنے ہوئے اخبار کو آتش دان میں ڈال دیا۔

یہ میگزین پورے علاقے میں پڑھا گیا ہو گا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ان میں اس کی

چھو نہیں سکا ہے۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بخ بستہ پانی کے سوا۔

وہ لڑکھائی ہوئی پانی سے نکل اور جھیل کے کنارے پر ڈیر ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند سی اٹھ رہی تھی۔ اس نے جھل کی طرف دیکھا تو اسے ایک مرد کا چہرہ نظر آیا۔ کس کا چہرہ ہے یہ؟ مگر اسی لمحے سب کچھ دھند نے نگل لیا۔

اجیت اور گھنٹام کو وہ جھیل کے کنارے رات پر پڑی ملی۔ اس کے کپڑے جسم سے پچکے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں۔ ایک ننھا مٹا سرخ دستانہ اس کے رخسار سے چپکا ہوا تھا۔

کرن کو جب اس کتاب کا خیال سوجھا تھا تو اس نے اپنی محقق دوست شوہما سے مشورے کے بعد وہ ایسے مقدمے منتخب کیے تھے جو اس کی نظر میں متاثرہ تھے۔ شوہما نے اسے ان تمام مقدموں کا تفصیلی ریکارڈ فراہم کر دیا تھا۔ ہر مقدمے کی ایک اگلی فائل تھی۔ اس میں مقدمے کی مکمل کارروائی، کیس کے متعلق اخبارات کے تراشے اور تصویریں، غرضیکہ سبھی کچھ موجود تھا۔ کرن کو ہر فائل کا عین مطالعہ کرنا۔ اور اس کے بعد متعلقہ کیس کے متعلق لکھنا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ آخر میں ہر مقدمے کے فیصلے کے بارے میں اپنی رائے دینی تھی۔ فیصلے سے اتفاق کرنا تھا یا بالکل اختلاف کرنا تھا۔

وہ دو باب مکمل کر چکی تھی۔ پہلا انوپ کمار قتل کیس تھا اور دوسرا شانتی مگر قتل کیس۔ پہلے کیس کے بارے میں اس نے رائے دیتے ہوئے ملزم کو بے قصور قرار دیا تھا۔ اس کے خیال میں استناد کے کیس میں بے شمار جھول تھے۔ دوسرے کیس میں اس کی رائے میں ملزم پر جرم ثابت ہو گیا تھا لیکن وہ سزائے موت کا مستحق نہیں تھا کیونکہ یہ مقدمہ چودہ سال چلا تھا اور ان چودہ برسوں میں مجرم نے اپنی بڑی دہش اصلاح کر لی تھی۔

اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس نے میز پر رکھے فولڈرز میں سے وہ فولڈر اٹھایا جس پر سادہ سیاہی کیس لکھا تھا۔ پہلے صفحے پر شوہما کا لکھا ہوا نوٹ تھا۔ ”کرن، مجھے یقین ہے کہ یہ کیس تمہیں خوش کر دے گا۔ اس کی ملزمہ استناد پنے ایک ترنوالے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ گواہی کے دوران میں اس کا ہر بھی نوٹ گیا اور اس نے ملزمہ پر الزام عائد کر دیا۔ ملزمہ کی خوش قسمتی تھی

کرن کو احساس تھا کہ گھٹام بھی اسے پسند کرتا ہے۔ بیوی کی موت کے بعد سے وہ بھی اکیلا تھا۔ اولاد سے بھی محروم تھا۔ یعنی ان کے درد مشترک تھے۔ اور مزاج بھی ملتا تھا۔ گھٹام تو کل کر اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر چکا تھا لیکن کرن بہت محتاط تھی۔ وہ جلد بازی میں کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔
کرن جھنجھلا گئی۔ کیا بات ہے۔ آج دھیان ادھر ادھر کیوں بھٹک رہا ہے۔ اس نے پھر ساوہتا اشیش کیس کی فائل اٹھائی۔

سوا گھنٹہ گزر گیا۔ کمرے میں کلاک کی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز نہیں تھی پھر کرن کچن میں مٹی اور اپنے لیے کافی بنانے لگی۔ اس کیس میں اسے کوئی گزیر محسوس ہو رہی تھی۔ حقائق مربوط نہیں تھے بلکہ کسی کیس ان مل اور بے جوڑ لگتے تھے۔

کافی کا پانی رکھ کر وہ دروازے کی طرف مٹی اور وہاں سے کوستان کا تازہ شمارہ لے آئی۔ کچن میں آکر اس نے کافی پیالی میں اینڈلی اور میگزین کے اندر کے صفحات کھولے چند لمحوں بعد اس کی نظر اجیت کی بیوی ساوہتا کی تصویر سے چپک کر رہ گئی۔
کرن کیلے دو حقیقت بہت افسوسناک تھیں۔ ایک تو یہ کہ گھٹام نے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ ساوہتا ہمیں اس کی پڑوسن رہی ہے۔ دوسرے اسے خود پر افسوس ہوا۔ وہ دیکھ لیتی تھی۔ اور اسے بہر حال اپنی چمٹی حس پر اعتماد کرنا چاہیے تھا۔ اس کے لاشعور میں یہ شک پہلے سے موجود تھا کہ ساوہتا اشیش اور ساوہتا اجیت ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔ صرف گھٹام کی بات کی وجہ سے یہ شک اس کے لاشعور سے شعور میں نہیں آسکا تھا۔



اسے سڑی بہت زیادہ لگ رہی تھی۔ منہ کا ذائقہ بھی کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ لگتا تھا منہ میں بت بھر گئی ہے۔ کبیں دور سے اسے اجیت کی پکار سنائی دے رہی تھی۔ ”ساوہتا“ ہوا کیا ہے؟ نیچے کہاں ہیں؟“
اس نے ہاتھ کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ بے جان سا ہو کر اس کے پہلو میں

کہ استیفاء کا اہم ترین گواہ فوج کا میگزین ہونے کی وجہ سے روپوش ہو گیا۔ اگر اب بھی وہ مل جائے تو طرہ کے خلاف کیس دوبارہ شروع ہو سکتا ہے اور اگر اس بار بھی اس نے کوئی مضبوط اور مربوط دفاع پیش نہیں کیا تو اس کا پچھا محال ہے۔ شوہا۔“
کرن کو یاد تھا کہ چھ سات سال پہلے جب اس مقدمے کی ساعت ہو رہی تھی تو اس کی کارروائی کی رپورٹ پڑھ کر اس کے ذہن میں کئی سوال ابھرے تھے۔ اب وہ انہی سوالات پر اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہتی تھی۔

اس نے فائل سے مطلوبہ کاغذات نکال کر ترتیب سے رکھنے شروع کیے۔
ساوہتا کی وہ تصویریں بھی تھیں جو مقدمے کی ساعت کے دوران میں لی گئی تھیں لیکن وہ اتنی عمر کی لگتی نہیں تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ بیس اکیس کی نظر آتی تھی۔ وہ لباس بھی پچھلا ہنستی تھی۔ شاید یہ مشورہ اسے اس کے دیکل نے دیا ہو گا۔

ایک عجیب بات تھی جب کرن نے یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اسی وقت سے اسے وہ کر احساس ہوتا تھا کہ اس نے طرہ کو کیس دیکھا ہے۔ خیر۔ یہ تو طے تھا کہ اس میں اجیت کی بیوی ساوہتا کی شباهت تھی بلکہ وہ اجیت کی بیوی کی چھوٹی بہن لگتی تھی۔ کون جانے، دونوں میں کوئی رشتہ داری ہو۔ لیکن ’میں‘ ساوہتا اجیت بہت پہلے اجیت کے اسسٹنٹ گھٹام کی پڑوسن رہی ہے اور گھٹام کا تعلق ہمیں سے تھا جبکہ ساوہتا اشیش دہلی کی تھی۔

گھٹام کے متعلق سوچتے ہوئے کرن کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ وہ بڑا خوب رو آوی تھا۔ خوش مزاج اور خوش اطوار بھی تھا۔ کرن شام کا اخبار لینے کیلئے نکلتی تو کچھ دیر کے لیے اجیت کی اسٹیٹ ایجنسی بھی چلی جاتی۔ اجیت اسے زمین کی خریداری کے سلسلے میں بڑے کام کے مشورے دیتا تھا۔ وہ اسے مقامی سرکاریوں میں شمولیت کے مشورے بھی دیتا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت پیارا اور مخلص آدمی تھا۔ کم عرصے میں ان کے درمیان دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

لیکن کرن کو احساس تھا کہ وہ اجیت کے دفتر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جانے لگی ہے اور اس کا سبب گھٹام تھا۔ گھٹام کی حس مزاج اس کی قربت کو پر لطف بنا دیتی تھی۔ جتنی دیر وہ گھٹام کے ساتھ رہتی، تھمتانی کے احساس سے نجات ملی رہتی۔

تھا کہ اب دار بھنگ جائے گی اور نئے سرے سے زندگی گزارنے کی کوشش کرے گی۔

اب تو میں بس مرجانا چاہتی ہوں، وہ سوچ رہی تھی۔ اب کیا فائدہ بیٹنے کا۔ اجیت تیر قدموں سے چل رہا تھا۔ اس نے اپنی جیکٹ اس کے بدن پر ڈال دی تھی مگر سرد ہوا اس کے سیلے پکڑوں سے گزر کر جسم کو جمیدے ڈال رہی تھی۔ اب اجیت مجھے نہیں بچا سکتا۔ چاہے بھی تو نہیں بچا سکتا۔ بہت دیر ہو گئی۔ نجانے کیوں ہمیشہ ہی دیر ہو جاتی ہے۔ پچھلی بار بھی یہی ہوا تھا۔ دیر ہو گئی تھی۔ اور تلاش کرنے والوں کو سہاڑ اور تباہی کی لاشیں ہی مل سکی تھیں۔ اب کے انہیں نوین اور اربلا بھی ویسے ہی ملیں گے جیسے سہاڑ اور تباہی لے رہے تھے۔ پلاننگ کے ایک ان کے چہروں پر چڑھے ہوں گے۔ ان کے جسم پانی میں رہنے کی وجہ سے سوچ گئے ہوں گے۔

اب شاید وہ گھر پہنچ گئے تھے۔ گھنٹام دروازہ کھول رہا تھا۔ ”میں پولیس کو کال کرتا ہوں اجیت۔“ وہ بولا۔

ساوٹا خوف سے سینٹے لگی۔ نہیں۔ نہیں۔ بھگوان کے لیے، نہیں۔ مگر اس سے کچھ کما نہیں گیا۔



واہ۔ بھگی صورت حال ہے۔ لوگ چیونٹوں کی طرح جمع ہو گئے ہیں۔ ساوٹا کے گھر کے باہر جھوم ہے۔ لوگ اس کے گھر میں بھی پلٹے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پورے جسم سے پسینہ ابل رہا تھا۔ پورا جسم تر تھا مگر ہونٹ خشک تھے۔ وہ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔

وہ بچوں کو سیدھا اوپر لے آیا تھا۔ دودھین والے کمرے میں۔ یہاں سے وہ باہر کی سرگرمیوں پر بھی نظر کرے گا اور بچوں پر بھی نظر رکھ سکے گا تاکہ وہ ہوش میں آئیں تو وہ بے خبر نہ ہو۔

اس نے سوچا کہ بچی کو نسلے گا اور اس کے جسم پر اچھی طرح بے بی پاؤڑ

مگر گید۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر اس سے بولا بھی نہیں گیا۔

پھر اس نے گھنٹام کی آواز سنی۔ ”اسے اٹھا کر گھر لے چلو اجیت۔ بچوں کی تلاش کیلئے تو ہمیں مدد لینی ہو گی۔“

ہنچے! وہ چوگی۔ ہاں، بچوں کو تو تلاش کرنا ہو گا۔ اس نے اجیت کو بچوں کے بارے میں تانے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔ آواز نہیں نکلی۔

”گھنٹام۔ اسے کیا ہوا ہے؟“ اجیت کے لیے میں گھبراہٹ تھی۔ ”پتھر کیا ہے؟“

”اجیت، ہمیں پولیس کی مدد لینی ہو گی۔“ گھنٹام نے کہا۔

”پولیس؟“ اجیت کے لیے میں پریشانی در آئی۔

”ہاں۔ بھیا۔ جلدی کرو ایک ایک پل جیتی ہے۔ مجھے کی کوشش کرو۔ اب تم ساوٹا کو تحفظ نہیں دے سکتے۔ وہ تصویر سب پہچان لیں گے۔“

تصویر! ساوٹا کو سیکرین یاد آیا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے اٹھا کر لے جایا جا رہا ہے اور وہ سروی سے کاپ رہی تھی لیکن اسے اس کی فکر نہیں تھی۔ وہ تصویر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تصویر جن پکڑوں میں تھی، وہ اس نے مقدمے سے نجات کے بعد خریدے تھے اور اس پر دوبارہ مقدمہ چلایا ہی نہیں گیا۔ افیش مرچکا تھا اور وہ پرکاش جو اس کے خلاف سب سے مضبوط گواہ تھا، روپوش ہو گیا تھا۔ استثناء اس پوزیشن میں ہی نہیں رہا تھا کہ اس پر دوبارہ مقدمہ چلا سکتا۔ لہذا اسے رہا کر دیا گیا لیکن وکیل استثناء نے کہا تھا۔ ”شرعیتی ہی، یہ نہ سمجھنا کہ بات ختم ہو گئی ہے۔ چاہے مجھے پورا جیون لگا دیا پڑے مگر میں تجیس سزا دلوا کر ہوں گا۔“

اس کے بعد اسے شہر چھوڑنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ اس نے پال چھوٹے کرائے اور رگھو رائے اور کچھ شاہنگ کی۔ تبھی اس نے وہ ساڑھی خریدی تھی جن میں اس کی تصویر ”گوستان“ میں چھپی ہے اور پھر وہ یہاں کیلئے روانہ ہو گئی تھی۔ یہ تصویر۔ ہاں، یہ تصویر لاری اڑے پر اتاری گئی تھی۔

اسے پتا نہیں چلا تھا کہ کسی نے اس کی تصویر کھینچی ہے۔ اس نے تو سوچا

اس نے ہاتھوں کی پست سے انھوں کو ملتے ہوئے پوچھا۔ ”ہم کہاں ہیں؟“
لڑکا ذہین تھا۔ چھوٹا تھا مگر اس بات کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی
ہے۔ پر اعتماد بچوں کو پنڈل کرنا آسان ہوتا ہے۔ وہ زیادہ پریشان بھی نہیں کرتے۔ خود
بھی پریشان نہیں ہوتے۔ اعتماد سے محروم بچوں کی طرح۔

”ہم مڑے کا ایک کھیل کھیل رہے ہیں۔“ اس نے لڑکے سے کہا۔ ”میں
تمہاری مٹی کا پرانا دوست ہوں۔ تمہاری مٹی برتھ ڈے کا ٹیم کھیلنا چاہتی ہیں۔ تمہیں
معلوم ہے، آج تمہاری مٹی کا برتھ ڈے ہے؟“
نورین نے کہا۔ ”مجھے یہ کھیل اچھا نہیں لگا۔“ وہ لڑکھاتا ہوا اٹھا اور اس نے
ارملا کی طرف ہاتھ دیا۔ ارملا اس سے لپٹ گئی۔ ”ہم اب گھر جائیں گے۔“ لڑکے
نے کہا۔

”اپنی بہن کو چھوڑ دو۔“ اس نے تھمنا۔ لہجے میں لڑکے سے کہا۔ لڑکے نے
قبیل نہیں کی تو اس نے بدور انہیں علیحدہ کیا پھر وہ لڑکے کو کھینچ کر دور بین کی طرف
لے گیا۔ ”تمہیں پتا ہے، دور بین کیا ہوتی ہے؟“

”ہاں ڈیڑی کے پاس بھی ہے۔ اس سے چیزیں بڑی نظر آتی ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔ تم ذہین لڑکے ہو اب ذرا دور بین میں دیکھو۔“

لڑکے نے آنکھ دور بین سے لگا دی۔

”مجھے تھوڑا، تمہیں کیا نظر آ رہا ہے۔“ اس نے فرمائش کی۔

”پولیس کی کئی گاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ کیوں کیا بات ہے؟“

اس نے لڑکے کے فکر مند چہرے کو مسرت سے دیکھا۔ کڑکی کی طرف سے
”نپ“ کی بھاری آواز سنائی دی۔ برف باری شروع ہو گئی تھی۔ ”تمہیں پتا ہے
بچے کو مرنا کیسا لگتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ آدمی مرتا ہے تو بیٹھوان کے پاس چلا جاتا ہے۔“ نورین نے جواب دیا۔
”بالکل ٹھیک اور آج تمہاری مٹی بیٹھوان کے پاس چلی گئی اسی لیے تو اتنی
پولیس آتی ہے تمہارے گھر۔ تمہارے ڈیڑی نے مجھ سے کہا کہ کچھ دیر کے لیے میں
تم دونوں کی دیکھ بھال کر لوں۔ تمہارے ڈیڑی نے تم سے بہن کا خیال رکھنے کو کہا

لے گا پھر وہ اسے پیار کرے گا۔ بچوں کے ساتھ اسے پورا دن گزارنا ہے۔ انہیں
ٹھکانے لگانے کیلئے اس نے سات بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ اس وقت پانی چڑھا ہوا ہو
گا اور اس وقت تک اندھیرا بھی ہو چکا ہو گا۔ نہ کوئی کچھ دیکھ سکے گا نہ سن سکے گا
اور وہ کئی دن تک پانی میں رہیں گے، تب کہیں ٹھکانے جائیں گے۔۔۔ بچہ باری
طرح!

کچے راستے پر کئی پولیس گاڑیاں آتی نظر آئیں۔ وہ ساوہتا کے گھر کی طرف جا
رہی تھیں۔ ان گاڑیوں کو دیکھ کر اس کے دل میں شکر گزاری کی لہر ابھری۔ اس نے
ساوہتا کا تصور کیا۔ کیا وہ رو رہی ہو گی؟ پچھلی بار پورے مقدمے کے دوران میں وہ
ایک بار بھی نہیں روئی تھی۔ یہاں تک کہ جج نے اسے موت کی سزا سنائی تھی۔
عدالت کے اہلکاروں نے اسے ہتھکڑیاں لگا دی تھیں۔ تب وہ روئی تھی لیکن اس کا
آنسوؤں سے تر چہرہ اس کے لیے بالوں میں چھپ گیا تھا۔

اسے وہ پہلا موقع یاد آیا، جب اس نے ساوہتا کو دیکھا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے
کیسپس میں تھی۔ وہ پہلی نئی فریضیں اس پر مرنا تھا۔ اس کے لیے بال بہت خوب
صورت لگ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بہت حسین تھیں اور پلکیں بے حد کھنی
تھیں۔

اسے ایک سسکی سنائی دی۔ کیا یہ ساوہتا ہے؟ لیکن نہیں؟ یہ تو ممکن نہیں۔ یہ
بچی کی آواز ہے۔ اس نے دور بین سے نظر ہٹائی اور پلٹ کر دیکھا۔ بچی میں ساوہتا کی
بہت زیادہ شبہات تھی۔ اس نے سوجا، بھینٹا اب دوا کے اثرات زائل ہو رہے ہوں
گے۔

بچوں کی بے ہوشی کو ایک ٹھنڈے ہو چکا تھا۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن
اسے دور بین کے پاس سے پٹا پڑا۔ اس نے بچوں کو کاؤچ پر ایک دوسرے کی مخالف
سمت میں لٹا دیا۔ بچی اب رو رہی تھی۔ اس نے اسے اٹھا کر اٹھایا اور اس کی جیکٹ
کی زپ کھولی۔ بچی سم کر اس سے دور ہو گئی۔ وہ بدن چرا رہی تھی۔ ”ڈر“ مت
بیاری ہو۔ سب ٹھیک ہے۔“ اس نے چکارا۔

اسی وقت لڑکا حرکت میں آیا اور سستی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”آپ کون ہیں؟“

ہے۔

نورین کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ”اگر می بیگوان کے پاس چلی گئی ہیں تو میں بھی بیگوان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“
اس نے لڑکے کے بالوں میں انگلیاں لہراتے ہوئے اس کے سر کو ہتھیلیا پھر اس نے ارملہ کو بلایا جو کھٹی کھٹی آواز میں رو رہی تھی۔ ”مگر مت کرو میرے بچو۔ تم بھی بیگوان کے پاس چلے جاؤ گے۔ آج رات یہ میرا وعدہ ہے۔“



دوپہر تک بچوں کی گمشدگی کی خبر وائز سروس تک پہنچ گئی۔ اخباری نمائندوں نے پرائی فیس کھلائی شروع کر دیں۔ بچوں کے قتل کے کیس کا پرائیڈ ریکارڈ ایک دم اہمیت اختیار کر گیا۔ بڑے اخبارات نے اپنے بہترین رپورٹرز کو دار جلتک کیلئے روانہ کر دیا۔

پورنیا میں ماہر نفسیات ایثور لال اس وقت لچ کی فکر میں تھا۔ اس کی موکلہ دیتا دیوی ابھی چند لمبے پہلے رخصت ہوئی تھی۔ ایک سال کی عمر پر ہی کے نتیجے میں اب وہ کافی بہتر ہو گئی تھی۔ آج تو اس نے بڑے اعتماد سے اپنا مذاق بھی اڑایا تھا۔ اسی لیے ایثور لال بہت خوش تھا۔

اس نے قریب رکھا ہوا ریڈیو آن کر دیا۔ خبریں آرہی تھیں۔ وہ خبر اس نے بھی سنی۔ اس کے چہرے پر اذیت کا تاثر ابھرا۔ پرانے ذمہ ہرے ہو گئے تھے۔ ساوہنا۔ ساوہنا ایشیش۔ انوراوا پٹیل کی بیٹی۔ چودہ سال پرانی بات تھی مگر وہ آج بھی انوراوا کا چہرہ تصور میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ خوبصورت چہرہ وہ دھلا چلا جسم اور وہ چاندی جیسی مسکراہٹ۔

انوراوا اپنے شوہر کی موت کے دو سال بعد اس کے پاس آئی تھی۔ اس کے پاس نفسیات کی ڈگری تھی۔ اور وہ کچھ کرنا چاہتی تھی۔ ایثور لال نے بخوشی اسے اپنے معاون کی حیثیت سے رکھ لیا۔ وہ عمر میں اس سے چار سال چھوٹی تھی۔ وہ بہت ذہین تھی۔ اور لوگوں کو سمجھنے کی اس میں فطری صلاحیت موجود تھی جو کہ کسی بھی

ماہر نفسیات کی کامیابی کیلئے سب سے ضروری ہوتی ہے۔

ایثور لال کو وہ پہلی نظر میں بھاگتی۔ اس وقت وہ اڑتیس برس کی تھی۔ وہ بہت اچھی نائب ہی نہیں، بہت اچھی ساتھی بھی تھی۔ ایثور لال نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ پابندیوں سے گھبراتا تھا اور اپنے آپ میں گمن تھا مگر انوراوا سے ملنے کے بعد پہلی بار اس کے دل میں شادی کی خواہش جاگی۔

انوراوا نے اس پر کھلنے میں وقت لیا۔ وہ بتدریج اور بہت آہستہ آہستہ اس پر کھلی۔ اس نے ایک پائلٹ سے شادی کی تھی۔ اس کی ایک بچی تھی۔ ساوہنا۔ اس کی ازدواجی زندگی بے حد خوش گوار تھی پھر نمونیا نے اس کے شوہر کو اس سے چھین لیا۔ اس کے شوہر نے اس کیلئے کافی دولت چھوڑی تھی۔ کام اس کی ضرورت نہیں، شوق تھا۔

ایثور لال انوراوا کی بیٹی سے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ بیٹورشی میں پڑھتی اور ہوسٹل میں رہتی تھی۔ تنہائی سے گھبرا کر انوراوا کو کام کا خیال آیا تھا۔

پھر نومبر کے مہینے میں انوراوا نے اس سے چند روز کی چھٹی مانگی تھی۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے علی گڑھ جا رہی تھی۔ ایثور لال اسے چھوڑنے ایشیش گیا۔ ”راوا! پتا ہے، میں تجھیں بہت مس کراؤں گا۔“ اس نے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر کہا تھا۔

”مجھے امید تو یہی ہے۔“ انوراوا نے جواب دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پرچھائیاں سی تھیں۔ ”دراصل میں پریشان ہوں۔ پچھلے عرصے سے ساوہنا کے خط کم ہی آ رہے ہیں۔“

”میں تمہارے ساتھ چلوں؟“

”اے نہیں۔ میں ماں ہوں نا۔ انہیں بچوں کیلئے پریشان ہوتی ہی رہتی ہیں۔“
نجانے کیسے ان کے ہاتھ مل گئے۔ ”پریشان مت ہو۔ بچے بڑے ہوتے ہیں تو مصروفیات آڑے آنے لگتی ہیں اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بلا لینا۔“

”نیکو تمہیں دمت۔“

اسی وقت گاڑی نے سٹیج بجائی۔ انوراوا اپنے کپارمنٹ کی طرف بڑھی۔
”او۔“ جس میں شاید علم نہیں کر میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

لوہہ کی حیثیت سے نامزد کیا گیا تھا۔ اسے تو برسوں بعد یہاں آنے پر اس کے متعلق معلوم ہوا۔ مگر اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ ساوہتا اب کہاں ہے؟

لندن میں اس کی ملاقات سرتا سے ہوئی۔ انوراوا کی مختصر سی رفاقت نے اسے احساس دلایا تھا کہ تنہائی کی زندگی بت بے کیف ہے۔ سرتا کا تعلق بھی اسی کے شعبے سے تھا۔ دونوں نے شادی کر لی۔ سرتا بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی لیکن ایوٹر لال اکثر ساوہتا ایشیش کے بارے میں سوچتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ وہ بے چاری اتنے بڑے اے لیے سے گزری تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ اس کے اتنا قریب ہے۔

انٹرکام چننا۔ اس نے ریسپور اٹھا یا۔ ”ہیکم صاحب کا فون ہے۔“ سیکریٹری نے اسے بتایا۔

اگلے ہی لمحے سرتا کی آواز ابھری۔ ”الہش۔۔۔ تم نے اس لڑکی ساوہتا کے متعلق سنا؟“ وہ پریشان لمبے میں پوچھ رہی تھی۔

”ہاں سرتا۔“ وہ سرتا کو انوراوا اور ساوہتا کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔

”تو کیا ارادہ ہے؟“

اس سوال نے اسے فیصلے پر پہنچنے میں مدد کی۔ ”میں وہ کروں گا جو برسوں پہلے نہ کر سکا۔ یہ کفارہ ادا کرنے کا موقع ہے میرے لیے۔ میں اس کی جو مدد کر سکتا ہوں کروں گا۔ جیسے ہی موقع ملے، میں تمہیں فون کروں گا۔“

”تو تم وار بٹلنگ جا رہے ہو؟“

”ہاں ڈیئر۔“

”گھنٹہ لک۔“

ایوٹر لال نے اپنی سیکریٹری کو تمام اپائنٹ منٹ کنسل کرنے کی ہدایت کی۔ ”انہیں بتا دینا کہ یہ ابھر چکی ہے۔ میں ابھی وار بٹلنگ جا رہا ہوں۔“



”میں جانتی ہوں۔ اور مجھے خوشی ہے۔ اور میں بھی۔“ وہ ان کی ایک جاتی کا آخری لمحہ تھا۔ محبت کی کھلی کھلی تھی لیکن وہ کھلی پھول کبھی نہ بن سکی۔

اگلے روز انوراوا نے اسے فون کیا تھا۔ ”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے اس وقت میں ایک ریسٹورنٹ سے بات کر رہی ہوں۔ ساوہتا کے ساتھ کھانا کھانے آئی تھی۔ پہنچ کر میں تمہیں فون کروں گی۔ تم گھر پر ہی ہو گے نا؟“

وہ رات بھر فون کا انتظار کرتا رہا لیکن انوراوا نے فون نہیں کیا۔ اگلے روز اسے حادثے کا پتہ چلا۔ انوراوا نے جو کار کرائے پر لی تھی، اس کا انسینزنگ ڈرائیو کے دوران میں ٹکارتا ہو گیا تھا۔ کار بے قابو ہو کر ایک ٹرک سے ٹکرائی تھی۔ انوراوا موقع پر اپنی ختم ہو گئی تھی۔

اسے اس وقت ساوہتا کے پاس جانا چاہیے تھا۔ وہ ارادے باندھتا اور توڑتا رہا اور جب اس نے اس پر عمل کیا تو اس کی ساوہتا کے بجائے ایشیش کمار سے بات ہوئی۔ تب اسے پتا چلا کہ ساوہتا اس سے شادی ہو چکی ہے۔ ایشیش کمار کے لیے اس میں جو اتھارنٹ تھی، وہ اسے اچھی نہیں لگی۔ ایشیش بیوروکریسی میں پروفیسر تھا۔ اس نے بتایا کہ اس رات انہوں نے انوراوا کو بتا دیا تھا کہ وہ شادی کرنے والے ہیں۔

انوراوا کو اعتراض تھا کہ ساوہتا ابھی بہت کم عمر ہے۔ ”ان کا اعتراض فطری تھا۔“ ایشیش نے بتایا ”اور وہ اپنے ہوٹل واپس جا رہی تھیں کہ حادثہ ہو گیا۔ ساوہتا کو بہت صدمہ تھا مگر میں نے اسے سنبھال لیا۔ شادی اسی لیے جلدی کرنی پڑی کہ میں اس صورتحال میں اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔“

اب ایوٹر لال کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ساوہتا سے تعلق جڑنے سے پہلے ہی نوٹ چکا تھا۔ آواز سے ایشیش ٹھیک ٹھاک اور پراہٹو آوی لگتا تھا۔ آخر پروفیسر تھا۔ انوراوا کو پریشانی یہ ہو گئی کہ ساوہتا نے صرف اٹھارہ سال کی عمر میں شادی کا فیصلہ اپنے طور پر کیا ہے مگر اس سلسلے میں وہ کچھ نہیں کر سکتی تھا اور اب تو شادی بھی ہو گئی تھی۔ نہ ہوئی ہوتی تو بھی اسے کوئی اختیار تو نہیں تھا۔

پھر ایوٹر لال کو ایک اچھی آفر ہوئی اور وہ لندن چلا گیا۔ کئی برس وہ وہاں رہا۔ وہاں اسے قتل کے اس کیس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا۔ جس میں ساوہتا کو

ہستان، ”کا وہ آرٹیکل؟ اس نے سراٹھا کر دیکھا۔ عقیبی دروازے پر پولیس والا کھڑا
رہا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

”کیا بات ہے؟“ دیال شکر نے پوچھا۔

”سادھنا بچوں کو نقصان پہنچانے کی ملاحیت نہیں رکھتی۔ جو کچھ بھی ہوا ہو،
وہنا ایسا نہیں کر سکتی۔“

”تمہاری بیوی ہوش و حواس میں واقعی ایسا نہیں کر سکتی لیکن میں نے ایسے
حالت دیکھے ہیں جب وحشت اور خوف کے زیر اثر آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ کچھ
لی جس کی اس سے امید نہیں رکھی جا سکتی۔“ چیف دیال نے کہا۔

اجیت اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چیف کو دیکھا لیکن درحقیقت وہ اسے نہیں دیکھ
ہوا۔ ”مجھے مدد کی ضرورت ہے۔“ حقیقی مدد کی۔ ”وہ بڑبڑایا۔

گھر میں ابھری پھیلی ہوئی تھی۔ پولیس والوں نے پورا گھر چھان مارا تھا۔ پولیس
فوفو گرافر کچن میں تصویریں اُتار رہے تھے۔ چائے کی الٹی ہوئی دیکھی ان کی توجہ کا
مکڑ تھی۔ چائے جو گری تھی وہاں داغ پڑے گئے تھے۔ اوہ ٹیلی فون کی مکھی مسلسل
بچے جا رہی تھی۔

ایک پولیس والے نے کال ریسرو کی اور پھر میز کی طرف آیا۔ ”خبر عام ہو چکی
ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اس علاقے میں پریس والوں کی فوج موجود ہوگی۔“

پریس والے! سادھنا کتنی ڈرتی۔ کتنا گھبراتی ہے۔ وہ چیف دیال کے پاس
سے گزرا اور اوپر بائسٹریڈ روم کی طرف چل دیا۔

ڈاکٹر، سادھنا کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ سادھنا کے ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ اجیت
نے مشکل سے سادھنا کو ہینکے ہوئے کپڑوں سے نجات دلا کر دو سرے کپڑے پہنائے
تھے۔ اب وہ زرد رنگ کے اوٹی گاؤن میں تھی اور وہ بہت سخی ہوئی، بہت چھوٹی سی
لک رہی تھی۔

اجیت سادھنا پر جھک گیا۔ ”جان پلیز، تمہیں بچوں کی خاطر خود کو سنبھالنا ہے۔
دیکھو، یہ ضروری ہے کہ بچوں کو جلد از جلد تلاش کر لیا جائے۔ سادھنا پلیز۔ تم یاد
کر لے کی کوشش کرو۔“

”فی الوقت ہم لوگ جمیل کھال رہے ہیں اجیت۔ خبر ریڈیو اور ٹی وی پر آ چکی
ہے۔ باہر سے مدد کی ضرورت ہے جو طلب کر لی گئی ہے۔“ چیف آف پولیس دیال
شکر نے اجیت سے کہا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے لیے میں مایوسی نہیں
خوش امیدی ہو اور۔ خوش دلی ہو لیکن اس کیلئے یہ کام دشوار تھا۔ اس کے خیال
میں اجیت نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو اس سے متعارف کراتے وقت
جو کچھ کہا تھا، سب جھوٹ تھا۔ اسے سچ بولنا چاہیے تھا اور اسے خود پر بھی غصہ تھا کہ
پولیس چیف ہونے کے باوجود وہ اس معاملے میں گمزیب محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اسے
شہر بھی نہیں ہوا تھا۔

چیف دیال شکر کیلئے وہ سیدھا سادہ کیس تھا۔ اس اوجھلے نے اختیار دیکھا اسے
احساس ہوا کہ اب پورا علاقہ اسے بچان لے گا۔ سب اس کی حقیقت جان لیں گے۔
یہ سوچ کر وہ ہلکا ہو گئی ہوگی۔ اس پر وحشت اور جنون طاری ہو گیا ہو گا اور اس
کیفیت میں اس نے ان بچوں کے ساتھ وہی کچھ کیا ہو گا جو برسوں پہلے اپنے پہلے
بچوں کے ساتھ کیا تھا۔

اس نے اجیت کو بہت غور سے، ٹوٹلے والی نظروں سے دیکھا۔ اس کا اندازہ
تھا کہ اجیت بھی کم و بیش اسی انداز میں سوچ رہا ہے۔ ”ڈاکٹر کہتے اوپر ہی ہے؟“ اس
نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ہے بھگوان۔“ اجیت نے کہا اور ڈاکٹر کیلئے کے ساتھ پڑی کرسی پر
بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ وہ خود کو ہی اس واقعے کا ذمے
دار سمجھ رہا تھا۔ شاید سالگرہ منانے کی ضد کر کے اس نے سادھنا کے اندر عدم تحفظ
کا احساس جگا دیا تھا اور اس کے نتیجے میں دہی ہوئی وحشت ابھر آئی تھی اور اس پر ستم

”خود کو سنبھالو میری جان۔ اس سلسلے میں تو ہمیں ہمدردی کی ضرورت ہے۔
 تم بتاؤ۔ ہر بات۔ بس خود کو چند منٹ کیلئے سنبھال لو۔“
 گھنٹھام اسی وقت گرم کافی کی پیالی لے آیا۔ ”یہ لو کافی۔ سادھنا کا کیا حال ہے
 ب؟“

”ہوش میں آئی تو ہے۔“
 ”چیف دیال اس سے بات کرنے کیلئے مڑا جا رہا ہے۔“
 اچانک سادھنا کی آنکھوں سے خوف جھٹکنے لگا۔ ”اجیت۔ بھگوان کیلئے۔“
 ”یہ ضروری ہے جان۔“ اجیت نے اس کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”بچوں
 کو تو تلاش کرنا ہے نا۔“

سادھنا نے کافی کا ایک طویل گھونٹ لیا۔ کاش۔ وہ سوچ پائے۔ کاش۔ یہ
 ہمدردی وعدہ لاہٹ دور ہو جائے۔ اسے اپنے ہونٹ ریر کے بنے محسوس ہو رہے تھے
 لیکن اسے بات تو کرنی تھی۔ اسے نیچے جانا تھا۔ اسے بچوں کی تلاش میں مدد کرنی
 تھی۔

وہ ڈنگ گاتے ہوئے اٹھی۔ پوری قوت ارادوی استعمال کرتے ہوئے دروازے کی
 طرف بڑھی۔ اجیت نے اسے کمرے تمام کر سہارا دیا لیکن سادھنا کو ایسا محسوس
 ہوا تھا جیسے اس کے پاؤں ہیں ہی نہیں۔ اجیت کے سہارے وہ بیڑھیاں اترنے لگی۔
 چیف دیال شکر ڈانگ روم میں موجود تھا۔ سادھنا کو اس کا رویہ معاندانہ
 محسوس ہوا۔ پچھلی بار بھی پولیس آفیسر کا رویہ ایسا ہی تھا۔
 ”اب کیا حال ہے شریستی جی؟“ چیف نے پوچھا۔

وہ بڑا بے پروا سوال تھا۔ جیسے رسا کیا گیا ہو جیسے اس کی کوئی پروا نہ ہو کہ
 پاپر گیزر رہی ہے۔ ”اب میں ٹھیک ہوں۔“

”ہم بچوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم بہت جلد کامیاب ہو
 میں گے۔ لیکن آپ کو ہماری مدد کرنی ہوگی۔ آپ نے آخری بار بچوں کو کب دیکھا
 ہے؟“

”دس بجتے سے ذرا پہلے۔ میں نے انہیں کھینچنے کیلئے باہر بھیجا اور خود کام سے

”اجیت۔ اسے مت چھیڑو۔“ ڈاکٹر کھنہ نے کہا۔ ”یہ شاک کی حالت میں
 ہے۔ شدید شاک کی۔ اس کا دماغ اس صدمے سے لڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے
 نے اسے پرسکون کرنے کیلئے دوا دی ہے۔“

”لیکن ہمیں پتا تو چلے کہ صورت حال کیا ہے۔“ اجیت نے کہا۔ ”ممکن ہے
 اس نے کسی کو بچوں کو لے جاتے دیکھا ہو۔ سادھنا۔ سنو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں تم
 بیٹھ سکتی ہو۔ پلیز خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو جان۔“

سادھنا کا وجود مختصر ضرور لگ رہا تھا مگر وہ زیادہ بھاری لگ رہی تھی۔ شاید اس
 لیے کہ پوری طرح ہوش میں نہیں تھی اور اس نے بدن ڈھیلا چھوڑا ہوا تھا۔ سادھنا
 کو خود اپنا وجود بھاری اور مدھلا محسوس ہو رہا تھا۔ اس رات سے جس رات مئی کو
 حادثہ پیش آیا ہوا تھا۔ بہت عرصے تک وہ ایسا ہی محسوس کرتی رہی تھی۔ اسے وہ
 راتیں یاد تھیں جن میں اس کی پلکیں کسی بوجھ سے جھکی رہتی تھیں۔ اور وہ خود کو
 مدھلا محسوس کرتی تھی۔ ان دنوں اشیش اس کا کتنا خیال رکھتا تھا۔ کتنے قہقہے
 کام لیتا تھا وہ۔

لیکن اس وقت وہ اس کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ نہ اشیش کے
 بارے میں، نہ پرکاش کے بارے میں۔ پرکاش وہ خوب رو طالب علم جو فوج کی طرف
 سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جو فوجی تھا۔ وہ شاید اسے پسند کرنے لگا تھا۔ پرکاش کی
 موجودگی میں بچے کتنے خوش رہتے تھے۔ وہ پرکاش کو بہت اچھا دوست سمجھنے لگی تھی۔
 اجیت اسے اٹھا کر بٹھا رہا تھا۔ ”ہاں شاہاں۔ بہت کرو سادھنا۔ ڈاکٹر۔ اسے
 کافی دیں۔؟“

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں گھنٹھام سے کہتا ہوں۔“
 کافی۔ چائے! وہ چائے تو بنا رہی تھی، جب اس نے اخبار میں وہ آرٹیکل
 اور تصویر دیکھی تھی۔ سادھنا نے آنکھیں کھول دیں۔ ”اجیت۔“ اس نے سرکشی
 میں کہا۔ ”اب سب لوگ جان جائیں گے۔ سب کو معلوم ہو جائے گا۔“ وہ کہتے کہتے
 رکی۔ اس سے زیادہ اہم ایک اور بات ہے۔ ہاں۔ بچے!“ اجیت نے بچے کہاں ہیں۔
 انہیں تلاش کرو۔“

اوری بیشہ دستاے کوئی رہتی ہے۔ میں جمیل کی طرف گئی۔ مجھے بچوں کو واپس لے کر آنا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ چھپلی باری طرح اس بار بھی۔“ اس سے آگے بولا نہیں گیا۔

چیف دیال فکسر سنسبل کر بیٹھ گیا۔ ”سادھنا دیوی“ آپ کو یہ بتانا میرا فرض ہے کہ آپ کو وکیل سے قانونی مشورہ لینے کا حق حاصل ہے۔ اس کے بعد ہی آپ میرے سوال کا جواب دیں کیونکہ آپ کا جواب عدالت میں آپ کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔“ اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اٹھ کر عقیقی دروازے کی طرف چل دیا۔ باہر نمٹے سنے گالوں کی صورت میں برف گر رہی تھی۔ چیف پولیس کار میں بیٹھا اور اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”جمیل کی طرف چلو۔“



وہ علاقے کی سب سے بڑی اور سب سے گہری جمیل تھی۔ اس وقت جمیل کے کنارے تماشائیوں کا جھوم تھا۔ وہ خاموشی سے پولیس کے غوطہ خوروں کو کام کرتے دیکھ رہے تھے۔ ری کی مدد سے جمیل کے اس حصے کو الگ کر دیا گیا تھا جسے اس وقت کھٹاکا جا رہا تھا۔ پولیس بڑے مرتب انداز میں کام کر رہی تھی۔ چیف سیدھا گھیاں کے پاس گیا جو اس مہم کا انچارج تھا۔ اس نے کچھ پوچھا بھی نہیں تھا کہ گھیاں نے کدے سے اچکا دلیہ۔ یہ اس سوال کا جواب تھا جو چیف اس سے کرنا چاہتا تھا۔

چیف نے برف پر پاؤں مارا۔ وہ جھینلا رہا تھا۔ غوطہ خور اپنی جان کا خطرہ مول لے کر یہ کام کر رہے تھے۔ صرف سادھنا اجیت کی وجہ سے۔ جھوٹا ہی جانتا ہے کہ بچے کب ملیں گے۔ یہ ہے قانون اور انصاف کا گورکھ دھندا۔ صرف ایک شکمنکی عذر کی بنا پر ایک قاتل کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا جبکہ اس پر جرم ثابت ہو چکا تھا۔ صرف اس غیبا پر کہ ایک جھالاک وکیل نے جھوٹ کو متاثر کر دیا تھا۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ کیس میں سے انصافی ہوئی ہے۔ اہم گواہوں نے جانبداری سے کام لیا ہے۔ ”گھیاں“ یہ لوگ کب تک تلاش جاری رکھیں گے؟“ چیف نے پوچھا۔

اوپر چلی گئی۔“

”آپ اوپر کتنی دیر رہیں؟“

”دس منٹ۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ۔“

”پھر آپ نے کیا کیا؟“

”میں بیچے آئی اور واشنگ مشین لگائی پھر مجھے میگزین نظر آیا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔“

”اور آپ نے وہ آرٹیکل دیکھا جو آپ کے بارے میں چھپا ہے۔“

سادھنا سامنے دیکھتی رہی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”وہ آرٹیکل دیکھنے کے بعد آپ کا کیا رد عمل تھا؟“

”میرا خیال ہے“ میں چیخ پڑی تھی۔ اور پتا نہیں۔“

”آپ چائے بنا رہی تھیں؟“

”میں چائے گرم کر رہی تھی۔ میرا ہاتھ لگا تو دبیچی الٹ گئی۔ وہ میں سے بھینکی نہیں تھی، ہاتھ نکلنے سے الٹ گئی تھی۔ آرٹیکل دیکھ کر مجھے لگا کہ میں بھٹ جاؤں گی۔ کچھ ہو جائے گا مجھے۔ میں جانتی تھی، سب کہیں گے کہ میں نے بچوں کو مارا تھا اور یہ بات نوین اور ارملہ کو نہیں معلوم ہوئی چاہیے۔ میں نے میگزین کو جلا کر آتش دان میں ڈال دیا۔ وہ جل رہا تھا میری نوین اور ارملہ کو بلانے کے لیے نکل۔“

”بچے نظر آئے آپ کو؟“

”نہیں۔ میں نے انہیں پکارا وہ نظر نہیں آئے تو میں جمیل کی طرف دوڑ

گئی۔“

”دیکھئے، یہ بات بہت اہم ہے۔ آپ جمیل کی طرف کیوں گئیں؟ اجیت کا کتا ہے کہ بچے کبھی جمیل کی طرف نہیں گئے۔ آپ نے انہیں منع کیا تھا اور انہوں نے کبھی نافرمانی نہیں کی۔ آپ نے انہیں سڑک پر تلاش کیوں نہیں کیا؟ جنگل میں کیوں نہیں گئیں آپ؟ جمیل ہی کیوں؟“

”کیونکہ میرے سمجھش اور تبصا بھی ڈوب گئے تھے اور اس لیے کہ مجھے نوین اور ارملہ کو تلاش کرنا تھا۔ اوری کا دستاں مجھے جھوٹے کی ری سے الجھا ہوا ملا تھا۔“

”یہ درست ہے۔“ چیف دیال نے کہا۔
 ”اور یہ سادھنا دیوی اس علاقے میں کب سے رہ رہی ہیں؟“
 ”میرا خیال ہے، چھ سال ہی ہوئے ہیں۔“
 ”شکریہ چیف۔“

○

”دو حصوں کو چپک کیا جا چکا ہے فی الحال یہ ایک اور حصہ چپک کریں گے پھر
 وقفہ ہو گا۔“ گپال نے کہا اور فی دی کے محلے کی طرف اشارہ کیا۔ ”لگتا ہے، آج کی
 خبروں میں ہمیں بہت اہمیت دی جائے گی۔ بہتر ہے کہ آپ بیان تیار کر لیں۔“
 چیف دیال نے اپنے سر دی سے سن ہاتھ کو اور کوٹ کی جیب میں ڈالا اور
 ایک کانڈ نکالا۔ ”میں نے کچھ لکھا تو ہے۔“ وہ پڑھ کر سنائے لگا۔ ”بچوں کو بڑی تندی
 سے تلاش کیا جا رہا ہے۔ پورے علاقے کو چپک کیا جا رہا ہے۔ ہمیں رضا کاروں کی
 خدمات بھی حاصل ہیں۔ پہلی کاپڑوں سے بھی مدد لی جا رہی ہے لیکن اجیت پال کے گھر
 کے قریب واقع جمیل کو خاص طور پر ہم اہمیت دے رہے ہیں۔“ اس نے کانڈ کو تھپکی۔
 ”ٹھیک ہے نا؟“
 گپال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد چیف یہ بیان اخباری نمائندوں کو دے چکا تھا۔ ایک رپورٹر نے
 پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ بچوں کی گمشدگی کے بعد سادھنا دیوی کو جمیل کے پاس
 ہسٹریا کی کیفیت میں پایا گیا تھا؟“
 ”یہ درست ہے۔“

اس کے بعد تو سوالات کا آلتا بندھ گیا۔ ”سادھنا دیوی کو ”کومستان“ میں چھپنے
 والے آرٹیکل کا علم تھا؟“

”میرا خیال ہے، انہیں علم تھا۔“

”ان کا رد عمل کیا تھا اس آرٹیکل پر؟“

”یہ مجھے معلوم نہیں۔“

”آپ کو آج سے پہلے سادھنا دیوی کے ماضی کے بارے میں علم تھا؟“

”نہیں۔ مجھے علم نہیں تھا۔“ چیف دیال نے بمشکل خود کو دانت پیسنے سے

روکا۔ ”اور اب مزید سوالات نہ کریں۔“

چیف وہاں سے ہٹ ہی رہا تھا کہ ایک رپورٹر نے اس کا راستہ روک لیا۔

”سرگزشٹہ چھ برسوں میں خاص طور پر اس علاقے میں بچوں کے متعدد قتل ہوئے ہیں

جن میں سے بیشتر ابھی تک حل نہیں ہوئے۔“

”تو کیا آپ نے پروفیسر کی ہدایات کا خیال رکھا؟“
 ”میں ضرور رکھتا مگر اس صورت میں کیا کر سکتا تھا کہ ان کی جتنی تمام وقت میرے پیچھے، میرے ساتھ لگی رہیں۔“
 ”آج کل بکشن بور آئے۔“ وکیل صفائی تیزی سے اٹھا مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔
 تاثر مرتب ہو چکا تھا۔

”اچھا۔ آپ کا سادھنا دیوی سے جسمانی رابطہ قائم ہوا؟“ وکیل استغاثہ نے ایک اور سوال کیا۔

”گواہ پر کاش نے ڈائریکٹ جواب دیا۔“ جی نہیں جتنا۔“

”یہ کیسے ہوا؟“

”بات یہ ہے کہ چند روز بعد میں چولے کا ایک پارٹ لے کر دوبارہ گیا۔ وہاں میں انہیں چولے کا امیر جی سوچ دکھا رہا تھا۔“

”پروفیسر نے تم سے کہا تھا کہ ان کی جتنی کو کوئی زحمت نہ دنا۔“

”میں کیا کرتا وہ چولے کے سٹم کو کھینے کی ضد کر رہی تھیں۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا اس میں حرج بھی کیا ہے۔ چنانچہ میں نے انہیں چھو لیا۔“
 مسز اشیش کا کیا رد عمل تھا؟

”بے حد خوش گوار۔ انہیں اچھا لگا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔“

”آپ ذرا تفصیل سے بتائیں کہ کیا ہوا تھا؟“

”میں نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور انہیں اچھا لگا پیار کر لیا۔ کوئی ایک منٹ بعد انہوں نے نرمی سے مجھے ہٹا دیا لیکن ان کے انداز میں بے دلی تھی جیسے وہ مجھے ہٹانا نہیں چاہتی ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے یہ بت اچھا لگا۔“
 ”مسز اشیش نے کیا کہا؟“

”انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور یوں جیسے مجھ سے مخاطب نہ ہوں، بولیں۔ میں یہاں سے فرار چاہتی ہوں اور جتنا، میں کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ دیکھیں میں آری کی طرف سے تعلیم کیلئے یونیورسٹی بھیجا گیا ہوں۔ یہاں سے نکال دیا جاتا تو آری میں بھی میرے خلاف کارروائی ہوئی چنانچہ میں نے کہا۔ سادھنا جی، ہم

کرن کیلئے یہ بہت بڑا شاک تھا کہ سادھنا اجیت ہی درحقیقت بدنام زمانہ سادھنا اشیش ہے مگر اس شاک سے سنبھل کر وہ اپنے شیڈول کے مطابق اس کے کیس پر کام کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

اس نے ”کوستان“ کے آرٹیکل سے اشارت لیا مگر اس نے سادھنا اشیش کی پچھلی ازدواجی زندگی کی تفصیلات کا جائزہ لیا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر کی نوجوان بیوی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ گھر کیپس ہی میں تھا۔ میاں بیوی کی عمروں میں بہت فرق تھا مگر اس کے باوجود وہ ان کی زندگی نارمل تھی۔ کم از کم اس لمحے سے پہلے جب پروفیسر اشیش نے اپنے خوب رو شاگرد پر کاش کو گیس کے چولے کی مرمت کیلئے اپنے گھر بھیجا۔

اس نے مقدمے کے دوران میں پر کاش کی شہادت کے اقتباسات چمک کیے۔
 پر کاش نے بتایا تھا کہ وہ پہلی بار سادھنا سے کب ملا۔

”جس وقت پروفیسر صاحب نے چولے کی شکایت کے بارے میں اپنی بیوی کی کال ریسرو کی میں آفس میں موجود تھا۔ میں ٹیکنیکل ذہن کا آدمی ہوں۔ کوئی چیز ایسی نہیں تھی میں ٹھیک نہیں کر سکتا ہوں۔ میں نے پروفیسر صاحب کو اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ چاہتے تو نہیں تھے کہ میں جاؤں مگر کوئی تکنیک نہیں ملا تو مجبور ہو گئے۔“

”انہوں نے آپ کو اپنی فیملی کے متعلق کوئی خصوصی ہدایت دی؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی جتنی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی لہذا میں انہیں کوئی زحمت نہ دوں۔ کوئی مسئلہ ہو تو انہیں فون کر لوں۔“

ایسی ترکیب کر سکتے ہیں کہ ملتے بھی رہیں اور کسی کو پتا بھی نہ چلے لیکن آپ گھرو
نہیں چھوڑ سکتیں۔ دیکھیں نا، آپ کے بچے ہیں۔“

”اس پر سزا پیش کیا رد عمل تھا؟“

”عجیب سی بات ہے۔ اسی وقت ان کا بیٹا سبکدوش آگیا۔ وہ بہت خاموش طبع
اور سما سما بچہ تھا۔ کبھی چوں بھی نہیں کرتا تھا۔ سزا پیش کو غصہ آگیا۔ وہ بولیں
”لیکن ان بچوں کا تو گھاکھونٹ دیا جائے گا۔“

”شری پرکاش“ یہ بات بہت اہم ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ آپ سزا پیش کے
الفاظ دہرا رہے ہیں؟“

”جی جنتاب۔ مجھے یقین ہے لیکن کسی ماں کی ایسی بات کو کوئی بھی سنجیدگی سے
نہیں لے گا۔“

”یہ کس تاریخ کی بات ہے؟“

”13 نومبر“ وکیل استغاثہ نے ڈرامائی انداز میں دہرایا ”اور چار دن بعد
دونوں بچے اپنی ماں کی گاڑی سے غائب ہو گئے اور پھر ان کی لاشیں نہر سے برآمد
ہوئیں۔ ایسے کہ ان کے چروں پر پلاسٹک کے شاپر چڑھے ہوئے تھے۔ ان کی موت
دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ یہ گھاکھونٹا ہی ہے۔“

وکیل صفائی نے تاثر کو کم کرنے کی کوشش کی۔ ”تو تم نے سزا پیش کو لینا
کی کوشش جاری رکھی؟“ اس نے ہچکتے ہوئے لمبے میں گواہ سے پوچھا۔

”نہیں جنتاب۔ وہ بچوں کو لے کر کمرے سے چلی گئیں۔“

”یہ تو صرف تمہارا دعویٰ ہے کہ سزا پیش نے تمہاری دست درازی کو
انجوائے کیا تھا۔“

”یقین کریں جنتاب۔ عورتوں کے معاملے میں مجھے کبھی دھوکا نہیں ہوا۔“

کرن نے گہری سانس لی اور سزا دہنا پیش کے بیان والے کاغذات نکال لئے۔
وہ انہیں پڑھنے لگی۔

”جی ہاں۔ اس نے مجھے پیار کیا تھا۔ میرا خیال ہے، مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ
ایسا کرنے والا ہے مگر میں نے اسے روکا نہیں۔“

”آپ کو یاد ہے کہ آپ نے بچوں کا گھاکھونٹنے کی بات کی تھی؟“ وکیل استغاثہ
نے پوچھا۔

”جی، مجھے یاد ہے۔“

”اس سے آپ کا کیا مطلب تھا؟“

کاغذات کے مطابق سزا دہنا کی آنکھوں میں خالی پن سا لہرا گیا۔ اس نے کھوئے
کھوئے لمبے میں جواب دیا۔ ”پتا نہیں۔ مجھے معلوم نہیں۔“

کرن نے سر جھٹکا۔ اس لڑکی کو تو گواہ کے کمرے میں کھڑا کرنے کی اجازت ہی
نہیں ملنی چاہیے تھی۔ اس نے وہاں اپنے یس کو خراب کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا
تھا۔ وہ خود اپنے خلاف سب سے موثر گواہ بن گئی تھی۔ کیوں؟ کیا گزری تھی اس کے
ساتھ۔ کرن نے سوچا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ الزام سے برکے ہونا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اخبار کے تراشوں سے نہٹ کر کرن نے شوہا کی دی ہوئی ضخیم فائل کھول لی۔
وہ تیزی سے پڑھتی رہی۔ اس کا ذہن معلومات کو ترتیب دے رہا تھا۔ اہم حصوں کو وہ
خط کشیدہ کرتی جا رہی تھی۔

اطلاقی گھنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اسے
حیرت ہوئی کہ دروازے پر ایک پولیس والا کھڑا تھا۔ ”آپ کو زحمت دینے پر افسوس
ہے لیکن دیوی جی، ہم اجیت پال کے بچوں کی گمشدگی کے سلسلے میں کام کر رہے
ہیں۔“

کرن حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ پولیس انسپکٹر نے ایک نوٹ بک نکال لی۔
”آپ ہمیں رہتی ہیں نا؟“ اس نے پوچھا۔ ”کیلی؟“

”کیوں۔۔۔ اکیلے رہنا جرم ہے کیا؟“



”یہ لپا لو سزا دہنا۔ طاقت آئے گی۔ تمہیں ضرورت ہے اس کی۔“ گھنٹام دلاسا
دینے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

سزا دہنا شدت سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

گھٹام نے سبڑوں کا سوپ ایک طرف رکھ دیا۔ شاید سوپ کی اشتہا انگیز خوشبو ساہنا کو مائل کر دے۔

”میں نے کل یہ بنایا تھا۔ بچوں کیلئے۔“ ساہنا نے بے تاثر لہجے میں کہا۔
”بچے بھوکے ہوں گے۔“

اجیت اسے پلٹائے ہوئے بیٹھا تھا۔ ”کیوں خود کو اذیت دیتی ہو۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

چیف دیال فکڑ جھیل سے سیدھا اجیت کے گھر آیا تھا۔ اس نے داخل ہوتے ہوئے ساہنا کی آخری بات سن لی تھی۔ اس نے بہت غور سے ساہنا کی نگاہوں کے خالی پن کو دیکھا۔ اس کا جسم اور ہاتھ ساکت لگ رہے تھے۔ چیف کا تجربہ کتنا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ اپنا نام بھی شاید ہی بتا سکے۔ ”اجیت۔ ذرا میرے ساتھ آؤ میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

اجیت نے ساہنا کے رخسار چھتپھٹائے۔ ”خود کو سنبھالے رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

چیف اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ جس طرح اجیت نے خود کو سنبھال رکھا تھا، اس پر اسے رشک آ رہا تھا، وہ یقیناً اپنی اعصاب کا مالک تھا۔

چیف دیال نے اپنی خود اعتمادی اور اٹھارنی کا یقین حاصل کرنے کے لیے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ صاف سترا تھا۔ فرنیچر پر گرد کا نام و نشان نہیں تھا۔ دیواروں پر جانے بچانے مناظر کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ ان میں ایک اجیت کے عقیقی گارڈن کی تصویر تھی۔ پھر غروب آفتاب کے وقت جھیل کی تصویر تھی جس میں کشتیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ کمرے کے عقب سے شائنی ہاؤس کے جھانکنے کا خوب صورت منظر بھی تھا۔ چیف دیال نے اکثر ساہنا کو علاقے میں گھوم پھر کر اسے بچھڑاتے دیکھا تھا مگر وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس نے دائرہ کار میں اتنی خوبصورتی اور مہارت سے کام کیا ہو گا۔

”چیف بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟“ اجیت کے سرو لہجے نے اسے چونکا دیا۔

”تم اپنی بیوی کیلئے وکیل کے کر رہے ہو؟“ چیف نے اکثر لہجے میں پوچھا۔

ایک لمحے کو اجیت کی آنکھوں سے بے یقینی جھلکی۔ چیف نے وہ تاثر سمجھ لیا۔

اجیت ابھی تک یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی بیوی گمشدہ بچوں کی مظلوم ماں ہے جسے ہمدردی کی ضرورت ہے۔

”میں نے کسی وکیل سے بات نہیں کی ہے۔“ بالاخر اجیت نے جواب دیا۔
”میرے خیال میں تلاش کا نتیجہ کبھی بھی وقت۔۔۔“

”اب کسی بھی وقت تلاش کا سلسلہ موقوف ہو جائے گا۔“ چیف نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ”موسم ایسا ہے کہ کچھ دیر بعد کچھ دیکھا ہی نہیں جاسکے گا مگر میں تمہاری جتنی کو پوچھ کچھ کیلئے پولیس اسٹیشن ضرور لے جاؤں گا۔ اگر تم نے وکیل نہیں کیا ہے تو سرکار کوئی بندوبست کر دے گی۔“

”تم یہ نہیں کر سکتے۔“ اجیت نے سخت لہجے میں کہا۔ اس نے خود پر قابو رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی ورنہ وہ پھٹ پڑتا۔ ”یہ تو ساہنا کو تباہ کر دے گا۔ برسوں سے ایک ڈراؤنا خواب اس پر مسلط ہے۔ برسوں پہلے بھی اس سے پولیس اسٹیشن میں پوچھ کچھ ہوئی تھی پھر اسے مردہ مگر لے جایا گیا تھا جہاں اس نے اپنے بچوں کی لاشیں شناخت کی تھیں۔ تم یہ تو سوچو کہ وہ اس وقت شاگ میں ہے۔ تم تو اسے کچھ بتانے کے قابل ہی نہیں بھڑو گے۔“

”اجیت۔ تمہارے بچوں کو تلاش کر کے لانا میری پہلی ذمہ داری ہے۔“
”ٹھیک ہے مگر یہ تو سوچو کہ وہ منحوس آرنیکل پڑھ کر ساہنا پر کیا گزر چکی ہے اور اس آرنیکل کے بارے میں سوچو۔ جس نے وہ آرنیکل چھپوایا ہے، وہ بھی تو میرے بچوں کو اغوا کر سکتا ہے۔“

”ہم اس پر بھی کام کر رہے ہیں۔ ایسے آرنیکل قبول کر لے جائیں تو میگزین آرنیکل لکھنے والوں کی بطور راہنمی دو سو روپے بھجواتا ہے مگر یہ بھی ہے کہ میگزین کا اشاف کوئی آرنیکل لکھتا ہے اور اسے کسی فرضی نام سے شائع کر دیا جاتا ہے۔“
”تم پتہ چلاؤ کہ وہ آرنیکل کس نے لکھا ہے۔“

”ہم نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔“ چیف دیال کے لہجے میں برہمی تھی۔ ”آرنیکل کے ساتھ جو خط تھا اس میں لکھا تھا کہ اگر یہ آرنیکل میگزین کیلئے قابل قبول ہو تو شرط یہ ہے کہ اسے 17 نومبر کی اشاعت میں شامل کیا جائے۔ ایڈیٹر

گھنٹام نے پر خیال لیجے میں کہا۔

”اس سے پہلے ہی بات ہوئی تھی کہ ہم جس وقت چاہیں، کسی کو مکان دکھانے کیلئے لا سکتے ہیں۔ کرائے نامے میں یہ شرط تحریر ہے۔ بس تم اسے فون کر کے بتا دو۔“

گھنٹام ہنپکھاتے ہوئے چلے کیلئے مڑا۔ وہ اس کڑے وقت میں اجیت اور مادھتا کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اجیت نے اسے بڑے مشکل وقت میں سارا دیا تھا۔ اس نے اسے خود اٹھادی دی تھی، کام کرنا سکھایا تھا۔ جیسے کا مقصد دیا تھا۔ اس پر بڑے احسانات تھے اجیت کے اور جب مادھتا یہاں آئی تھی تو۔۔۔ گھنٹام کو اس بات پر فخر تھا کہ مادھتا نے اس پر اعتماد کیا تھا۔ اس نے جو باتیں کسی کو نہیں بتائی تھیں، اسے بتا دی تھیں اور اس سے مشورہ مانگا تھا۔ کوئی پوچھتی تو اتنا مجبور نہ نہیں کرتا کسی پر مگر اب گھنٹام اور افسوس بھی ہو رہا تھا کہ وہ اس صورتحال میں ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتا۔

غیر کچھ کہے اس نے اپنا اوردور کوٹ اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ عینی دروازے سے نکل کر وہ اپنی پانچ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کی نظر بھولے پر پڑی۔ اسے پہچے یاد آگئے۔ اسے ان بچوں سے بہت پیار تھا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ مادھتا گھر کے کالوں میں ابھی ہوئی تھی تو اس نے مادھتا سے کہا تھا کہ وہ بے فکری سے اپنا کام کرے۔ وہ ادنیٰ کا بھی خیال رکھے گا اور توہن کو بھی سکول سے لے آئے گا۔ ”مجھے کچھ کاغذات کے سلسلے میں کورٹ جانا ہے۔“ اس نے کہا تھا ”واپسی میں بچوں کو آکس کریم میں کھلا دوں گا۔“ وہ دل گرختگی سے اس بھولے کو دیکھتا رہا جو بہت اڑا ہوا اور بے جان لگ رہا تھا۔ اسے احساس نہیں تھا کہ برف کے گالے اس کے چہرے پر گر رہے ہیں۔

”گھنٹام۔“ کسی نے پکارا۔

اس نے چونک کر سر اٹھا کر دیکھا کہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ”مجھے بچوں کے متعلق معلوم ہوا۔ بہت افسوس ہوا۔ میں اجیت سے بات کر لے آئی ہوں ممکن ہے، کچھ مدد کر سکوں۔“

نے مجھے بتایا کہ اس نے شرط کی قبولیت کے جوابی خط کو دو سو روپے کے چیک کے ساتھ 28 اکتوبر کو کے ایل رام داس کو دار بٹنگ پوسٹ آفس کی معرفت بھیج دیا تھا۔ دو دن بعد اسے وصول بھی کر لیا گیا۔“

”یہ کے ایل رام داس مر رہے یا عورت؟“ اجیت نے پوچھا۔

”ہمیں نہیں معلوم۔ کلرک کو خط یاد ہی نہیں اور چیک اب تک کیش نہیں کر لیا گیا ہے۔“

اجیت آتش دان میں دیکھ رہا تھا پھر اس کی نظریں کی تصویر پر پڑی جو مادھتا نے بنائی تھی۔ اس کے طلق میں گولا سا سنپنے لگا۔

”اجیت۔۔۔ مادھتا کو کپڑے تبدیل کراؤ۔ میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ پاپڑ۔“

ان دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ مادھتا ان کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ نمجانے کب اٹھ کر آگئی تھی اور دروازے کی چوکت کا سارا لپے کھڑی تھی۔

پھر اس کے پیچھے گھنٹام بھی نظر آیا۔ ”یہ آنے کی ضد کر رہی تھی۔ مانی ہی نہیں۔“ اس نے معذرت خواہانہ لیجے میں کہا۔

اجیت نے مادھتا کو لپٹا لیا۔ ”تم خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرو جان۔“

اس نے بے حد محبت سے کہا۔ ”تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا۔“

گھنٹام کو اس کے لیجے میں مایوسی محسوس ہوئی اس کا دل دکھنے لگا۔ وہ مصیبت میں مبتلا ان دوستوں کیلئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ”اجیت۔“ اس نے بھاری لیجے میں کہا۔ ”اس صورت حال میں تم سے کتنا مناسب تو نہیں لگتا لیکن بخواری لال جی آج دو بجے شادی ہاؤس کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ سودا بڑا ہے۔ کو تو۔۔۔“

”مجھے کوئی پروا نہیں سوہے کی۔“ اجیت نے بھنا کر کہا لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ ”سوری گھنٹام۔ پریشانی نے دماغ خراب کر دیا ہے۔ اگر تم انہیں لے جا کر شادی ہاؤس دکھا دو تو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔ تم اس کی ہر چیز سے واقف ہو۔“

”لیکن میں نے جسوقت کو بتایا نہیں تھا کہ آج ہم کوئی گاہک لا رہے ہیں۔“

”بہت اچھا کیا تم نے۔“ اس کے لیے میں فکر مندی سے گھٹام کو ڈھارس ہوئی۔ ”اجیت اور سلوہنا گھر میں ہی ہیں۔“

”میں نے ”کو“ ان“ میں وہ آرٹیکل بھی دیکھا۔“ کرن نے کہا۔

گھٹام کو اس بار کرن کے لیے میں سرد مری محسوس ہوئی۔ اس کی وجہ بھی وہ سمجھ گیا۔ اس نے کرن سے سلوہنا کے بارے میں بحث بولا تھا کہ وہ اسے بچپن سے جانتا ہے۔ وہ تھکے تھکے انداز میں ہانپ کر پڑھ گیا۔ ”میں چتا ہوں۔ مجھے دو بجے کسی سے ملنا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کرن کو کچھ کہنے کا موقع دے بغیر گنگ لگا کر موٹر سائیکل اشارت کی۔ یہ احساس اسے چہرے پر بعد ہوا کہ کرن کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا رہی ہیں۔

اب اسے اسٹیٹ ایجنسی پہنچنا تھا۔ وہاں اجیت کی کار موجود تھی۔ اسے بنواری لال کو اس میں لے کر جانا تھا۔



بیلی کا پھول کی آواز اس کیلے بے حد خوش کن تھی۔ اس کی وجہ سے اسے پچھلا موقع یاد آ رہا تھا۔ اس وقت بھی یونیورسٹی کیپس کے ارد گرد پھیلے ہوئے مچلوں کے علاقے کو بچوں کی تلاش میں چھان مارا گیا تھا۔

اس نے سامنے والی کھڑکی سے جمیل کو دیکھا مگر بے نیلے پانی پر برف کی بگی سی دھکتی جا رہی تھی۔ ٹھکے موسیات نے برقی طوفان کی پیش گوئی کی تھی اور اس بار خلاف معمول ان کی پیش گوئی درست ثابت ہو رہی تھی۔ ایسے موسم میں وہ بچوں کو زیادہ دیر تلاش میں کر سکیں گے۔ انہیں تلاش روکنی پڑے گی۔

اس نے سات بجے کا شیڈول بنایا تھا۔ وہ بچوں کو پلا خانے سے گزار کر اوپر لے جائے گا۔ اس وقت تک پانی بھی چھوٹا ہو گا۔ بس پھر وہ آسانی سے بچوں کو نیچے پانی میں گرا دے گا۔

ابھی اسے ساڑھے پانچ گھنٹے بچوں کے ساتھ گزارنے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکا خاصا خوب صورت ہے لیکن اسے بچی میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اس کی صورت سلوہنا سے بہت ملتی تھی۔

یہ سوچتے سوچتے وہ ایک دم کھڑکی کی طرف سے پلٹ آیا۔ دونوں بچے کاذوق پر ایک ساتھ پڑے تھے۔ اس نے دودھ میں انہیں خواب آور دوا ملا کر دی تھی۔ اور وہ اس کے زیر اثر سو رہے تھے۔ لڑکے نے بازو پھیلا کر بہن کو یوں لپٹا رکھا تھا جیسے اسے تحفظ دے رہا ہو لیکن جب اس نے جا کر بچی کو اٹھایا تو لڑکے کے جسم میں جنبش بھی نہیں ہوئی۔

بہت احتیاط سے وہ بچی کو بیلڈ روم میں لے گیا اور اسے لٹا دیا پھر وہ ہاتھ روم

مجبوری ہے۔ ابھی میں منٹ بعد میں ایک گاہک کو مکان دکھانے کیلئے لا رہا ہوں۔ آپ وہاں موجود ہوں گے یا میں اپنی چابی استعمال کروں؟“



ایسور لال اپنی گاڑی میں سڑ کر رہا تھا۔ تمام راستے اس نے ریڈیو لگائے رکھا۔ وہ خبریں سن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خبروں کے مطابق بچوں کی تلاش جاری تھی مگر ابھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی کوئی سراغ ملا تھا۔

دار بلیک پہنچ کر اسے اجیت کا مکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مکان سے پیچھے سڑک پر روٹی ہی روٹی تھی۔ ٹی وی کی گاڑی بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ پریس رپورٹرز کا جھوم بھی تھا۔ پولیس کی نگرانی اور گاڑیاں لگ گئیں۔ مکان کے دروازے پر پولیس کی ایک گاڑی موجود تھی۔ پولیس والے کسی کو اندر نہیں جانے دے رہے تھے۔ ایسور لال نے اپنی گاڑی روکی تو ایک پولیس والا اس کی طرف آیا۔ ”آپ یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں؟“ اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

ایسور لال کو اس بات کا اندازہ تھا۔ اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اس کی پشت پر کچھ لکھ کر اسے پولیس والے کی طرف بٹھا دیا۔ ”یہ کارڈ لے جا کر مزاجیت کو دے دو۔“

کارڈ دیکھ کر پولیس والا قدرے مودب ہو گیا۔ ”آپ انتظار کریں ڈاکٹر“ میں ابھی چیک کرتا ہوں۔“

ایسور لال کار سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔ پولیس والا فوراً ہی لوٹ آیا۔ ”میں اسکوڈ کار بٹاتا ہوں آپ اپنی گاڑی ڈرائیو وے میں لے جائیں۔ آپ اندر جا سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

ایسور لال کی گاڑی پریس رپورٹرز کے جھوم کے درمیان سے گزری۔ اس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور اندر چلا گیا۔ سادھا ڈارنگ روم میں آکھش وان کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دروازہ قامت اور خیرہ آدمی تھا۔ وہ یقیناً اس کا

میں گیا اور ٹب کا قلعہ کھول دیا۔ ٹب بھر گیا تو اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر چیک کیا۔ پانی کچھ زیادہ گرم تھا لیکن چند منٹ میں قدرے ٹھنڈا ہو جاتا۔

اس نے ایک کمری سانس لی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ خواہ مخواہ وقت برباد کر رہا ہے۔ اس نے جلدی سے کینٹ کھولی اور بے لی پاؤڈر کا وہ ڈبہ نکالا جو آج اس نے سپر اسٹور سے پار کیا تھا۔ رینا کی نظر پڑی تو اس نے پاؤڈر کا ڈبہ کھٹک کی جیب میں ڈال لیا۔ وہ کینٹ بند کرنے والا تھا کہ اسے شیوگ کیم کے پیچھے رکھا ربر کا پلچ نما کھلوتا نظر آیا۔ وہ پلچ پرانی تھی اور اس کے رنگ اڑ گئے تھے۔ وہ اسے بھول ہی گیا تھا۔ پچھلی بار بھی اس نے اسے استعمال کیا تھا۔ اس نے پلچ کو اٹھا کر پانی سے بھرے ٹب میں اچھال دیا۔ وہ خود ہی خود بھس دیا۔

پاؤڈر کا ڈبہ لے کر وہ بیڈ روم میں واپس آیا۔ اس نے بڑی آکھش اور نرمی سے بچی کے کپڑے اتارے۔ بچی تین سال کی تھی۔ کیسی پیاری عمر ہوتی ہے یہ۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھایا اور خود سے لپٹا لیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

اس کے اندر برہمی کی تندر لہر ابھری۔ بچی پر اس کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ فون کو بجتے ہی دے۔ اسے کوئی فون نہیں کرتا تھا۔ کوئی ایسا تھا ہی نہیں تو اس وقت یہ معیت کیوں نازل ہوئی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سکو گئی تھیں۔ اگر کسی نے فون اس لیے لیا ہے کہ بچوں کی تلاش میں اس کی رضا کارانہ مدد کی ضرورت ہے تو فون ریسیو نہ کرنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اس پر شک بھی کیا جا سکتا ہے۔

یہ سوچ کر اس نے بچی کو بیڈ پر بٹھا اور بیڈ روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے ڈارنگ روم میں آیا۔ فون وہاں تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو!“

”جسٹ جی“ میں گھٹماں بول رہا ہوں۔ رین بواٹھٹ انجینی ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”چھا۔ کیا بات ہے؟“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ پیشگی اطلاع کے بغیر میں آپ کو زحمت دے رہا ہوں مگر

شہر تھا اور سادھنا کو پچانے میں تو اسے کوئی دشواری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی ماں سے بے حد مشابہ تھی۔ اسے دیکھتے ہی اسے انوراہا کا خیال آیا تھا۔

وہاں ایک پولیس آفیسر بھی موجود تھا۔ ایٹور لال کو اس کی نظروں میں اپنے لیے متاثر محسوس ہوا لیکن اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ یہ سیدھا سادھنا کی طرف بڑھا۔ ”مجھے پہلے ہی آ جانا چاہیے۔“ تھا۔ ”اس نے کہا۔

سادھنا کی نگاہوں میں غالی پن تھا۔ ”مجھے پچھلی بار امید تھی کہ آپ آئیں گے۔“ وہ بولی۔ ”جب می کا دہانت ہوا تھا مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے لیکن آپ نہیں آئے۔“ اس کے لیے میں شکایت در آئی۔

ایٹور لال اسے ڈاکٹر کی ماہرانہ نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ شاک میں ہے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں اور لہجہ دیکھا کی تھا۔ یہ بات بھی اس کے اندازے کی تائید کر رہی تھی۔ ”میرا خیال تھا تم مجھ سے تھا ہو گی۔ مجھے تمہاری مدد کرنی چاہیے تھی۔“

”اب کر دیں، مجھے مدد کی ضرورت ہے۔“

ایٹور لال نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”میں اسی لیے آیا ہوں بیٹی۔ مجھ سے جو ہو سکے گا، کروں گا۔“

اچانک سادھنا کا جسم لرزنے لگا۔ وہ جھولنے لگی۔ اجیت سارا دے کر اسے صوفے پر لے گیا اور اسے وہاں بٹھا دیا۔ ایٹور لال اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اجیت نے سادھنا کو کسبل اوڑھا دیا۔ ”تمہارا جسم بالکل ٹھنڈا ہو رہا ہے جان!“ اس نے اس کا چہرہ ایک لمحے کیلئے اپنے ہاتھوں کے پالے میں بھرا۔ سادھنا کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے دیکھتے ہی دیکھتے رخسار ہلک کر رہ گئے۔

ایٹور لال کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہاں ایک اور عورت بھی موجود ہے۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ سادھنا کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر وہ اجیت سے مخاطب ہوئی۔ ”تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں کہ میں قانونی طور پر تمہاری بیوی کی نمائندگی کروں۔ میں باقاعدہ وکیل ہوں۔“ اس نے خشک لمبے میں کہا۔ ”وکیل!“ سادھنا بڑبڑائی۔ اسے اپنے پچھلی بار کے وکیل کا چہرہ یاد آ گیا۔ وہ اس

سے مسلسل کہتا رہا تھا۔ ”مجھے سب کچھ بتا دیں مزا فیش۔ مجھ سے سچ بولیں۔ مجھ پر مجبورہ کر سکیں۔“ یعنی اس کے وکیل تک کو اس کی بے گناہی پر یقین نہیں تھا لیکن کرن کی بات اور تھی۔ وہ عورت تھی۔ وہ اس کا درد سمجھ سکتی تھی۔ ”پلیز اجیت، کرن دیکھ کر اسے اجازت دے دو۔“ سادھنا نے اجیت سے کہا۔

اجیت نے انہی میں سر ہلایا۔ ”ہم تمہارے شکر گزار ہوں گے کرن!“

اب کرن ایٹور لال کی طرف مڑی۔ ”ڈاکٹر، آپ مجھے پیشہ ورانہ رائے دیں کہ سادھنا کی حالت ایسی ہے کہ اسے پوچھ کچھ کیلئے پولیس اسٹیشن لے جایا جاسکتا ہے؟“ ”ہرگز نہیں۔“ ایٹور لال نے دو ٹوک لمبے میں کہا۔ ”میں اصرار کروں گا کہ پوچھ کچھ ضروری ہے تو تمہیں کی جائے۔“

”لیکن مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔“ سادھنا کے لیے میں جھکن تھی۔ اس نے ایٹور لال کی طرف دیکھا۔ ”آپ کچھ ایسا کر سکتے ہیں کہ مجھے یاد آ جائے۔ ایسی کوئی صورت ہے؟“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”کوئی ایسی یاد آؤ کوئی ایسی صورت کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے یا جو کچھ جانتی ہوں، وہ مجھے یاد آ جائے بلکہ آپ یہ بھی چیک کریں کہ میرے وجود کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو خود میرے بچوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہونا چاہیے۔“

”سادھنا، یہ سب۔“ اجیت نے احتجاج کیا لیکن سادھنا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس کے چہرے پر اذیت کا تاثر تھا۔ ”کیا یہ ممکن ہے ڈاکٹر؟“ کرن نے ایٹور لال سے پوچھا۔

”مثلاً۔ امکان تو ہے۔“ ایٹور لال نے پر خیال لمبے میں جواب دیا۔ ”یہ ہسٹریا کی طرح کی کیفیت ہے۔ سوڈیم امائنیل کا ایک انجکشن دیا جائے تو شاید یہ ریٹیکس ہو سکے اور ہمیں کچھ بتا سکے۔ وہ جو اسے معلوم ہے۔“

چیف دیال اب تک سب کچھ خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ یہ سن کر ہلکا ہلکا۔ ”دوا کے زیر اثر دیے جانے والے جوابات عدالت میں قابل قبول نہیں ہوں گے۔“

چاہیے۔ اس کا۔ اور جلد سے جلد۔“ اس نے رلیور کیٹل پر رخ دیا۔

ادھر کرن بھی ٹینشن میں تھی۔ ”ڈاکٹر!“ اس نے ایٹور لال سے کہا۔ ”ہم سادھنا کی اس کیفیت کو توڑنے میں وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو بتا دوں کہ میرے پاس سادھنا کے پچھلے کیس کی مکمل فائل موجود ہے۔ اصل میں میں اس موضوع پر ایک کتاب پر پہلے سے کام کر رہی تھی۔ گزشتہ تین مہینے میں اس فائل میں سرکھاتی رہی ہوں اور میں نے آج کے ”کوستان“ میں چھپنے والا وہ آرٹیکل بھی بہت غور سے پڑھا۔ مجھے ایک خیال آیا تھا۔ میں نے چیف دیال سے کہا کہ وہ علی گڑھ فون کر کے میرے خیال کی تصدیق کرے۔ ابھی وہاں سے رابطہ ہوا ہے۔“

ایٹور لال نے جب سے پاپ نکالا اور اس میں تکیا کو بھرنے لگا۔

”ڈاکٹر! شاید آپ کو معلوم ہو کہ فویداری کیسوں میں پولیس کبھی کوئی بات چیا لیتی ہے تاکہ اس کے ذریعے وہ آگے نلے والے شیوٹوں اور شہادتوں کی صداقت کو پرکھ سکے۔ میں نے سات سال پہلے کے اخبارات کے تراشے چیک کئے۔ ان میں لکھا تھا کہ بچے جس وقت غائب ہوئے، سفید ڈیرائن والا سرخ سوئٹر پہنے ہوئے تھے۔ کہیں پوری تفصیل موجود نہیں ہے۔ کسی بھی اخبار میں نہیں ہے۔ علی گڑھ پولیس نے تصدیق کر دی ہے کہ بچوں کے لباس کی تفصیل انہوں نے دانستہ چھپائی تھی۔“

ایٹور لال کی نظروں میں ابھرن تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بات کی کیا اہمیت ہے۔

”اب سنیں‘ آج کے ”کوستان“ میں جو آرٹیکل شائع ہوا ہے اس میں واضح نہ پر لکھا ہے کہ سمجاش اور تلجا جب غائب ہوئے تھے تو ایسے سرخ سوئٹر پہنے ہوئے تھے جن پر سفید رنگ کی بادبانی کھتیاں بنی ہوئی تھیں۔“ کرن کے لیے میں سنسنی در آئی۔ ”پولیس کے علاوہ ایک ہی شخص ایسا ہو سکتا ہے جو یہ بات جانتا ہو۔ اگر ہم سادھنا کو بے گناہ فرض کر لیں تو وہ وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے بچوں کو اغوا کیا ہو گا اور اس نے یہ آرٹیکل ”کوستان“ میں چھپوایا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے۔“

”ڈاکٹر!“ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ سادھنا کا بمود توڑ سکتے ہیں تو تب کہ

میں آپ کو یہ سب کچھ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“

اسی وقت فون کی گھنٹی کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔ وہ خاموشی سے اس پولیس مین کو دیکھتے رہے جس کی ڈیوٹی ہی فون رلیور کرتا تھی۔ اس نے فون رلیور کیا اور پکارا۔ ”چیف۔۔۔ آپ کی ٹرنک کال ہے۔“

”یہ وہ کال ہے جس کا میں منتظر تھا۔“ چیف دیال نے کہا۔ ”اجیت۔۔۔ اور کرن۔ آپ بھی آئیں میرے ساتھ۔“

ایٹور لال، سادھنا کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر رہے سے سکون کی جگہ پریشانی نے لے لی تھی۔ ”جب بھی فون کی گھنٹی بجتی ہے میں سمجھتی ہوں کہ بچے مل گئے ہیں اور کوئی اطلاع دے رہا ہے۔“

”خود کو سنبھالو بیٹی!“ ایٹور لال نے شفقت سے کہا۔ ”یہ بتاؤ یہ یاد کرنا تمہارے لیے کب سے مسئلہ بنا ہے؟“

”سمجاش اور تلجا کی موت کے وقت سے۔ نہیں۔ شاید اس سے بھی پہلے۔“

”مجھے ایشیش سے شادی کے بعد کا عرصہ یاد نہیں آتا ہے۔“

”شاید اس لیے کہ ان برسوں کا تعلق تمہارے بچوں سے ہے اور تم انہیں تاک یادوں سے چٹا جانتی ہو۔“

”لیکن شادی کے بعد میں بہت تھکی تھی اور جب بچے کھو گئے تو میری یادداشت جواب دے گئی۔ جیسے اب ہوا ہے۔“ اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

اسی وقت اجیت والہن آگیا۔ ”ڈاکٹر۔ آپ چتر منٹ کرن سے بات کر سکتے ہیں؟“ اس نے جو بھل آواز میں پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“ ڈاکٹر اٹھا اور ڈانگ روم میں چلا گیا۔

چیف دیال اب بھی فون پر بات کر رہا تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن چچ چچ کر احکامات دے رہا تھا۔ ”پوسٹ آفس پانچو۔ 30 اکتوبر کو دہاں جو لوگ بھی ڈیوٹی پر تھے ان سے پوچھ گچھ کرتے رہو، یہاں تک کہ کسی کو کے اہل رام داس کے بارے میں کچھ یاد آ جائے۔ یہ یاد آئے کہ وہ لیٹرکس نے رلیور کیا تھا اور سنو“ مجھے مکمل حلیہ

یہ کام بہت تیزی سے کرنا ہو گا۔ میں نے اجبت کو قائل کر لیا ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہو گا مگر میں سادھنا سے جلد از جلد معلومات حاصل کرنی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بچوں کے لیے دیر ہو جائے اور انہیں ضرر پہنچ جائے۔

”مجھے کچھ دواؤں کی ضرورت ہو گی۔“ ایٹور لال نے کہا۔

”آپ لکھ دیں۔ میں گاڑی بھیج کر دوائیں منگوا دوں گا۔“ چیف دیال نے پیکش کی۔ ”رکیں۔ میں میڈیکل اسٹور کا نمبر ملاتا ہوں۔ آپ اسے دواؤں کے متعلق لکھوا دیں۔ کانشیل جا کر لے آئے گا۔“

ایٹور لال نے فون پر میڈیکل اسٹور والے سے بات کی۔ وہ ریسپور رکھ کر مڑا تو چیف کرن سے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو جو سوالات کئے جائیں گے اور وہ جو جواب دے گی، میں ریکارڈ کروں گا۔ اگر اس نے اعتراف جرم کیا تو ہم اسے عدالت میں براہ راست تو اس کے خلاف استعمال نہیں کر سکیں گے لیکن کم از کم میں گواہوں کے کنبے میں اسے کھڑا کر کے وہی سوالات تو کر سکیں گا۔“ ”تمہاری یہ امید پوری نہیں ہو گی۔ وہ اعتراف نہیں کرے گی۔“ کرن نے خشک لبے میں کہا۔ ”لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ جتنا بتاتی ہے، جتنی اس سے زیادہ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے لاشعور میں بہت کچھ ہے جو وہ خود بھی نہیں جانتی۔ پچھلے مقدمے کے دوران میں اس کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ ساٹھا تھا۔ بالکل بے تاثر۔“

چیف دیال کا ضبط جواب دینے لگا۔ ”تم ایک سانس میں دو باتیں کر رہی ہو۔ ایک طرف تم کہتی ہو کہ سادھنا کی حالت ایسی نہیں کہ میں اس سے پوچھ کچھ کر سکوں اور پھر تم کہتی ہو کہ وہ جتنا بتاتی ہے اس سے زیادہ جانتی ہے۔ سنا شرمیستی جی، قابلِ اعتراض اور متنازعہ عدالتی فیصلوں پر کتاب لکھنا تمہارا مشغلہ ہو گا مگر ان دونوں بچوں کی زندگی میرے لیے بہت اہم ہے۔ یہ میرے لیے مشغلہ نہیں۔“

”میری بات سنا دیال شکر۔“ ایٹور لال نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”اور کرن جی تم بھی۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ ماضی میں سادھنا کے بچوں کی اموات کے پس منظر کو کرینٹا آج کے کیس کے لیے مدد آور ثابت ہو گا؟“

”مجھے اس پر یقین ہے ڈاکٹر۔“ کرن نے بے حد وثوق سے کہا۔ ”سادھنا

کھیلنے پر نہ صرف آج صبح کے واقعات کے متعلق بتائے گی جو میرے خیال میں بالکل اہم نہیں ہوں گے۔ بلکہ ماضی کے واقعات سے بھی پردے اٹھیں گے۔ آج کے متعلق وہ شاید ہی کوئی کام کی بات بتا سکے لیکن ماضی کے متعلق ایسی باتیں سامنے آئیں گی جن سے خود اس کا شعور بے خبر ہے۔“

”یہ یقین ممکن ہے۔“ ایٹور لال نے پر خیال لبے میں کہا۔
”میری التجا ہے کہ آپ اس سلسلے میں کوشش کریں۔“ کرن بولی۔



لال نے مضبوطی سے اجیت کو نہ روکا ہوتا تو وہ سادھنا کو پلٹا لیتا۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔

پھر اچانک سادھنا چلائی۔ ”میں انہیں کیسے قتل کر سکتی تھی۔ وہ میرے بچے تھے۔ میرے بچے۔“



عام حالات میں گھنٹام کسی اہم گاہک کو اصل مکان دکھانے سے پہلے علاقے کے اہم مقامات دکھا کر متاثر کیا کرتا تھا لیکن اس وقت اس کا عجیب حال تھا۔ برف باری بھی ہو رہی تھی اور اس کا دھیان بچوں کی۔ سادھنا۔ اور اجیت کی طرف تھا۔ چنانچہ وہ بنواری لال کو سیدھا شانی ہاؤس لے گیا۔

وہ سڑک پر پہنچ اور خاصی خطرناک تھی۔ جیسی کہ پہاڑی علاقوں میں ہوتی ہے۔ برف باری کے دوران میں خطرات اور بوجھ جاتے ہیں۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے کن انجینوں سے بنواری لال کو دکھا۔ اس کا رنگ کالا تھا اور عمر 45 اور 50 کے درمیان تھی مگر وہ بے حد مذہب اور خوش اطوار لگتا تھا۔ لمبے ہی سے وہ لمبائی لگتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی بیوی اس علاقے میں بسنا چاہتی ہے۔

گھنٹام ذہن میں امکانات کی مدد سے تصویر بنا رہا تھا۔ ”یہ شانی ہاؤس بہت اچھی لوکیشن پر ہے۔ یہاں ہوٹل اور ریسٹورنٹ کی بہت گنجائش ہے۔ مکان پرانا ہے لیکن چند برس پہلے اس کے بڑے حصے کی مرمت کرائی گئی تھی۔“ اس نے بنواری لال کو بتایا۔ ”مکان سے ملحق قطعہ اراضی بھی ہے۔ یہ نو ایکڑ کے قریب زمین ہے۔ اس میں ایک ہزار فٹ لمبا جمیل کا کنارہ بھی شامل ہے۔ وہاں سے علاقے کا خوبصورت ترین منظر دکھائی دیتا ہے۔“

”مگر یہ بہت پرانا ہے۔“ بنواری لال کے لمبے میں اعتراض نہیں تھا۔ ”جی ہاں۔ وہی معاملہ ہے۔ نیا تو دن پرانا سودن اور اصل میں اہمیت تو ایک اراضی کی ہے اور اس پر شاندار لوکیشن۔“

”معاملہ پٹ گیا تو میں ہوٹل بھی خریدوں گا۔“

گھنٹام ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو ڈانگ روم میں اس پولیس والے کے سوا کوئی نہیں تھا جس کی ڈیوٹی ٹیلی فون پر تھی۔ ”وہ سب وہاں ہیں۔“ پولیس والے نے ڈانگ روم کی طرف اشارہ کیا۔

گھنٹام ڈانگ روم کی طرف گیا۔ اس نے وہاں کے مہر کا جائزہ لیا۔ سادھنا کاؤچ پر دراز تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ایک انجینی فکس اس کے پاس بیٹھا نرم لمبے میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ایک ہلوکار معر آوی تھا۔ اجیت بھی وہیں بیٹھا تھا اور بے حد متوش دکھائی دے رہا تھا۔ ایک کرسی پر کرن بھی بیٹھی تھی۔

گھنٹام کی سمجھ میں آگیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ جھکے جھکے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی غصہری ہوئی انگلیوں کو حرارت دینے کیلئے کوٹ کی جیب میں بٹھایا۔ اس کی انگلیاں اوٹی دستانے سے مس ہوئیں۔

”سادھنا، تم کیا محسوس کر رہی ہو؟“ ایٹور لال نے پوچھا۔

”میں۔ میں خوف زدہ ہوں۔“ سادھنا کا لمبہ خواب ناک تھا۔ ”کیوں؟“

”بچے۔ میرے بچے۔“

”سنو سادھنا ہمیں صبح کے واقعات کے متعلق بتاؤ۔ رات تمہیں کیسی نیند آئی تھی؟ تم انہیں تو پرسکون تھیں؟“

سادھنا کی سوچ میں ڈوبی آواز ابھری۔ ”میں نے خواب دیکھا۔“

”خواب میں تم نے کیا دیکھا؟“

”سہاس اور تہا کو دیکھا۔ وہ بڑے ہو گئے تھے۔“ وہ سسکتے لگی۔ اگر ایٹور

علاوہ اسے کرن کی فکر بھی تھی۔ وہ اس سے خفا تھی جبکہ وہ اس سے دیرپا تعلق قائم کرنا چاہتا تھا۔

”ہاں بھئی گمشام۔“

وہ چونکا۔ ”سوری ہنواری لال بی۔ آج میرا دھیان ادھر ادھر ہو رہا ہے۔“ اس نے لمبے کو خوش گوار رکھنے کی کوشش کی پھر اس نے دروازہ کھولا اور اسے اندر لے گیا۔ ”یہ بچہ دیکھیں بہت کشادہ ہے اور کھنکھن بھی نہیں ہے میاں۔ بس ذرا اسے جدید طرز کا بنا دیا جائے۔“

مکان کے باہر ہوا غرائی محسوس ہو رہی تھی۔ اوپر منزل کی طرف سے اسے ایسا لگا جیسے کوئی پارک آواز میں چنچا ہو۔ ممکن ہے اس کا دم ہو۔ اس نے ہنواری لال کو غلجی منزل کے کمرے اور ان کی کھڑکیوں سے نظر آنے والے مناظر دکھائے۔

”بہت خوب صورت ہے۔“ ہنواری لال نے کہا۔ ”میری بیوی یقیناً خوش ہو گی۔“

”پانی چڑھا ہے تو ان چٹانوں کو دھانپ لیتا ہے۔“ گمشام نے کہا۔ ”اور وہ برف پوش پہاڑ دیکھیں کتنے قریب لگ رہے ہیں اور یہ جھیل کا کنارہ۔ وہاں تک یہ اس مکان کے ساتھ ہے۔“

وہ ہنواری لال کو ایک ایک کرا دکھاتا پھرا۔ ہر کمرے میں بڑا آئینہ دان موجود تھا۔ فرش بے حد شاندار حالت میں تھا۔

اب وہ دوسری منزل پر تھے۔ ”یہ کمرے آپ ہوٹل بنانے کی صورت میں کرائے پر دے سکتے ہیں۔“

ہنواری لال کے انداز میں دلچسپی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے دیواری الماریوں کو کھول کر چیک کیا۔ ہاتھ روم میں تل چمک کئے پانی آ رہا تھا۔ ”تیسری منزل پر کمرے زیادہ ہیں اور ہمارے کرائے دار جمونتی جی کا اپارٹمنٹ چوتھی منزل پر ہے۔“

ہنواری لال اپنی چینگنگ میں مصروف تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گمشام کھڑکی کی طرف بیٹھ گیا۔ وہ دل میں دل میں کڑھ رہا تھا۔ آخر یہ محض دیر کیوں لگا رہا

”بالکل۔ ہے رام۔“ گمشام نے تیزی سے اسٹیرنگ وچل کر کار کو سنبھالا جو برف پر پھسل گئی تھی۔ گاڑی سنبھلنے کے بعد اس نے پرتشویں نظروں سے ہنواری لال کو دیکھا کہ کہیں وہ گھبرا تو نہیں گیا ہے مگر وہ پرسکون تھا۔

”تم بہت اچھی ڈرائیو کرتے ہو۔“ ہنواری لال نے کہا۔ ”ان راستوں پر برف ہو تو گاڑی چلانا ہی مشکل نہیں ہے۔“

”شکریہ مجھے افسوس ہے کہ اجیت ہمارے ساتھ نہیں ہیں مگر صورتحال ہی ایسی تھی کہ۔“

”میں سمجھتا ہوں۔ بچوں کا کھونا والدین کیلئے بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔“ ہنواری لال نے کہا۔ ”مجھے تو افسوس ہے کہ آج تمہیں تکلیف دی۔ تم اجیت کے ساتھ کام کرتے ہو تو اس کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے ہو گے۔ تمہیں بھی فکر ہو گی ان کی طرف سے۔“

گمشام نے اس کے ہمدردانہ لمبے کو نظر انداز کر دیا۔ ”لیجئے۔ ہم پہنچ گئے۔“ گاڑی نے جیسے ہی موڑ کاٹا (شاپنی باؤس) پوری طرح نظر آنے لگا۔ گمشام کو حیرت ہوئی کہ جمونتی نے گیارہ کے دروازے کھلے پھوڑ دیے تھے۔ بہر حال اس کیلئے تو اچھا ہی تھا۔ وہ گاڑی کو اندر گیارہ میں لے گیا۔ اس نے اپنی گاڑی جمونتی کی پرانی اسٹیشن وگن کے برابر کھڑی کر دی۔

دونوں گاڑی سے اترے۔ گمشام نے کہا۔ ”میرے پاس عہدی دروازے کی چابی موجود ہے۔ آئیے۔ چلیں۔“

گمشام نے چابی لٹائی اور جھنبلا گیا۔ دروازہ ڈبل لاک کیا گیا تھا۔ وہ دوسری چابی ٹوٹا رہا ساتھ ہی اس نے اٹھایا کھنکی کاٹھن دایا تاکہ جمونتی کو پتا چل جائے کہ وہ لوگ آ گئے ہیں۔ ہنواری لال بہت پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے کونٹ سے برف جھٹکی۔ جبکہ گمشام نزدں تھا۔ وہ ہنواری کو جلد از جلد مکان دکھا کر جان چھڑانا چاہتا تھا۔ یہ دیکھیں۔ اور یہ دیکھیں۔ اور اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے اجیت کے پاس پہنچنا ہے۔

گمشام کے دل و دماغ پر بہت بوجھ تھا۔ اجیت، سادھنا اور ان کے بچوں کے

ہے۔ یہ مجھے فارغ کسے تو میں اجیت کے گھر جاؤں۔ شاید کرن بھی وہاں موجود ہوگی پھر اسے بچوں کا خیال آگیا۔ اگر وہ اس موسم میں کسی کھلی جگہ پر ہوں گے تو۔۔ ان کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔

سادھنا کرزشتہ روز ارملہ کو ایجنسی لائی تھی۔ اس کے پاس چھوڑنے کیلئے۔۔ تو اس نے کہا تھا۔ ”بابر لے کر جاؤ تو اس کے دستاؤں کا خیال رکھنا کہ یہ پنے رہے۔ اس کے ہاتھ بہت جلدی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔“ دیکھ لو۔ یہ ایک جیسے نہیں ہیں۔ یہ میری بیٹی دستاں بڑی کثرت سے کھوتی ہے۔ ایک چپے دو دستاں کم ہی ملتے ہیں مجھے اس کیلئے۔“

گھٹھام نے دستاؤں کو دیکھا تھا۔ ایک سرخ تاجس پر ایک مسکراتا چہرہ بنا تھا۔ دوسرا نیلا تاجس پر سبز رنگ میں چمک کا ڈیزائن تھا۔

گھٹھام کو یاد آیا کہ دستاں پستانے کیلئے ارملہ نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف اٹھائے تو کیسے پیارے اور معصوم انداز میں مسکرائی تھی پھر وہ اسے گاڑی میں بٹھا کر لے گیا تھا۔ انہوں نے نوین کو اسکول سے لیا تھا اور راستے میں آکس کرم کھانے کیلئے رکے تھے۔ اس وقت اری نے بے حد معصومیت سے پوچھا تھا۔ ”کون کھانے کیلئے میں دستاں تیار دوں تو کوئی حرج تو نہیں۔“ کسی بیاری بیٹی ہے وہ۔

بخاری لال اپنی چھوٹی ڈائری میں کچھ نوٹ کر رہا تھا پھر اس نے ڈائری بند کر کے جیب میں رکھی۔ ”آئیے۔ اب اوپر چلیں۔“ گھٹھام نے اس سے کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو اوپر سے منظر زیادہ پسند آئے گا۔“

وہ زہد چہرہ کر اوپر پہنچے۔ ”یہ لیجئے، ہم پہنچ گئے؟“

مگر گھٹھام کو دروازہ بند دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ ”عجیب بات ہے ان کی گاڑی گیاران میں موجود ہے۔ بغیر گاڑی کے کہاں جا سکتے ہیں“ خیر۔۔ میرے پاس بھی چابی ہے۔“

اسی لمحے بالکل اچانک دروازہ اندر سے کھول دیا گیا۔ جسوت کا چہرہ نظر آیا جو پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ”اتنے خراب موسم میں تمہیں تکلیف کتنی پڑی۔“ جسوت نے بے حد خوش اخلاقی سے کہا۔ پھر اس نے ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کا

راستہ دیا۔

جسوت نے باری باری دونوں نازل ہونے والوں کے چہروں کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ کہیں انہوں نے بچی کے چپٹے کی آواز تو نہیں سن لی۔ اس سے بھی کیسی مہمت سرزد ہوئی تھی۔ خواہ خواہ کا بے صبر پن، گھٹھام کا فون ریسرو کرنے کے بعد اسے سب کچھ بہت جلدی جلدی کرنا پڑا تھا۔ بچوں کے کپڑے بھی سمیٹنے تھے پھر افراتفری میں بے بی پاؤڈر کا ڈبا اس کے ہاتھ سے پھوٹ گیا تھا۔ پاؤڈر کھڑ گیا تھا۔ اسے بھی صاف کرنا پڑا۔

اس نے بچوں کو پھر خواب آور دوا ملا ہوا دودھ پلایا تھا پھر ان کے ہاتھ پیر ہانڈے، منہ پر ٹیپ چسپایا اور انہیں بیڈ روم کی بڑی دیواری الماری میں چھپا دیا تھا۔ احتیاطاً اس نے الماری کا تالا بدل دیا تھا۔ کون جانے اس اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس اس کی بھی ڈپلی کیٹ چابی ہو۔

ان دونوں نے نیچے کا در بنگائی تھی۔ اس کی وجہ سے اسے اور مہلت مل سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کوئی چیز سامنے نہیں رہ سکتی ہے۔ اس نے بے حد احتیاط سے کام لیا تھا۔ تب میں اب بھی پانی بھرا ہوا تھا۔ اس نے اسے یو پی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ لوگ سوچیں گے کہ وہ نمائے کا ارادہ کر رہا تھا یہی اور اچھا تھا۔

بخاری لال نے اسے چونکا دیا۔ ”میں بخاری لال ہوں۔“ اس نے ہاتھ بندھایا۔

جسوت نے ہاتھ ملائے سے پہلے اپنی ہتھیلیوں کو پینٹ پر رگڑ کر خشک کرنے کو شش کی۔ اسے پینٹ بہت آ رہا تھا۔ اب وہ بڑے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ”میں جسوت ہوں۔“ اس نے وہیمی آواز میں کہا۔

ہاتھ ملنے تو بخاری لال کے چہرے پر بد مزگی کا سایہ سا لہرایا۔ اسے دیکھ کر جسوت اور خوش اخلاق ہو گیا۔ ”آپ سے مل کر خوش ہوئی بخاری لال جی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ اس شاندار مکان کو بہت خراب موسم میں دیکھ رہے ہیں۔“

ماحول کی کشیدگی وقتی طور پر کم ہو گئی۔ جسوت کو احساس ہوا کہ کشیدگی کا سبب گھٹھام ہے اور وجہ صاف ظاہر تھی۔ پچھلے برسوں میں اس نے اسے بار بار سادھنا کے

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے نمائے کا کوئی وقت مقرر تو نہیں ہے۔“ جسونت نے ایسے لیے جس میں کہا جو اس کے لفظوں کی نفی کر رہا تھا۔

بنواری لال نے بھی شب کو دیکھا وہاں دربر کی ایک بلخ تیر رہی تھی۔ بچے کا کھلوا وہ پھر بد مزہ ہوا۔ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس نے سوچا اسی لمحے اس کا ہاتھ دیواری الماری سے مس ہوا۔ مکان واقعی بہت اچھا تھا۔ بہت خوب صورتی سے تعمیر کیا گیا تھا۔ مالک مکان کی ڈیمانڈ چالیس لاکھ تھی۔ نو ایکڑ زمین اور جھیل کے کنارے کی ملکیت کے ساتھ یہ ڈیمانڈ معقول تھی عمروہ سوچ رہا تھا کہ تیس لاکھ آفر کرے گا۔

35 لاکھ تک سودا ہٹ سکتا ہے۔

اپنے ذہن میں فیصلہ کرنے کے بعد وہ بالکل انداز میں جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے الماری کے ہینڈل کو تھامتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ الماری دیکھ سکتا ہوں؟ کافی گہری معلوموتی ہے۔“

9. ”سوری دراصل اس کا تالا میں نے آج ہی بدلا ہے۔ اور چابی کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں۔“ جسونت نے معذرت خواہانہ لیے جس میں کہا۔ ”لیکن آپ دوسری الماری دیکھ لیں۔ یہ سب بالکل ایک جیسی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے ہونٹ بختی سے بھیجے لیے۔ اس کا بس چہاں تو وہ چیخ کر اس شخص کو باہر نکلنے کو کہتا۔ الماری کے بند دروازے کے پیچھے بچے موجود تھے۔ اب اسے پریشانی ہو رہی تھی کہ پتا نہیں اس نے ٹیپ ٹھیک سے چکایا تھا یا نہیں اور بچے کیس گھنٹام کی آواز نہ بچان لیں۔ آخر وہ ان کی جانی بچانی آواز ہے اور ہاتھ پاؤں ماریں۔ آواز نکالنے کی کوشش کریں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بس ان لوگوں سے جلد از جلد پیچھا چھڑا لیا جائے۔

اوجھر گھنٹام بھی وہاں سے جلد از جلد نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ اسے ایک خوشبو کا ہاساس ہو رہا تھا جو اسے ارطاک کی یاد دل رہی تھی۔ وہ بنواری لال کی طرف مڑا جو دوسری الماری کھول کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ ”کیا خیال ہے آپ کا؟ چلیں؟“

بنواری لال نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے۔ آپ کا شکر ہے جسونت جی۔“

وہ جانے کیلئے مڑے اس بار بنواری لال نے ہاتھ ملانے سے گریز کیا تھا۔

نیچے گیارہ میں گھنٹام نے اسٹیشن دیکھ کر اپنی گاڑی کے درمیان سے گزر کر

گھر جاتے اور گھر سے نکلے دیکھا۔ وہ اس گھر کے فرد کی سی حیثیت رکھتا تھا اور وہ اکیلا آدمی تھا۔ یقیناً بچوں سے بہت پیار کرنا ہو گا۔ اس کے اپنے بچے نہیں تھے۔ ہوتے تو وہ بھی ان پر توجہ مرکوز رکھتا۔ ان کیلئے بچے وہ چہ پریشان ہوتا۔ سادھن کی ماں کی طرح۔

”اس اپارٹمنٹ کو دیکھیں۔“ گھنٹام بنواری لال سے کہہ رہا تھا۔ ”دو افراد کیلئے کتنا شاندار ہے۔“

”کیا آپ کو فلکیات میں دلچسپی ہے؟“ بنواری لال نے اچانک جسونت سے پوچھا۔

جسونت کو ذرا تاخیر سے احساس ہوا کہ اس نے کھڑکی سے دور بین نہیں ہٹائی بلکہ اس کا زاویہ بھی تبدیل نہیں کیا۔ اس کا رخ اجیت کے گھر کی طرف تھا اور اب بنواری لال اس دور بین میں دیکھنے کے ارادے سے کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے دور بین کا رخ اوپر کی طرف کر دیا۔ ”جی۔“ مجھے ستارے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔

بنواری لال نے دور بین میں دیکھا اور پلکیں جھپکا لیں۔ ”بہت پاور فل ہے۔“ اس نے کہا پھر بڑی احتیاط سے وہ دور بین کو جھکا کر اس کی پہلے والی پوزیشن پر لے آیا۔ پھر وہ سیدھا ہوا اور اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ”اپارٹمنٹ واقعی بہت اچھا ہے۔“ اس نے تبصرہ کیا۔

”میں یہاں بہت خوش رہتا ہوں۔“ جسونت نے کہا لیکن اندر ہی اندر وہ غصے سے کھول رہا تھا۔ اس نے دور بین کی پوزیشن تبدیل کر کے خود کو مفلک کر لیا تھا۔ ”آئیں۔ آپ کو بیڑی روم اور ہاتھ روم دکھا دوں۔“ گھنٹام نے پیشکش کی۔ ”ضرور!“ جسونت نے بستر کی چادر درست کی اور بے بی پاؤڈر کے ڈبے کو جلدی سے بلنگی دروازے میں ٹھونس دیا۔

”ہاتھ روم اتنا بڑا ہے کہ آج کل عام بیڑی روم اتنے بڑے بنائے جا رہے ہیں۔“ گھنٹام کہہ رہا تھا۔ اسی لمحے اس کی نظر پانی سے بھرے ہوئے شب پر پڑی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا ”سوری۔ ہم نے واقعی آپ کو ڈسٹر کیا۔“

اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ کار میں بیٹھے بیٹھے اسے گیراج کے فرش پر کوئی سرخ سی چیز نظر آئی۔ اس نے اسے اٹھایا اور اپنے رخسار سے لگا لیا۔ وہ ایک دم سے کار کی سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

”کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟“ بنواری لال نے تشریش سے پوچھا۔

”یہ ارملہ کا دستانہ ہے۔“ گھنٹاشم کی آواز بھرا گئی۔ ”یہ کل میری کار میں گر گیا ہو گا۔ اور ابھی کار سے اترتے وقت پیچے گر گیا ہو گا۔ اری دستانے کھوٹی رہتی تھی۔ آج صبح اس دستانے کے ساتھ کا دستانہ جھولے پر ملا تھا۔“ گھنٹاشم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ بھگوان تمہارا دکھ جانتا ہے۔“ بنواری لال نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اور وہ ہی اسے دور کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ پیچے مل جائیں گے۔ بھگوان بے انصاف نہیں۔ اب کو تو گاڑی میں ڈرائیو کروں؟“

”ہلیئر!“ گھنٹاشم نے اسے ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھے کا موقع دیا اور دستانہ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس نے سوچا کہ وہ یہ دستانہ اہیت یا سادھنا کو نہیں دکھائے گا۔ ان کے دل پر کیا کڑے گی۔ ہائے اری۔ اس نے کون کھاتے وقت دستانے اتارے تھے۔ اس کی نظروں میں وہ منظر بھر گیا۔

اوپر کی کڑی سے جھونٹ اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کار موڑے مگرز کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی پھر وہ واپس گیا۔ کاپٹنے ہاتھوں سے اس نے الماری کا تالا کھولا اور لڑکے کو نظر انداز کرتے ہوئے بچی کی طرف بڑھایا۔ اس نے بچی کو اٹھا کر بیڈ پر ڈالا مگر بچی کی بند آنکھیں اور نیلا پڑتا چہرہ دیکھ کر اس کی پیچ نکل گئی۔

○

سادھنا کی مٹھلیاں بار بار کھل اور بندھ رہی تھیں۔ ایٹور لال نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تم پریشان نہ ہو بیٹی۔ سب جانتے ہیں کہ تم بچوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ تم اسی لیے پریشان ہو نا؟“

”ہاں۔ میں انہیں کیسے مار سکتی ہوں۔ وہ تو میں ہوں۔ میں تو ان کے ساتھ مر گئی تھی۔“

”اپنے کسی محبوب کو کھوتے ہیں تو ہم سب تھوڑے سے مر جاتے ہیں۔ سادھنا بیٹی، تم پیچھے جا کر سوچو، اس وقت جب کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ہوا تھا۔ اپنا لڑکھن یاد کرو۔ اور بتاؤ۔“

”لو لکھن!“ سادھنا کے جسم کا تھوڑا سا لخت دور ہو گیا۔

”مجھے اپنے بلیا کے بارے میں بتاؤ، میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔“

چیف دیال نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ایٹور لال نے اسے تمدیدی نظر سے دیکھا۔ ”میں یہ بے سبب نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں تحمل سے کام لینا ہو گا۔“ اس نے قہقہے لہجے میں کہا۔

”ڈیڈی بہت اچھے تھے۔ ان کی فلائٹ آتی تو میں می کے ساتھ کار میں بیڈ کر ایئر پورٹ جاتی۔“ سادھنا کی آواز اور لہجے میں تازگی تھی۔ ”وہ جب بھی فلائٹ سے آتے، میرے اور می کیلئے کچھ نہ کچھ ضرور لاتے تھے۔“

اجیت کی نظرس سادھنا کے چہرے سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ اس نے سادھنا کی آواز میں ایسی شگفتگی اور لہجے میں ایسی کھٹک پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس کی آواز میں سرت کی چکار تھی۔

کرن بہت توجہ سے سن رہی تھی۔ اسے ایٹور لال کی ٹیکنیک بہت اچھی لگی تھی۔ وہ اہم باتیں پوچھنے سے پہلے اس کا اعتماد حاصل کر رہا تھا۔ اسے خود اعتمادی دے رہا تھا مگر کلاک کی ٹنگ تک اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ احساسِ ولایتی تھی کہ بہت جیتی اور اہم وقت گزر رہا ہے اور وہ بار بار گھنٹام کو دیکھتی۔ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا اس کیلئے بہت دشوار تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ گھنٹام کے ساتھ اس کا رویہ سخت اور لہانت آمیز تھا۔ اسے گھنٹام سے معذرت کرنی چاہیے۔

اسی وقت لائٹ چلی گئی۔ ”یہ تو ہونا ہی تھا۔“ چیف دیال نے بد مزگی سے کہا۔ اجیت نے دیا سلائی چلائی اور اس کی روشنی میں لیپ تلاش کر کے روش کر دیا پھر اس نے دوسرا لیپ روشن کیا۔ دونوں لیپ ساہنا کے دونوں طرف رکھ دیے گئے۔ اجیت کو اس بیمار روشنی میں وہ سب کچھ غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ بچے غائب ہیں۔ ساہنا دواؤں کے زیر اثر ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ ساہنا کیا کہہ رہی ہے۔

”ڈیڈی مجھے اور ممی کو اپنی بالکائی کہتے تھے۔ بالکائیں۔“ ساہنا کہتے کہتے رک گئی۔ آخری لفظ دہراتے ہوئے اس کی آواز لڑکھائی تھی۔

”کیا بات ہے ساہنا!“ ایٹور لال نے کہا۔ ”تمہارے ڈیڈی جنہیں بالکائی کہتے تھے تو تمہیں برا لگتا تھا؟“

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ اور بات تھی۔ ”ساہنا کے لمبے میں احتیاج تھا۔ آواز بلند تھی۔“

”ٹھیک ہے بیٹی۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔“ ایٹور لال نے اسے چکارا۔ ”اچھا۔“

یونیورسٹی کے بارے میں بتاؤ وہاں تمہارے بہت دوست ہوں گے؟“

”شروع میں تو تھے۔ مجھے لڑکیوں سے دوستی کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔“

”اور پڑھائی؟ جنہیں اپنی مضامین اچھے لگتے تھے؟“

”جی ہاں، سب آسان تھے۔ با یونیورسٹی کے سوا۔“ ساہنا کا لہجہ بدل گیا۔ ”اچھا“

میں مجھے سائنس سے دلچسپی نہیں تھی لیکن ممی نے مجبور کر دیا تھا۔“

”پھر تم پروفیسر اشیش سے ملیں؟“

”ہاں۔ انہوں نے با یونیورسٹی میں میری مدد کی اور وہ کہتے تھے کہ میں زیادہ کھانا

پکرا اور اپنے ساتھیوں سے ملنا نہ کروں ورنہ ہمارے جاؤں گی۔ انہیں میری بہت فکر تھی۔ وہ مجھے وٹامن کی گولیاں بھی دیتے تھے۔ طاقت کیلئے۔ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے کہ وہ میں بہت تھکی تھکی رہتی تھی۔ مجھے ڈیپریشن بھی ہونے لگا تھا۔ میں ممی کو بہت مس کرتی تھی۔“

”لیکن دیوالی پر تو تم کمر آتی تھیں نا؟“

”ہاں مگر نہ جانے کیا ہوا، بہت برا ہوا۔ میں نے اس کے بارے میں لکھا تو نہیں لیکن میرا خیال ہے، میں جانتی تھی۔ ممی ویک اینڈ پر آئیں کیونکہ وہ میری طرف سے فکر مند تھیں اور پھر ممی مر گئیں۔ صرف اس لیے کہ وہ مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ وہ میرا قصور تھا۔ میرا قصور۔“ اس کی آواز بکھر گئی اور وہ سسکنے لگی۔

گھنٹام نے اپنے آنسو چھپانے کیلئے منہ پھیر لیا۔ وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ اس نے سوچا۔ یہاں وہ کس کام کا ہے۔ کچھ کر ہی لے، کافی ہی بنا لے۔ وہ اٹھنے لگا۔

”تمہاری ممی کی موت کے بعد اشیش نے تمہاری بہت مدد کی؟“ ایٹور لال نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ وہ بہت اچھے تھے۔“

”اور تم نے اس سے شادی کر لی؟“

”ہاں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ میرا خیال رکھیں گے اور میں بہت تھکی ہوئی تھی۔“

”تمہیں اپنی ممی کو پیش آنے والے حادثے کا الزام خود پر نہیں لینا چاہیے ساہنا۔“

”حادثہ!“ ساہنا کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ ”حادثہ؟ وہ حادثہ تو نہیں تھا۔ وہ حادثہ تو نہیں تھا۔“

”وہ حادثہ ہی تھا۔“ ایٹور لال نے نرم لہجے میں کہا مگر اسے اپنے حلق میں ایک گولا سا بٹا محسوس ہو رہا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ میں نہیں جانتی۔“

”ہمیں پروفیسر اشیش کے بارے میں بتاؤ۔“

”مجھے تیزی دھننے پر مجبور نہ کرو۔ وہ آہستہ آہستہ کھل رہی ہے۔“ ایٹور لال نے قہقہے سے کہا۔ ”اس کا لاشعور تیزی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”اور مجھے یہ فکر ہے کہ شاید وہ بچے ابھی زندہ ہوں۔ اور میں یہاں وقت ضائع کر رہا ہوں۔ انہیں بچانے کی کوشش کرنے کے بجائے۔“ چیف کا لہجہ تند تھا۔ ”ٹھیک ہے“ میں اس سے آج صبح کے متعلق پوچھتا ہوں مگر پہلے مجھے اس کے پہلے بچوں کے بارے میں پوچھنے دو۔ اگر دونوں کے درمیان کوئی ربط ہے تو وہ اسے ظاہر کر دے گی۔“

چیف دیال نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ”چار بجنے والے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آدمے کھنے میں روشنی اتنی کم ہو جائے گی کہ دیکھنا محال ہو گا۔ ریڈیو کہاں ہے؟ میں موسم کی خبریں سننا چاہتا ہوں۔“

ٹیلی فون پر مامور پولیس والے نے جلدی سے کہا۔ ”ریڈیو کچن میں ہے چیف۔“

کچن میں گھنٹام نے کافی بنا لی تھی۔ چیف نے جا کر ریڈیو کھولا تو کچن آواز سے بھر گیا۔ ریڈیو پر خبریں آ رہی تھیں۔ ”اجیت پال کے بچوں کی کشمیری کے کيس نے نیا زن لے لیا ہے۔“ خبریں پڑھنے والا کہہ رہا تھا۔ ”دار بٹلنگ کی حدود میں ایک پٹرول پمپ پر کام کرنے والے انٹینڈنٹ نے قبضی گواہی دی ہے کہ صبح نو بجے اس نے پرکاش کی گاڑی میں پٹرول بھرا تھا۔ یاد رہے، یہ پرکاش متا وہ گواہ ہے جس کے بھگ جانے کی وجہ سے ساوہتا دیوی پر دوبارہ کيس نہیں چلایا جا سکا۔ وہ فون سے بھاگا ہوا ہے۔ انٹینڈنٹ کی گواہی کے مطابق پرکاش متا نروس نظر آ رہا تھا۔ اس نے خودی بتایا کہ وہ دار بٹلنگ ایک ایسے شخص سے ملنے کیلئے آیا ہے جو اسے دیکھ کر ہرگز خوش نہیں ہو گا۔ وہ سرخ رنگ کی مورس میں ستر کر رہا ہے۔“

”نعت۔ میں یہاں وقت برباد کر رہا ہوں۔“ چیف دیال غزایا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ چیف نے ریسپورڈ اٹھایا۔ ”ہاں۔ میں نے سن لی ہے۔“ اس نے مآخضہ چپس میں کہا۔ ”تمام روڈ اور مل بلاک کر دو اور سب کو سرخ مورس کے بارے میں مطلع کر دو۔ اسے ہرجال میں پکڑنا ہے۔“ ریسپورڈ کریٹل پر شیخ کو وہ ایٹور لال کی طرف

”وہ میرے لیے بت اچھے تھے۔“

”یہ تو تم کہتی رہتی ہو، یہ بتاؤ اس نے تمہارے لیے کیا کیا؟“

”میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”کیوں ساوہتا؟“

”بس۔ میں نہیں چاہتی۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کے بارے میں بتاؤ۔ سہاش اور تلھا کے بارے میں۔“

”وہ بہت پیارے تھے۔ بہت اچھے۔“

”تم بس اچھا ہی کہتی رہتی ہو۔ پروفیسر ایش تمہارے ساتھ بہت اچھا تھا۔ بچے بہت اچھے تھے۔ تو تم بہت خوش ہو گی؟“

”خوش؟ میں بہت تھکن محسوس کرتی تھی۔“

”کیوں؟“

”میں بیمار تھی۔ ایش چاہتے تھے کہ میں اچھی ہو جاؤں۔ وہ کہتے تھے۔ اچھی بنی ہو ساوہتا وہ میری مدد کرتے تھے۔“

”مدد؟ وہ کیسے؟“

”میں اس بارے میں بات کرنا نہیں چاہتی۔“

”لیکن یہ ضروری ہے ساوہتا۔ ایش کیا کرتا تھا؟“

”میں تھکی ہوئی ہوں۔ اس وقت بھی تھک گئی ہوں۔“

”ٹھیک ہے ایک منٹ آرام کر لو پھر ہم کچھ اور بات کریں گے۔“

ایٹور لال اٹھا۔ چیف دیال نے سر کے اشارے سے اسے دروازے کی طرف چلنے کو کہا۔ وہ دونوں ڈائننگ روم میں چلے گئے۔ ”مجھے تو بات بتانی نظر نہیں آ رہی ہے۔“ چیف دیال نے بلا تہدید کہا۔ ”اور اس میں کئی کھینے لگ سکتے ہیں اگر تمہارا خیال ہے ڈاکٹر کہ تم پہلے بچوں کے قتل سے متعلق کوئی اہم بات معلوم کر سکتے ہو تو ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ براہ راست سوال کرو یا پھر میں اسے قہانے لے جا کر پوچھ سکتا ہوں۔“

ڈاکٹر ایٹور لال اور چیف دیال بھی گھٹام کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلے آئے تھے۔ گھٹام نے کافی کی ایک پیالی لے جا کر اجیت کو دی۔ ”اجیت— پلیز یہ پی لؤ۔“ اس نے کہا۔

”شکریہ گھٹام۔“ اجیت نے پیالی لیتے ہوئے کہا پھر وہ سادھنا سے مخاطب ہوا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا میری جان۔ میری بے پی؟“ سادھنا پر لرزہ چڑھنے لگا۔ اس کی آنکھیں کھلیں۔ وہ دشت زدہ انداز میں چلائی۔ ”میں تمہاری بے پی نہیں ہوں مجھے کبھی اس طرح مت پکارنا۔“



جسونت گرمی سانس لے کر سائت و صامت وجوہ کی طرف سے پلٹا۔ اس نے بچی کے منہ سے نیپ پٹا دیا تھا۔ اور اس کے ہاتھ اور پاؤں بھی کھول دیے تھے۔ بچی کے بال بے حد پکٹنے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ اسے نملانے کے بعد اس کے بالوں میں برش کرے گا لیکن اب کچھ فائدہ نہیں تھا۔ وہ ہوش میں ہی نہیں تھی۔ بے جان جسم سے لاڑ کرنا اسے پسند نہیں تھا اس لیے کہ اس میں جسمانی ردعمل نہیں ملتا۔

لڑکا اب بھی الماری میں ہی پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھایا اور لاکر بند پر لٹا دیا پھر اس نے اس کے ہاتھوں اور پیروں کی بندشیں کھولیں اور آخر میں اس کے منہ سے چپکا ہوا ٹیپ ہٹایا۔ لڑکا تکلیف سے چلایا پھر اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ ”تم نے میری بس کے ساتھ کیا کیا ہے؟“ وہ چلائی۔

اس کے لیے کی تندی سے جسونت کو اندازہ ہو گیا کہ بچے نے اپنا پورا دودھ نہیں پیا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ وہ سو رہی ہے۔“

”ہمیں گھر جانے دو۔ ہم گھر جانا چاہتے ہیں۔ تم مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔“

گھٹام اٹکل میاں آئے تھے مگر تم نے ہمیں چھپا دیا۔“

جسونت کا ہاتھ اٹھا۔ تجھ پر نوین کے رخسار پر پڑا۔ نوین بہت تیزی سے لڑھکتا

مڑا۔ ”اب میں چاہتا ہوں کہ آپ سادھنا سے ایک سوال پوچھیں۔ پرکاش متا“ میں تو نہیں آیا تھا اور آیا تھا تو اس نے سادھنا سے کیا کہا؟“

ایٹور لال اسے گھورنے لگا۔ ”تم کس نتیجے پر پہنچ رہے ہو؟“

”یہ پرکاش متا وہ شخص ہے جو سادھنا پر دوبارہ مقدمہ چلوا سکتا ہے اور اگر اسے پتا چل جاتا ہے کہ سادھنا یہاں رہ رہی ہے تو کیا وہ اسے بلیک میل کر کے اس سے رقم انجینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ اسے پھینک کرے گا کہ اس بار وہ اپنی گواہی کو اس کے حق میں بدل دے گا اور اس کے بعد سادھنا ہمیشہ کیلئے آزاد ہو جائے گی۔ فرض کر لو“ آج وہ سادھنا سے ملا تو کیا اسے کچھ کر سادھنا پر دیوالگی طاری نہیں ہو سکتی۔“

”اور کیا اس دیوالگی میں وہ اپنے ان بچوں کو بھی قتل نہیں کر سکتی۔ یہی کتنا چاہتے ہو نام؟“ ایٹور لال نے سرو لہجے میں کہا۔ ”تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس وقت بچے غائب ہوئے یہ شخص میاں اس علاقے میں موجود تھا اور پچھلی بار بچے غائب ہوئے“ تب بھی یہ وہاں موجود تھا۔ بچوں کی گمشدگی میں اس کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔“ ایٹور لال نے اچانک لہجہ نرم کر لیا۔ ”مجھے موقع دو چیف میں سادھنا سے اس دن کے بارے میں پوچھوں گا جب اس کے پہلے بچے غائب ہوئے تھے۔“

”میں آپ کو صرف تیس منٹ دوں گا۔“

گھٹام نے جلدی جلدی پالیوں میں کافی انڈیلی، پالیاں ٹرے میں رکھیں اور ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ اجیت کالڈج کے برابر بیٹھا تھا۔ وہ سادھنا کے ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ کرن مینٹل کے پاس کھڑی آتش دان کو تک رہی تھی۔

گھٹام نے آتش دان کے پاس پڑی میز پر ٹرے رکھ دی۔ ”تم کافی پیو گی؟“

اس نے کرن سے پوچھا۔

کرن نے اسے سوچ میں ڈوبی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔“ شکریہ۔“

گھٹام نے کافی کی پیالی اس کی طرف بڑھادی۔ ”تم کوٹ اتار دو نا۔“

”تھوڑی دیر میں اتار دوں گی۔ ابھی تک تو سردی ہی لگ رہی ہے۔“ کرن نے

کہا۔

ہوا بیڑے سے اترا اور دروازے کی طرف لپکا۔ وہ دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں دوڑ گیا۔

جسوت بھی اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ لاک نہیں کیا تھا۔ نوین نے اسے کھولا اور تیزی سے بیڑیوں کی طرف گیا۔ وہاں اسے نیم تاریکی کا تحفظ حاصل تھا۔ جسوت ہانگوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑا۔ اس کا توازن بگڑا اور وہ لڑکتے لگا۔ چھ بیڑیوں تک لڑکتے کے بعد ہی وہ سنبھلا۔ اس نے ریٹک کو تھاں اٹھا اور تین چار بار سر کو بھٹکا۔ لڑکا شاید تیسری منزل کے کسی بیڑے روم میں چھپا ہوا تھا لیکن سب سے پہلے اسے یہ چیک کرنا تھا کہ کچن کا دروازہ تو کھلا ہوا نہیں ہے۔ دروازے کا دوسرا لاک اتنا اوپر تھا کہ بچے کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ”نوین“ میں ابھی آتا ہوں تم مجھ سے بچ نہیں سکتے اور تم بہت گندے بچے ہو“ میں تمہیں پکڑوں گا تو سزا ضرور دوں گا“ سنا تم نے۔“

وہ دبے قدموں باقی بیڑیاں اترا اور کچن کی طرف بھجنا۔ دروازہ ڈبل لاک تو ہ نہیں تھا مگر اوپر کی چٹنی چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے لڑتی انگلیوں سے چٹنی کو چیک کیا۔ اب وہ مطمئن تھا کہ لڑکا یہاں سے نہیں نکل سکتا۔

اس نے لائٹ آن کی لیکن ایک لمبے بعد ہی لائٹ چلی گئی۔ یہ موسم کا کمال تھا۔ ایسے میں لائٹ تو جانی ہی تھی۔ اب لڑکے کو تلاش کرنے میں دشواری ہو گی۔ وہ غصے سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا پھر اس نے دیا سلائی جلائی اور مٹی کے تیل کا لیپ روشن کر دیا مگر روشنی کافی تھی۔ ”سنو نوین بیٹے!“ اس نے لڑکے کو پکارا۔ ”اب میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تم باہر آ جاؤں میں تمہیں گھر لے چلوں گا۔ تمہاری مٹی کے پاس۔“



پکاش متا بھاگتے بھاگتے تھک چکا تھا۔ وہ ڈھنگ کی ملازمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پکڑے جانے کے ڈر سے۔ اور اور الیکٹرک یا گیس کا کوئی چھوٹا موٹا کام پکڑ لیتا تھا نتیجہ یہ کہ وہ افلاس کا شکار تھا۔ ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ سخت بے زار تھا۔

ایک ساوہتا تھی جو اسے اس قسم کی زندگی سے نجات دلا سکتی تھی۔ اسے وہ کامیابی سے بلیک میل کر سکتا تھا۔ پیرہ ہاتھ میں آ جاتا تو وہ ملک سے نکل بھاگنے کی سوچتا۔ وہ کوئی عام فنی بیگنوا ہوتا تو اب تک نکل بھی لیا ہوتا مگر پروفیسر ایش کے بچوں کے مؤثر کیس کے اہم ترین گواہ کی حیثیت سے اس کی شہرت ہو چکی تھی۔ اسے با آسانی پچانا جاسکتا تھا۔

اب وہ خود کو دوبارہ مقدمے میں لوٹ نہیں کر سکتا تھا۔ پچھلی بار مقدمے کے دوران میں وکیل استغاثہ نے جو کہا تھا ”وہ اسے اب بھی یاد تھا۔ اس نے کہا تھا۔“ بات صرف ہانوش گوار اور نا آسودہ ازدواجی زندگی کی نہیں۔ طرز محبت میں گرفتار تھی۔ وہ بہت پرکشش عورت ہے۔ 18 سال کی عمر میں اس کی شادی ایک بڑی عمر کے آدمی سے ہو گئی۔ اس پر بڑے کلمے غصے کے ساتھ ازدواجی زندگی بہت سی عورتوں کیلئے قابل رشک ہو گی مگر سوال یہ ہے کہ کیا ساوہتا ایش مطمئن تھی؟ جی نہیں، وہ مطمئن نہیں تھی۔ پروفیسر کا شکار دہائیس کے چولے کی مرمت کیلئے اس کے گھر آیا تو وہ اس پر رنج ہو گئی۔ شوہر کو بھول گئی اور شوہر بھی وہ جو اس کے چولے کے معاملے میں چند گھنٹوں کی پریشانی بھی برداشت نہ کر سکا۔ خیر۔ تو ساوہتا جی نے اس لڑکے کی پیش قدمی کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ وہ یہاں سے لکھنا چاہتی ہے اور لڑکے نے بچوں کا

پراکش کو اندازہ ہو گیا کہ سادھنا کو اپنے شوہر سے کوئی خاص لگاؤ نہیں بلکہ وہ اس سے بور ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس نے رائے ڈالا۔ اس نے کہا۔ ”آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ آپ کتنی حسین ہیں۔“

اس پر سادھنا کا چہرہ تنہا تنہا تھا مگر وہ کچھ بولی نہیں۔

”آپ باہر نکلا کریں نا۔ لوگوں سے ملیں، فلیش، فریش ہو جائیں گی۔“

”میرے بچے اتنے تھک جاتے ہیں کہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ کہیں آنا جانا پسند نہیں کرتے بلکہ ان کو کسی کا آنا بھی اچھا نہیں لگتا۔“

”مگر اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟“

سادھنا خاموش رہی لیکن اس کے چہرے کا تاثر جتنا تھا کہ وہ بھی یہی سوچ رہی ہے۔

اس لمحے پراکش کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ تنہائی کی ستانی ہوئی اس حسین عورت پر ہاتھ صاف کر سکتا ہے۔ اور اس نے پیش قدمی کی تھی۔

جس صبح پروفیسر افیش کے بچے غائب ہوئے، اس صبح پراکش ایک کلاس میں تھا جس میں صرف چھ طالب علم تھے۔ یعنی اس کے پاس وقت واردات پر اپنے کہیں اور ہونے کا ٹھوس ثبوت موجود تھا لیکن وکیل استغاثہ نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ اس کے باوجود وہ شریک جرم ثابت ہو سکتا ہے اور پھر عدالت میں وکیل استغاثہ کے بیان نے اسے دہلا دیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ شریک جرم کی حیثیت سے ملوث کر دیا جائے گا۔ ایسے میں اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ شرچھوڑ کر فرار ہو جائے۔

جس روز اس نے شرچھوڑا، اس روز اسے فوج سے بلاوے کا خط بھی موصول ہوا تھا۔ کچھ دیر کو اس نے سوچا کہ چلا جائے تو جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یوں تو وہ بکا چمچ جائے گا۔ فوجی سبکوڑا بننا مر جانے کے مقابلے میں بہر حال بہتر تھا۔

اسے اخبارات سے پتہ چلا کہ عدالت نے سادھنا کو سزائے موت سنائی ہے۔ اور پھر پروفیسر افیش کی خودکشی کی خبر اخبارات میں چھپی۔ اس نے اپنی کار اس منہر

حوالہ دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے کہہ دیا کہ وہ بچوں کا گھاموٹ دے گی۔ اب بی لارڈز۔ میں نہیں سمجھتا کہ پراکش متا جیسا جوان آدمی چند بوسوں سے بھل سکتا ہے بلکہ ایک جوان اور خوب صورت عورت کے ہوئے پھل کی طرح اس کی آغوش میں کرنے کیلئے تیار ہے۔ وہ اس نعمت کو کیسے ٹھکرا سکتا ہے۔“

یہ وہ موقع تھا کہ پراکش کو اپنی خراب پوزیشن کا پہلی بار احساس ہوا۔ یہ وکیل استغاثہ کسی بھی وقت اسے سادھنا کے ساتھ شریک جرم کی حیثیت سے ملوث کر سکتا ہے۔ صرف اس لیے کہ جس وقت سادھنا نے چولہے کی شکایت کیلئے اپنے شوہر کو فون کیا تو وہ اس کے کمرے میں موجود تھا اور وہ ایسا نہیں تھا کہ اپنی خدمات یوں رضاکارانہ پیش کرتا پھرتا ہو مگر اس نے کچھ لوگوں سے سن رکھا تھا کہ پروفیسر کی بیوی بہت کم عراور بہت خوبصورت ہے۔ اس نے سوچا، اس پر ڈورے ڈال کر دیکھے۔

اور اس نے جا کر دیکھا تو قائل ہو گیا۔ سادھنا تو کسی ماہر سنگ تراش کے تراشے ہوئے خوب صورت مجسمے سے بھی حسین تھی۔ وہ وہاں دوپہر کے قریب پہنچا۔ سادھنا اپنے بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔ اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

پراکش مثلاً لڑکیوں کے معاملے میں بہت تجربہ کار تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ سادھنا تک پہنچنے کا راستہ صرف اور صرف اس کے بچے ہیں۔ چنانچہ اس نے بچوں پر توجہ مرکوز کی۔ اور دو منٹ میں انہیں رام کر لیا۔ وہ ہنسنے پھٹکنے لگے۔ چولہے میں کوئی بڑی گڑبڑ نہیں تھی مگر اس نے جان بوجہ کہ کام بڑھا دیا۔ اور ایک پرزے کا بیج بھی ڈال دیا۔

پہلے دن وہ زیادہ دیر نہیں رکھا۔ وہ پروفیسر کو ٹک میں جٹا کر انہیں چاہتا تھا۔ وہ آفس گیا اور اسے پرزے کی ضرورت کے متعلق بتایا۔ پروفیسر اس کے بھانے میں آگیا۔ چنانچہ وہ اگلے روز بھی اس کے گھر بیچ گیا۔ اور اس سے اگلے روز بھی۔ اس نے سادھنا سے بات چیت شروع کر دی۔ سادھنا نے اسے بتایا کہ اس کی ماں کی موت کے بعد اس کا ندوس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا؟ لیکن اب میں بہتر ہو رہی ہوں مگر یہ بات میرے شوہر کو معلوم نہیں۔ انہیں پتا چلے گا تو وہ بہت ناراض ہوں گے لیکن بچ یہ ہے کہ میں ان درواؤں کے بغیر خود کو زیادہ بہتر محسوس کرتی ہوں۔“

تھا۔ بچلے کا مالک اپنے ایک دوست کے ساتھ برابر والے کمرے میں گفتگو کر رہا تھا۔ سادھنا کا نام سن کر پرکاش کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ بچلے کا مالک کمریوں میں دار بٹلنگ گیا تھا۔ وہ اپنے دوست کو بتا رہا تھا کہ وہاں اس نے بچوں کے قتل میں ملوث سادھنا کو دیکھا تھا۔ وہ وہاں رین بو ایسٹ ایجنسی کے مالک اجیت پال سے شادی کر چکی تھی۔ اور اس سے اس کے دو بچے بھی تھے۔ دوست نے شک کا اظہار کیا کہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ اس پر بچلے کے مالک نے کہا کہ اسے پورا یقین ہے کہ وہ وہی سادھنا تھی۔ اب تو پرکاش کے لئے راستہ کھل گیا لیکن دار بٹلنگ جانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ اس کیلئے اسے چوری کرنا پڑی۔ اس کیلئے ایک تو اس نے بچلے پر ہی ہاتھ صاف کیا پھر اس نے ایک سرخ مورس بھی اڑالی۔ اب وہ دار بٹلنگ جا سکتا تھا۔

پرکاش سب کچھ طے کر چکا تھا۔ وہ سادھنا کو پیش کش کرے گا کہ اس پر دوبارہ بڑا مقدمہ بھی چلا تو وہ اپنی گواہی بدل دے گا۔ اول تو وہ ملک ہی چھوڑ جائے گا اور سادھنا ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جائے گی۔ اس کیلئے اسے پانچ لاکھ روپے دینے ہوں گے۔ پرکاش نے اپنی داڑھی صاف کر دی اور بال جھونے کرا لے پھر وہ دار بٹلنگ پہنچ گیا۔ دار بٹلنگ پہنچ کر اس نے نقشے کی مدد سے سادھنا کا گھر تلاش کیا۔ اس کی لوکیشن اس کیلئے بہت مناسب تھی۔ ایک راستہ جنگل کی طرف سے بھی وہاں جاتا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت مناسب تھا لیکن بیڑول پمپ پر اس سے چوک ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بہت زیادہ خوش تھا۔ اسٹینڈنٹ نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ برف باری دیکھنے کیلئے آیا ہے۔ بس یہاں وہ غیر محتاط ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں یہاں ایک ایسے شخص سے ملنے آیا ہوں جو مجھے دیکھ کر بالکل خوش نہیں ہو گا۔“

وہ پونے دس بجے اس علاقے میں داخل ہوا۔ وہ جنگل سے گزر کر کچی سڑک پر پہنچا۔ اس وقت مخالف سمت سے ایک پرانی اسٹیشن وگن اسے آتی نظر آئی۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کر کے اسے راستہ دیا۔ پھر وہ کچی سڑک سے گزر کر سادھنا کے مکان تک پہنچ گیا مگر اس لیے سادھنا گھر سے نکلی۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ وہ اس کا پتہ کرتے ہوئے جمیل تک گیا۔ سادھنا جمیل میں اتاری مگر

کے کنارے چھوڑی تھی جس میں سے اس کے بچوں کی لاشیں برآمد ہوئی تھیں اور اس نے رقتہ چھوڑا تھا۔ ”یہ سب میرا تصور ہے میں اپنی بیوی سے اتنی محبت کرتا تھا کہ میں نے سوچا“ میں اسے ٹھیک کر دوں گا لیکن میں غلطی پر تھا۔ اس کے نتیجے میں میرے بچے زندگی سے محروم ہو گئے۔ سادھنا سے میری انتہا ہے کہ مجھے معاف کر دے۔ ایشی۔“

پھر ایک مجبورہ رونما ہوا۔ سادھنا کے خلاف جن دو عورتوں نے گواہی دی تھی ان کو کسی نے آپس میں گفتگو کرتے سنا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ سادھنا کو ناپسند کرتی تھیں اسی لیے انہوں نے اس کے خلاف بڑھا چڑھا کر بیان دیے۔ سادھنا کا وکیل اس گواہ کو اپیل میں لے گیا۔ مقدمے کی پوری کارروائی جانبدارانہ قرار دے کر کالعدم قرار دے دی گئی۔ دوبارہ مقدمہ اس لیے نہیں چلایا جا سکا کہ اب وہی اہم ترین گواہ تھا۔ اور وہ روپوش ہو گیا تھا۔ یوں سادھنا سزائے موت سے بچ گئی۔

اس معاملے میں ایک بات پرکاش کو پریشان کرتی تھی۔ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ سادھنا قتل کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔ وہ ہرگز قاتل نہیں ہے۔ وہ بے چارہ تو عدالت میں بھی خود کو بھانے کی کوشش نہیں کر رہی تھی اور پروفیسر ایشی نے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ اس نے گواہی دیتے ہوئے کہا تھا۔ سادھنا بہت اچھی ماں ہے مگر اس کا لہجہ اس کا انداز اس کے بیان کی نفی کر رہا تھا۔

مقدمے کی سماعت کے دوران میں ہی یہ بات سامنے آئی تھی کہ سادھنا کی ماں نے اس کیلئے بینک میں ایک بھڑی رقم چھوڑی ہے۔ درحقیقت اس کے پائلٹ باپ نے ان کے مستقبل کا خیال رکھتے ہوئے مالی منصوبہ بندی کی تھی۔ سو سادھنا اب کدو پتی تو نہیں تھی لیکن اسے زندگی بھر کی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔ اور بے چارہ پرکاش متا روکی سوچی کھا کر گزارہ کر رہا تھا۔ اسے ڈھنگ کے کپڑے بھی نصیب نہیں ہوتے تھے۔ تنہا الگ ستاقی تھی۔ وہ صنف نازک کی قربت کو ترس گیا تھا۔ اسے بار بار خیال آتا کہ وہ سادھنا سے رقم افغہ سکتا ہے مگر اخبارات کے مطابق سادھنا کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

پھر ایک دن قسمت اس پر مہربان ہو گئی۔ وہ ایک بچلے میں الیکٹرانک کام کر رہا

چند لمبے بعد واپس آئی اور کنارے پر ڈھیر ہو گئی۔ پرکاش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چکر کیا ہے اور وہ اس چکر میں پڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ سادھنا اسے دیکھ رہی ہے مگر اس کی نظروں کے خالی پن کو دیکھتے ہوئے اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے، پہچانتا تو دور کی بات ہے۔

وہ واپس چل دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی موٹیل میں ٹھہرے گا اور سادھنا سے اگلے روز ملے گا۔

اس نے موٹیل میں کرا لیا۔ اور فوراً ہی سو گیا۔ سہ پہر میں وہ جاگا۔ اس نے کمرے میں موجود ٹی وی آن کیا تو سب سے پہلے اسے اپنی ہی تصویر نظر آئی۔ وہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اس نے خبر سنی اور اپنی حماقت پر خود کو کستا رہا۔ پولیس کو اس کی یہاں موجودگی کا علم ہو گیا تھا اور جب اسے سادھنا کے بچوں کی گمشدگی کا علم ہوا تو وہ پاگل ہی ہو گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بری طرح بھڑ گیا ہے۔ واڑھی صاف کر کے اور بال جھوٹے کرا کے وہ ویسے ہی سات سال پہلے والا پرکاش لگ رہا تھا۔ واڑھی صاف کرتے وقت اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ تو خود کو سوبر حایت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیسویں جیسے محلے میں پولیس اسے پریشان کر سکتی تھی مگر وہ اعتیاد اب لگے پڑ گئی تھی۔

اب اگر حقیقت یہ ہے کہ سادھنا ہی نے اپنے ان بچوں کو ختم کر دیا ہے تو کون مانے گا کہ وہ اس میں ملوث نہیں۔ اس کے ہاتھ صاف ہیں اور شاید یہ اسی وقت ہوا ہو گا جب وہ وہاں پہنچا تھا۔ اسے اس پرانی اسٹیشن دیکھنا کا خیال آیا جو اسے سڑک پر ملی تھی۔ وہ کچی سڑک سے ہی آ رہی تھی۔ اور اس سڑک پر صرف سادھنا ہی کا گھر تھا۔ اس نے اس کے ڈرائیور کے متعلق یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے سوا کچھ یاد نہیں آیا کہ وہ ایک بھاری بھر کم آوی تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا اس لیے وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

پرکاش متا کی بٹا کی جگت اسے بتا رہی تھی کہ اب سرخ مورس اس کیلئے مخصوص ہے۔ علاقے میں موجود پولیس اس کی تلاش میں ہو گی اور اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ اسے جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہیے۔ اس نے اپنی چیزیں بیک

میں رکھیں اور پیچے سے موٹیل سے نکل آیا۔ اس کی کار کے برابر ایک فوس وگن کھڑی تھی۔ اس نے اس کا پونٹ کھولا، چند تار ملائے۔ اس کے بعد گاڑی اشارت کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

چھ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ پولیس کی کھڑی ہوئی ایک رکاوٹ پر پہنچا اور تیس سیکنڈ بعد اسے عقب نما آئینے میں اپنے پیچھے پولیس کی ایک گاڑی آتی نظر آئی۔ گاڑی کی چھت پر سرخ روشنی جل بچھ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے لیکن دہرے خوف نے اسے مزاحمت پر مجبور کر دیا۔ اسے تو فوج سے فرار بھی بھگتنا تھا۔ نہیں۔ پکڑے جانا کسی بھی اعتبار سے اس کیلئے اچھا نہیں تھا۔ ایک موٹر کالتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا، اپنا سوٹ کیس اٹکھینچا اور پرکاش اور کار سے کود گیا۔ وہ جنگل میں ٹھس ہی رہا تھا کہ تعاقب کرنے والی پولیس کار موٹر کالت کر سامنے آئی۔ وہ سائزن بجاتی ہوئی فوس وگن کے تعاقب میں دوڑتی چلی رہ گئی۔



ناک میں گھسے تو ناک میں سرسراہٹ ہونے لگی لیکن وہ جانتا تھا کہ پھینکنا اس کیلئے خطرناک ہے۔ وہ فوراً ہی پکڑ لیا جائے گا۔
ایک لمبے بعد کچن میں روشنی ہوئی۔ برے آدمی نے لیپ جلا لیا تھا۔ پھر اس نے پکارا، ”نوبین بیٹے، میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ باہر آ جاؤں۔“



بخاری لال فوراً ہی واپس جانے کے موڈ میں تھا مگر اچانک ہی اسے ڈپریشن کا احساس ہونے لگا پھر سر میں درد بھی شروع ہو گیا۔ ایسے میں پانچ گھنٹے کی ڈرائیو اسے ناممکن لگنے لگی۔ اوپر سے موسم اتنا خراب تھا پھر گھٹاماف کے دھکے نے بھی اسے بے چین کر دیا تھا۔ گھٹاماف نے اپنے بڑے میں سے اسے بچوں کی ایک تصویر نکال کر دکھائی تھی۔ بلاشبہ دونوں بچے بہت خوبصورت تھے اور انہیں کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ یہ خیال ہی بخاری لال کیلئے اذیت ناک تھا۔
اسے ایک اچھا ریسٹورنٹ نظر آیا تو اس نے گاڑی روک دی۔ اس نے سوچا کیوں نہ ڈھنگ سے کھانا ہی کھا لے۔ ساتھ ہی وہ وہاں پوچھ گچھ بھی کرے گا کہ ریسٹورنٹ کیسا چلتا ہے۔ آخر وہ بھی تو اس علاقے میں یہی بڑس کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

وہ سیدھا بار کی طرف چلا گیا۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ اس نے ایک جام طلب کیا۔ بارمین نے جام اس کے سامنے رکھا تو اس نے پوچھا، ”کچھ کھانے کو بھی مل سکے گا؟“
”کیوں نہیں سزا“

بخاری لال کو بارمین کا لہجہ اچھا لگا۔ وہ یقیناً اچھا ملازم تھا۔ بار بھی اس نے صاف سہرا رکھا تھا۔

”ہمارے ہاں ڈھائی سے پانچ بجے تک کچن بند رہتا ہے۔“ بارمین نے کہا۔
”لیکن آپ اگر یہیں کھانا چاہیں تو۔۔۔“

”یہیں نہیں۔“ بخاری لال نے جلدی سے کہا۔ ”کیا مل سکتا ہے؟“

نوبین سمجھتا تھا کہ اگر اسے بچ کر لکھنا ہے تو آواز پیدا کرنے سے۔ اپنے قدموں کی آہٹ سے چپتا ہو گا۔ اسے وہ دن یاد تھا جب ممی نے قالین اٹھوایا تھا تو انہوں نے کہا تھا۔ ”اب نیا قالین آنے تک تم بچوں کو ایک نیا کھیل کھیلنا ہو گا۔ اس کھیل کا نام ہے ”تمیزے چلنا۔“ سو وہ اور آدمی وہ کھیل کھیلے گئے۔ اس میں انہیں بچوں کے بل چلنا ہوتا تھا۔ دبے قدموں۔ کوئی آواز پیدا کئے بغیر۔ انہوں نے اس میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ وہ ایک دوسرے کو ڈرانے لگے۔ ایک کو دوسرے کی آمد کا پتا ہی نہیں چلتا تھا بلکہ وہ ممی کے بھی پیچھے پیچھے جاتے تھے اور وہ بے خبر رہتی تھیں۔

اب۔۔۔ یہاں بھی اسے وہی کھیل کھیلنا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا نکلا اور بیڑھیاں اتر کر پہلی منزل پر پہنچ گیا۔ اسے اس مکان سے لکھنا تھا اور ارطاکو پہنچانے کیلئے ڈیڑی کو لے کر آنا تھا۔

نیچے پہنچ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا پھر وہ کچن کی طرف لپک لیا۔ وہاں دروازہ تھا۔ وہ اس کی طرف جھپٹا۔ وہ اس کا پینڈل کھمٹانے ہی والا تھا کہ اسے بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کے گھٹنے کانپنے لگے۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پینڈل سے ہٹا لیا۔ اگر دروازہ پھٹس گیا۔ نہیں کھٹا تو برا آدمی اسے پکڑے گا۔ یہ سوچ کر وہ کچن سے دبے پاؤں نکلا اور عقبی کمرے میں چلا گیا۔

کچن میں لائٹ آن ہوئی مگر اسے ہی لمبے اندھیرا ہو گیا۔ نوبین صوفے کے پیچھے دھبک گیا۔ کمرے میں پتا نہیں کب سے صفائی نہیں ہوئی تھی۔ گرد کے ذرات اس کی

”کتاب اور بریلانی موجود ہے۔“

”بس تو ٹھیک ہے۔“ بنواری لال ڈپریشن دور کرنے لگا۔ ”تم اچھا کام کرتے

ہو۔“

”میرا اصول ہے کہ کام سلیقے اور محنت سے کرنا چاہیے۔“ بارمن نے کہا۔

”میں بھی اسی بزنس میں ہوں۔“ بنواری لال نے کہا۔ ”یہ آگے شائق ہاؤس

ہے نا؟ میں اسے خریدنے کا سوچ رہا ہوں۔ وہاں ہوٹل اور ریسٹورنٹ کیسا چلے گا۔“

بارمن نے چند لمبے سوچا جیسے شائق ہاؤس کی لوکیشن سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس کی آنکھیں پٹکیں۔

”وہ تو بڑے بزنس کی جگہ ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اچھا ماحول، اچھا کھانا، اچھی

شراب اور اچھی سروس ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ آپ ہنگامہ مچا دیں گے تو لوگ آئیں گے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس کے ساتھ جمیل کا کنارہ بھی ملے گا۔ یونٹ،

کلب بھی بنایا جا سکتا ہے۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے مگر وہ جو ٹاپ فلور پر مصیبت رہتی ہے اس سے بچنا چھڑا لیجئے گا۔“

”میں بھی اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کچھ عجیب سا آدمی ہے۔“

”وہ ہر سال یہاں پھیلی کے شکار کیلئے آتا ہے۔ یہ بات میں نے اجیت کے منہ

سے سنی تھی۔ یہ اجیت ہال بہت اچھا آدمی ہے۔ اسی کے تو بچے کوئے ہیں آج۔“

”ہاں۔ میں نے بھی سنا تھا۔“

”بہت پیارے بچے ہیں۔ ہاں۔ میں کہہ رہا تھا کہ ابھی چند ہفتے پہلے وہ کرائے

دار ایک دن یہاں آیا۔ کچھ پینے کیلئے۔ میں اسے پہچانتا ہوں۔ دیکھتا رہتا ہوں نا۔ تو

میں نے یونی بات کرنے کی غرض سے کہا کہ آپ یہاں ستمبر میں آئیں۔ ان دنوں

یہاں بڑا مال ہوتا ہے پانی میں۔ پتا ہے، اس احمق نے کیا کہا۔“

بنواری لال نے کھاتے ہوئے ہاتھ روک لیا اور اسے جواب طلب نظروں سے

دیکھنے لگا۔

”وہ میری بات سمجھا ہی نہیں۔ بولا۔ مجھے مال میں کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ بتائیں، کوئی شخص جو ہر سال پھیلی کا شکار کیلئے یہاں آتا ہو وہ بھلا میری بات نہیں سمجھتا مگر وہ سمجھا ہی نہیں کہ میں پھیلوں کی بات کر رہا ہوں۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ ظاہر ضرور کرتا ہے لیکن اسے پھیلی کے شکار میں کوئی دلچسپی نہیں۔“

بنواری لال نے کھانا ختم کیا۔ اب وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ

شائق ہاؤس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ مکان اسے ہر اعتبار سے بہت پسند آیا تھا۔ بس جھونٹ کے اپارٹمنٹ میں اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اچھا نہیں لگا۔

اس نے ملے ادا کیا اور کونٹ کے کالر اوپر کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔ اپنی کار کی

طرف بڑھتے ہوئے وہ گھر واپس کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اندر ایک تحریک تھی

جو اسے دوبارہ شائق ہاؤس جانے پر اکسا رہی تھی۔

جھونٹ خوس تھا۔ وہ اس سے اور گھنٹام سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا

چاہتا تھا۔ اور وہ درحقیقت! جھونٹ نے اس کا رخ تبدیل کر دیا تھا لیکن اس نے اسے

دوبارہ وہیں سیٹ کر کے دیکھا تھا۔ اسے ایک مکان نظر آیا تھا جہاں پولیس کی بے شمار

گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہی یقیناً اجیت کا گھر تھا اور وہ دوربین کتنی طاقتور تھی۔

جھونٹ اس کی مدد سے دوسروں کے گھروں میں جھانکتا تھا۔

ممکن ہے جس وقت بچے غائب ہوئے ہوں، جھونٹ نے دوربین سے انہیں

دیکھا ہو۔ ممکن ہے، اس نے انوکھے والے کو دیکھا ہو لیکن ایسا ہوتا تو وہ یقیناً

پولیس کو اطلاع دیتا۔ بنواری لال سوچے جا رہا تھا۔

اس نے سرگرت لکالی اور لائسنس کی مدد سے سلا کی۔ کھانے کے بعد سرگرت کا

لفظ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

اس کے ذہن میں شکوک سرسرا رہے تھے۔ ایسے میں کیا کرنا چاہیے؟ پولیس کو

فون کرے اور کہے کہ وہ شخص خوس تھا لہذا وہ اسے چیک کریں اور اگر پولیس چیک

کرے تو جھونٹ کے گا۔ جس وقت وہ لوگ آئے، میں نہانے جا رہا تھا۔ مجھے اس

طرح ڈسٹرکٹ کیے جانا اچھا نہیں لگا۔ اور یہ معقول جواب ہو گا۔

اس پر جواری لال کو رہبری بلخ کا خیال آگیا جسے اس نے ہاتھ بٹ میں تیرے دیکھا تھا اور بے لی پاؤڈر کی خوشبو جو وہاں پھیلی ہوئی تھی۔

اس کی سمجھ میں آگیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے اپنی جیب سے لائسنز نکالا اور اسے گودز کپارٹمنٹ میں چھپا دیا۔ اب وہ شافتی ہاؤس جائے گا۔ کسے گا کہ اس کا سونے کا لائسنز یہاں کیسے گر گیا ہے۔ وہ اسے ڈھونڈتا چاہتا ہے۔ یہ شافتی ہاؤس میں سمجھنے کا معقول بہانہ تھا۔ وہ مکان کا جائزہ لیتا یا تو اس کا شبہ بے بنیاد ثابت ہو جاتا یا اور قوی ہو جاتا۔ اس صورت میں وہ پولیس کو مطلع کر دیتا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور شافتی ہاؤس کی طرف چل دیا۔



وہ یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ماضی میں جانا اس کیلئے بے حد اذیت ناک تھا لیکن سوالات اس کا بچپا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ وہ اشیش کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ می کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور اسے جواب دینا تھا۔ اس کے بغیر وہ سوالات سے بچپا نہیں چھڑا سکتی تھی۔

اسے اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی ڈرامہ دیکھ رہی ہو۔ می ریسٹورنٹ میں۔ تبھی اس نے آخری بار انہیں دیکھا تھا۔ می کے چہرے پر پریشانی تھی۔ وہ کبھی اسے دیکھتی تھیں اور کبھی اشیش کو۔

”یہ لباس تم نے کہاں سے لیا ساہن؟“ می نے پوچھا۔

اسے اندازہ ہو گیا کہ لباس می کو پسند نہیں آیا ہے۔ وہ سفید لباس تھا۔

”اشیش نے پسند کیا تھا میرے لیے۔ آپ کو اچھا لگا؟“

”کچھ بچکانا ہے۔ چھوٹی بچیوں پر اچھا لگ سکتا ہے۔“

پھر می اٹھ گئیں۔ انہیں فون کرنا تھا۔ شاید ڈائریکٹر ایٹور لال کو۔ می ڈائریکٹر ایٹور لال سے بہت متاثر تھیں۔ غلوں سے ہی اندازہ ہوتا تھا اور وہ خوش بھی تھیں اور وہ انہیں خوش دیکھنا چاہتی تھیں۔ کاش یہ تمکھن کا احساس دور ہو جائے۔ شاید

اس نے یہ بات اشیش سے بھی کہی تھی۔

اشیش اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں ابھی آتا ہوں نہی بی۔“

اور اسی وقت می آگئیں۔ ”ساہن! میں اور تم کل بات کریں گے۔ یہ ضروری ہے اور ہاں۔ تنہا میں۔ اشیش کی موجودگی میں نہیں۔ میں تمہیں پک کر لوں گی۔ ہم ناشتہ ساتھ ہی کریں گے۔“

پھر فون آیا۔ ”ایک افسوس ناک حادثہ ہو گیا۔ اسٹیزنگ میں گڑبڑ کی وجہ سے۔“

”غم نہ کرو میں تمہارا خیال رکھوں گا تمہاری نگہداشت کروں گا نہی بی۔“ اشیش کہہ رہا تھا۔

پھر چٹا جلائی جا رہی تھی پھر وہ اشیش کے ساتھ پھیرے لے رہی تھی۔ وہ وہی سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔ بچکانا جو اشیش نے پسند کیا تھا لیکن اس کے کندھے پر گرلین کا دھبہ تھا۔ ”اشیش! یہ میرے کپڑوں پر گرلین کا دھبہ کیسے لگ گیا۔“ یہ تو بس میں نے اس روز پہنا تھا۔ می سے ملنے کیلئے۔

”کوئی بات نہیں صاف ہو جائے گا۔ فکر مت کرو۔“ اشیش کے مانوس ہاتھ اپنے مخصوص انداز میں اس کے کندھوں کو تھپک رہے تھے۔

”نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ وہ چلائی۔

”کیا کہنا چاہتی ہو ساہن؟“ سوال کرنے والی آواز پوچھ رہی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم۔ مجھے یقین نہیں۔ میں خوف زدہ ہوں۔“

”اشیش سے خوف زدہ ہو؟“

”نہیں۔ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ وہ مجھے دوا دیتے ہیں۔ بچے بھی کبھی کبھی۔“

اشیش بہت اچھے تھے۔“

”کیا اشیش کا برتاؤ بچوں کے ساتھ بہت اچھا تھا؟“

”وہ بچوں کو فرماں بردار دیکھنا چاہتے تھے۔ سناش ان سے ڈرتا تھا۔ تباہی“

وہ کہتے تھے۔ واہ۔ نہی بی کی بھی ایک بہت نہی بی ہے۔“

”یہ کتنا تھا اشیش؟“

”ہاں۔ کوئی گڑبڑ ہے۔ مجھے کھانے کے بعد دوا نہیں لینی چاہیے۔ میں بت
تھک جاتی ہوں۔ میں کہیں دور چلی جانا چاہتی ہوں۔“
”اشیش سے؟“

”میں بیمار نہیں ہوں۔ اشیش بیمار ہیں۔“

”کیا بیماری ہے اشیش کو؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“

”سادھنا، ہمیں اس دن کے بارے میں بتاؤ جب تمہارے بچے غائب ہوئے

تھے۔ سہاس اور تلجا۔“

”اشیش بہت خفا ہیں۔“

”کیوں؟ وجہ کیا ہے؟“

”انہوں نے مجھے دوا لینے کے بجائے ضائع کرتے دیکھ لیا ہے۔ انہوں نے مجھے

زبردستی زیادہ دوا پلا دی ہے۔ میں سوئی سوئی سی ہوں۔ تلجا رو رہی ہے۔ اشیش اس

کے پاس۔ اشیش نے اسے مارا ہے۔ کہتے ہیں، اس نے بستر میں پیشاب کیا ہے۔

مجھے اس کو لے جانا ہے۔ صبح میرا برتھ ڈے ہے۔“

”سادھنا، تمہیں اشیش سے محبت نہیں تھی؟“

”مجھے کتنی چاہیے لیکن تلجا بہت چپ چاپ ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم

برتھ ڈے ایک لائیں گے۔ میں دونوں بچوں کو لے کر نکلی ہوں ہم نے موسم بیاں

خریدی ہیں۔ ایک کیلئے بارش ہو رہی ہے۔ تلجا کی طبیعت بگڑ رہی ہوگی۔“

”اشیش اس روز پونیورسٹی گیا تھا؟“

”ہاں انہوں نے فون کیا میں نے بتایا کہ ہم بازار جائیں گے اور راستے میں

میں تلجا کو ڈاکٹر کو دکھاؤں گی۔ مجھے اس کی بڑی فکر ہے۔ اشیش کے پوچھنے پر میں سخ

بتایا ہے کہ ہم گیارہ بجے بازار جائیں گے۔ فی دی پر بچوں کا پسندیدہ پروگرام دیکھنے کے

بعد۔“

”تم نے تلجا کے متعلق پریشانی کا اظہار کیا تو اشیش نے کیا کہا؟“

”انہوں نے کہا موسم خراب ہے آج تلجا کا باہر جانا ٹھیک نہیں۔ میں نے کہا

میں شاپنگ کروں گی تو انہیں کار میں ہی چھوڑ دوں گی۔ وہ ضد کر رہے ہیں کہ میں گھر
پر ہی ایک بناؤں۔ وہ میرا ہاتھ پائیں گے۔ بے چارے بچے۔ انہیں خوش ہونے
کا۔ ہنسنے کیلئے کاموقع ہی نہیں ملتا۔ مجھے اشیش کو شروع ہی میں ان پر سختی سے روکنا
چاہیے تھا۔ یہ میرا قصور ہے۔ پرکاش آتا ہے تو بچے کتنا خوش رہتے ہیں۔ خوب
ہنسنے بولتے ہیں۔“

”سادھنا، تمہیں پرکاش سے محبت ہو مئی تھی؟“

”نہیں میں تو جیسے بچرے میں قید تھی۔ کسی سے بات کرنے کو بھی ترس مئی

تھی۔ پرکاش آیا تو اس سے بات کرنے لگی۔ جو کچھ پرکاش نے کہا، حقیقت وہ نہیں

تھی۔ حقیقت وہ نہیں تھی۔ بات میں نے کسی مگر میرا وہ مطلب نہیں تھا۔“ اس کی

آواز بتدریج بلند ہونے لگی۔

ایڈور لال کا کالجہ تسلی دینے والا۔ تھمکی دینے والا تھا۔ ”پھر تم گیارہ بجے بچوں

کو بازار لے گئیں؟“

”ہاں۔ میں نے اسٹور کے باہر گاڑی کھڑی کی۔ بچوں سے کہا کہ وہ گاڑی میں

بی بیٹھے رہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ بیٹھے رہیں گے۔ بہت بھارے بچے تھے وہ۔

بس پھر اس کے بعد میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ کبھی نہیں۔“

”تم اسٹور میں کتنی دیر رہی تھیں؟“

”زیادہ دیر نہیں۔ مشکل سے دس منٹ بھر میں باہر آئی۔ بچے کار میں موجود

نہیں تھے۔“ اس کے لیے میں بے یقینی تھی۔ حیرت تھی۔

”پھر تم نے کیا کیا؟“

”میری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سوچا، ممکن ہے وہ میرے لیے

تھے خریدے نکلے ہوں۔ سہاس کے پاس پہنچے تھے۔ میں نے انہیں ادھر ادھر دکانوں

میں تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ملے۔“

”تم نے کسی سے پوچھا بچوں کے بارے میں؟“

”نہیں میں نہیں جانتی تھی کہ اشیش کو پتا چلے۔ انہیں پتا چلے گا تو وہ ناراض

ہوں گے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ بچوں کو سزا دیں اور مجھے پتا چل گیا تھا کہ تلجا

نے بستر میں چٹاب نہیں کیا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”بستر تو بالکل سوکھا تھا تو پھر ایشیہ نے کیوں مارا۔ کیوں رلایا؟ خیر۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بچے تو اب ہیں ہی نہیں۔ سباش بھی غائب ہے۔ اور بتلا بھی۔ مجھے ان کو ڈھونڈنا ہے۔“

”اچھا۔ آج کی بات کرو تم نے نوین اور ارملہ کو ڈھونڈنا؟“

”مجھے جمیل کی طرف جانا چاہیے۔ جلدی کرو۔ جلدی۔ پانی میں کچھ نظر آ

رہا ہے۔ پانی میں کچھ ہے۔“

”کیا تھا ساوحنہ؟“

”کوئی سرخ سی چیز۔ شاید اری کا ستانہ۔ مجھے اس کو پکڑنا چاہیے۔ پانی بہت

فصحا ہے ہاتھ بھی نہیں بچتی رہا ہے۔ ارے۔ نہیں۔ یہ ستانہ نہیں ہے۔“

”تم نے کیا کیا؟“

”پانی سے باہر نکل آئی۔ کنارے پر گر گئی۔ وہاں وہ موجود تھا۔ جنگل میں۔ وہ

مجھے دیکھ رہا تھا۔“

چیف دیال اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسور لال نے اشارے سے اسے ٹھہرنے کو

کہا۔ اس کے انداز میں تنبیہ بھی تھی۔ ”وہاں کون تھا ساوحنہ۔ بتاؤ ہمیں، کون تھا

وہ؟“

”ایک شخص جسے میں جانتی ہوں وہ پرکاش متا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔“

ساوحنہ کی پلکیں بری طرح پڑ پڑائیں۔

اجیت کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ محض اس نے ایک گہری سانس لی۔ ایسور لال اٹھ کھڑا

ہوا۔ ”دوا کا اثر ختم ہو رہا ہے۔“

”ڈاکٹر۔ میں تم سے اور کرن دیوی سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

چیف دیال کا لہجہ بے تاثر تھا۔

”تم نہیں ٹھہرو اجیت۔“ ایسور لال کے لیے میں تاکید تھی۔ ”ساوحنہ اب

کسی بھی لیے جاگ سکتی ہے۔“

”ڈاکٹر۔ یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟“

”ڈاکٹر۔ یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟“

”میں نہیں سمجھتا کہ اب ساوحنہ سے مزید کچھ کی جا سکتی ہے۔“ ایسور لال

نے کہا۔

”اور ہمیں پتا کیا چلا۔ بس یہ کہ وہ اپنے پہلے شوہر سے خوف زدہ تھی اور یہ کہ

آج صبح پرکاش متا جمیل پر موجود تھا۔ بس؟“

”کیسی باتیں کرتے ہو تم نے توجہ سے نہیں سنا شاید یا تم سمجھ نہیں پائے۔“

ایسور لال کے لیے میں غصہ اور حیرت تھی۔

”میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی بات نہیں سنی جو مجھے بچوں کی

تلاش میں مدد دے سکے اور میں نے نا کہ ساوحنہ دیوی اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار

خود کو سمجھتی ہیں اور اپنے پہلے شوہر کے بارے میں اس کا رد عمل ہنسٹائی تھا۔“

”چیف۔ تمہیں پتا ہے بیڑو ٹیلیا کیا ہوتا ہے؟“

کرن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔“

ایسور لال نے چیف کو جواب دینے کا موقع دے بغیر کہا۔ ”یہ ایک نفسیاتی

اصطلاح ہے جو بچوں کے ساتھ جنسی اختطاط کی طرف اشارہ کرتی ہے۔“

”اس کا یہاں کیا تذکرہ؟“

”پوری طرح تو نہیں، مگر ہے۔ ساوحنہ کی شادی 18 برس کی عمر میں ہوئی لیکن

مجھے یقین ہے کہ دیکھنے میں وہ اور پھونکی گئی ہو گی۔ اسی لیے ایشیہ کمار نے اس سے

شادی کی اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ ساوحنہ کو ایسی دواؤں استعمال کرنا رہا۔

دواؤں کے نام پر۔ جنہوں نے اس کی یادداشت پر برا اثر ڈالا اور وہ متھل رہنے

لگی۔ سنو چیف، تم کسی طرح ایشیہ کمار کے بارے میں چھان بین کرو وہ بچوں کے

ساتھ زیادتی کرنے کا عادی رہا ہو گا۔“

چیف دیال نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف

اشارہ کیا جہاں سے برف گرتی دکھائی دے رہی تھی۔ ”وہ محض بچے یا تو اس موسم

میں باہر بھٹکتے ہوئے غصہ رہے ہیں یا پتا نہیں، کس طرح کے جرم کے قبضے میں ہیں۔“

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زندہ ہی نہ ہوں۔ میرا پہلا فرض انہیں تلاش کرنا ہے اور تم مجھ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں چھان بین کیلئے کہہ رہے ہو جو مرجکا ہے۔“
اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس مین نے کال ریسیو کی۔ ”میں ابھی چیف سے بات کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

چیف دیال تیزی سے فون کی طرف لپکا۔ ایڈور لال اور کرن نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ چیف فون پر بات کر رہا تھا۔ ”کتنی دیر پہلے؟ کہاں؟“
ایڈور لال دل ہی دل میں بھگوان سے پرارتھا کر رہا تھا کہ یہ خبر بچوں کے متعلق ہو۔ اور کوئی اچھی خبر ہو۔

چیف نے ریسیور کریڈل پر پٹا اور ان کی طرف مڑا۔ ”پرکاش متا آج صبح ساڑھے دس بجے وار بلیک موٹیل پہنچا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس نے ایک اور گاڑی پر ہاتھ صاف کیا۔ وہ گاڑی ابھی کچھ دیر پہلے ایک کھائی میں گری ہے لیکن پرکاش بچ لکھا ہے۔ اسے تلاش کرنا ہے۔ میں اس سلسلے میں جا رہا ہوں۔“

چیف دیال کے جانے کے بعد بھی ایڈور لال کھڑا سوچتا رہا۔ وہ سادھنا کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ وہ اس معاملے میں لوٹ ہے۔ وہ قصور میں انورادھا کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے فون کیا تھا اور اس کے بعد اشیش کمار کہیں چلا گیا تھا۔ وہ کہاں گیا تھا؟ کیا اس نے انورادھا کی باتیں سن لی تھیں؟ سادھنا نے کہا کہ اس کے لباس پر کندھے پر گریں کا دھبہ تھا بلکہ اس نے بالواسطہ یہ کہا تھا کہ وہ دھبہ اشیش کے ہاتھوں سے لگا ہو گا۔ اشیش اس کے کندھوں کو خاص انداز میں قہانے کا عادی تھا۔ تو کیا اشیش نے انورادھا کی کار میں گڑبکی تھی؟ لیکن کیوں؟ اسے کیا فائدہ ہو سکتا تھا اس سے؟ اور اب تو وہ اس دنیا میں نہیں تھا۔



ٹی وی پر پانچ بجے کی منافی خبروں میں بچوں کی گمشدگی چھائی ہوئی تھی۔ سادھنا کے پہلے بچوں کی کپس بھی دکھائی گئیں۔ پرکاش متا کو بھی عدالت سے نکلنے دکھایا گیا۔ پروفیسر اشیش کمار کو بھی دکھایا گیا۔ نیو مین کہہ رہا تھا۔ ”اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ پرکاش متا اس علاقے میں موجود ہے۔ اس کی تصویر آپ نے دیکھی اگر یہ شخص آپ کو کہیں نظر آئے یا آپ کے پاس کوئی ایسی معلومات ہوں جو بچوں کی گمشدگی سے متعلق ہوں تو فوراً پولیس سے رابطہ کریں۔ فون نمبر نوٹ کر لیں۔“
رنا اور جارج نے بجلی جاتے ہی اسٹور بند کر دیا تھا۔ وہ گھر پہنچے تو بیٹھی سے چلنے والے چھوٹے سے ٹی وی پر انہوں نے خبریں دیکھیں۔ ”یہ آوی مجھے جانا پہچانا لگتا ہے۔“ رنا نے تبصرہ کیا۔ ”دیکھنے میں ہی اچھا نہیں لگتا۔“
جارج نے بیوی کو گھور کر دیکھا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ لڑکیوں میں بہت مقبول ہو گا۔“

”اوہ۔“ تم شاید جوان آدمی کی بات کر رہے ہو۔“ رنا نے کہا۔ ”نہیں۔ میں اس پروفیسر کے متعلق کہہ رہی تھی۔“
”اسے کون اہمیت دے رہا ہے۔“ جارج نے کہا۔ ”اس نے تو خودکشی کر لی تھی۔ پولیس کی توجہ جوان آدمی پر ہے۔“
رنا ہونٹ کاٹنے لگی۔ ”اچھا۔ خودکشی کر لی تھی۔ اوہ۔۔۔“
”اب تم کھانے کی فکر کرو۔“

”کھانے میں دیر نہیں لگے گی لیکن ان بچوں کا تصور کرتی ہوں تو کھانے کا خیال بھی برا لگتا ہے۔ خدا جانے کہاں ہوں گے بے چارے۔ ان کی معیبت کے

انٹل جنہلا گیا۔ ”آپ کبھی مجھ پر یقین نہیں کرتیں تھے۔ یہ اب بت موٹا ہو گیا ہے۔ اور اس کے بال اڑ گئے ہیں۔ یہ سمجھا ہے۔ لیکن یہ دہی آدی ہے۔“
نیوز میں کہہ رہا تھا۔ ”آپ کے پاس کسی بھی قسم کی معلومات ہوں؟ خواہ وہ آپ کو غیر متعلق لگیں، مگر یہ کہ پولیس کو اطلاع ضرور دیں۔“
”انٹل“ ٹی وی بند کر دو۔ ”شرانے بیٹے سے کہا۔ ”دیوانی کا وقت ہو رہا ہے۔“

لیکن پوچا کہ دوران میں بھی کول کا ذہن الجھا رہا۔ انہوں نے انٹیل کی قسم کی پولیس سے تعاون کیا جائے۔ بظاہر غیر متعلق کتنے والی معلومات بھی پولیس کی مدد کر سکتی ہیں۔ پوچا ختم ہوئی تو اس نے انٹیل سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس وہ دس روپے کا نوٹ اب بھی ہے جو تمہیں اس آدی نے دیا تھا؟“
”جی ہاں میں نے اسے خرچ بھی نہیں کیا۔“
”اور وہ پتہ جو اس شخص نے دیا تھا۔“

”وہ بھی ہے میرے پاس۔“
”ذرا لے کر تو آؤ میں اس کا نام دیکھنا چاہتی ہوں۔“ کول نے بیٹے سے کہا۔
شرانے سے غور سے دیکھ رہا تھا۔ انٹیل کے جانے کے بعد اس نے کہا۔
”کول۔“ تم کس پیکر میں پڑنا چاہتی ہو؟“
”پتہ نہیں میرے اصرار پر بوجھ سا ہے۔“ کول نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
”ہم بچوں کی بات کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسے میں بچوں میں خود احمادی کہاں سے آئے گی۔“



معاملات خراب رخ پر جا رہے تھے۔ پہلے تو وہ اسٹیٹ ایجنٹ نازل ہو گیا۔ خریدار کو لے کر پھر پکی کے جانے کا انتظار۔ اور اس کے بعد لڑکا ہاتھ سے نکل گیا اور ابھی تک چمپا ہوا ہے۔
جنون کو خوشی کا جو احساس ہو رہا تھا وہ معدوم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ

سامنے ہمارے مسائل اور پریشانیوں کتنے چھوٹے لگتے ہیں۔“
”کبھی پریشانی؟“

”وہ۔ بات یہ ہے کہ۔“ رٹا ہچکا رہی تھی۔ موسم گرما میں ہاتھ کی صفائی دکھانے والوں نے انہیں بت پریشان کیا تھا۔ اس موضوع پر جب بھی بات کی جاتی، جارج اپ سیٹ ہو جاتا تھا مگر موسم سرما میں جھوم نہیں ہوتا۔ لہذا یہ مسئلہ بھی نہیں ہوتا مگر آج صبح جنون نے بے لی پاؤڈر کا ایک ڈبا پار کیا تھا۔ رٹا کو اس بات کا یقین تھا۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔
سوال یہ تھا کہ جنون نے بے لی پاؤڈر کا ڈبہ کیوں چرایا؟ اسے بے لی پاؤڈر سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ رٹا کو یہ سوال پریشان کر رہا تھا۔



وہیں ایک اور گھر بھی تھا جہاں پانچ بیچے والی خبریں سنی جا رہی تھیں۔ یہ گھر اس علاقے میں تھا جہاں بجلی اب بھی موجود تھی۔ شرانے اس وقت اپنے بچوں کے ساتھ شام کی چائے پی رہا تھا۔ اسی وقت ٹی وی اسکرین پر نوین اور ارملا کی تصویریں دکھائی گئیں۔ کول شرانے بلا ارادہ اپنے بچوں کی طرف دیکھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ وہ بیٹے اور دو بیٹیاں۔ نوین اور ارملا کو دیکھ کر اس نے بے ساختہ بھگون کو پکارا۔
”میرے بچوں کے ساتھ ایسا کچھ نہ ہوئے دنا بھگون۔“
”یہ تو بت موٹا ہو گیا ہے۔“ اچانک اس کے سب سے بڑے بیٹے انٹیل نے کہا۔

”کول نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کون موٹا ہو گیا بیٹے؟“
”وہ آدی۔ وہ جو سامنے نظر آ رہا ہے۔ اسی نے تو پچھلے مہینے مجھے پوسٹ آفس سے اپنا لیٹر لانے کے بدلے میں دس روپے انعام دیا تھا۔“
اس وقت ٹی وی پر پرکاش متا کو کورٹ سے نکلے دکھایا جا رہا تھا۔ ایشیش کمار اس کے آگے تھا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے انٹیل۔“ کول نے کہا۔ ”اس بے چارے کو تو مرے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں۔“

اسے خطرے کو دور کرتا ہے۔

بچوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد وہ یہاں محفوظ ہو گا۔ اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔ وہ یہاں سادھنا کی اذیت کو دیکھے گا۔ اور محفوظ ہو گا اور پرسوں شام وہ باہر نکلے گا۔ کوئی نہ کوئی چھوٹی بچی مل ہی جائے گی۔ ہمیشہ مل جاتی ہے۔ وہ اسے ہٹائے گا کہ وہ اسکول میں آنے والا نیا بچہ ہے۔ یہ ترکیب ہمیشہ کامیاب رہتی تھی۔

وہ اب بھی بچن میں تھا۔ اس نے لیپ اوپر کر کے اٹھایا ہوا تھا۔ اس نے پھر پکارا۔ ”نون۔ تم اپنی می کے پاس نہیں جانا چاہتے؟ وہ بھگوان کے پاس نہیں گئی ہے۔ ٹھیک تھا۔ اور خیریت، سے ہے آ جاؤ بیٹے۔“

پھر وہ ہال میں بڑھنے لگا اسے اچانک ہی عقبی کمرے کا خیال آیا تھا۔ وہ لیپ کو سر سے اوپر اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں کھلیں۔ اچانک اس نے ادھر ادھر ٹٹول رہی تھیں۔ تیزی سے کھوستے ہوئے اس نے لیپ کو بھی جھپٹا لیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی گئی۔ لیپ کی متحرک روشنی نے صوفے کے پیچھے ایک انسانی سائے کو نمایاں کر دیا تھا۔

”نون۔ بکڑے گئے نا۔“ اس نے خوشی سے چیخ کر کہا پھر وہ تھمتے لگانے لگا۔
”اس بار تم چیخ کر نہیں نکل سکتے۔“

○

جھپٹا ہٹ نے لے لی تھی۔ لڑکا خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ اگر وہ فرار ہو گیا تو یہ جہاں کن ثابت ہو گا۔ اب تو بھڑکی ہے کہ ان دونوں کو فوراً ٹھکانے لگا دیا جائے۔

لیکن ایک بات تھی خطرے کا احساس اس کے جسم میں سنسنی دوڑا دیتا تھا۔ پھیلی بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ چپکے سے کیپس سے نکلا اور بازار گیا تو اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ بس وہ یہ جانتا تھا کہ اسے سادھنا کو بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے روکنا ہے۔ بچی ڈاکٹر کے پاس جائے گی تو اس کی پول کھل جائے گی۔

اس نے اپنی کار بڑی احتیاط سے پارک کی تھی۔ وہاں اس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس نے سادھنا کو اپنی گاڑی میں آتے دیکھا پھر وہ بچوں کو گاڑی میں چھوڑ کر اسٹور کے اندر گئی۔ ادھر ادھر کوئی نہیں تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ بارش ہو رہی تھی۔ موقع بہت اچھا تھا۔

صرف ایک لمحے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ بیچ اس کے اشاروں پر چلتے تھے۔ اس سے ڈرتے تھے۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا تو وہ اسے دیکھ کر چونکے اور سسم گئے۔ ”جلدی کرو۔ آج می کا برتھ ڈے ہے۔ ہمیں ایک کھیل کھیلنا ہے می کے ساتھ۔“ اس نے ان سے کہا۔ وہ اٹھے اور اس کے ساتھ چل دیے۔

وہ انہیں اپنی گاڑی تک لے آیا۔ اس نے انہیں ڈکی میں بیٹھنے کو کہا۔ انہوں نے چوں بھی نہیں کی۔ اس نے پلانٹک کے شاہر ان کے چروں پر چڑھائے اور ہاتھ سے ان کا منہ اور ناک بند کر دی۔ وہ چند لمبے ترپے بھران کی جدوجہد دم توڑ گئی۔ اس نے مطمئن ہو کر ڈکی کو بند کیا اور تیز رفتاری سے واپس کیپس پہنچ گیا۔ پورا معاملہ صرف چند منٹ میں منٹ گیا تھا۔

اس کی کلاس لیپ میں تجربے میں منہمک تھی۔ کسی کو اس کی غیر موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ضرورت پڑنے پر پوری کلاس گواہی دیتی کہ وہ تمام وقت ان کے سامنے رہا تھا۔ وہ یونیورسٹی سے نکلا ہی نہیں تھا۔

پھر اسی رات موقع پا کر وہ گاڑی کو نر کے کنارے لے گیا اور بچوں کی لاشوں کو نر میں پھینک دیا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور خطرہ دور ہو گیا تھا۔ اب پھر

اس نے اپنے ذہن میں مکان کے نقشے کو دہرایا۔ عقبی بیڑھیوں تک پہنچنے کیلئے ہال سے گزرتا ہوتا تھا۔ وہی عقبی کرا تھا۔ وہ مکان کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ عقبی کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ اسی لمحے روشنی کھڑکی تک آگئی۔ وہ محتاط انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔

پھر اسے جھونٹ نظر آیا۔ وہ کسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ہزاری نے سننے کیلئے کھڑکی سے کان لگا دیا۔

”نہیں۔“ جھونٹ پکار رہا تھا۔ ”نہیں۔“

ہزاری لال کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ یعنی بچے اس مکان میں موجود تھے۔ گھنٹام نے اسے بچوں کے نام بتائے تھے۔

لیپ کی روشنی وائرے میں گھومی۔ جھونٹ کا ہماری جسم نمایاں طور پر نظر آیا۔ ہزاری لال کو احساس تھا کہ جسمانی اعتبار سے وہ جھونٹ کے جوڑ کا نہیں ہے۔ تو کیا اسے جا کر پولیس سے مدد لی جاوے؟ لیکن جھونٹ نے نوین کو پکڑ لیا تو چند منٹ سے بھی بہت بڑا فرق پڑ سکتا ہے۔

پھر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے جھونٹ کو صوفے کے پیچھے دیکھے ہوئے نوین کو پکڑتے دیکھا۔ بچے نے ہانگے کی ٹاکام کو شش کی تھی۔ جھونٹ نے لیپ بچے رکھ رہا تھا اور اب دونوں ہاتھوں سے بچے کا گلہ دبا رہا تھا۔

اب ہزاری لال نظریں نہیں چڑا سکتا تھا۔ اس نے تاج کے ڈریسے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ جھونٹ نے گھوم کر دیکھا۔ ہزاری لال نے اندر ہاتھ ڈال کر کھڑکی کھول دی پھر وہ بڑی پھرتی سے کھڑکی سے اندر کود گیا۔ لیکن خود کو سنبھلنے میں اس کے ہاتھ سے تاج چھوٹ گئی۔ جھونٹ نے اسے تیزی سے اٹھایا اور ہتھیار کی طرح سر سے بلند کیا۔

”نوین، ہماگ جاؤ۔ مدد لے کر آؤ۔ ہماگ جاؤ۔“ ہزاری لال نے چیخ کر کہا۔

اسی لمحے تاج اس کے سر پر پوری قوت سے گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے چھانے لگے۔

ہزاری لال پہاڑی راستے پر ڈرائیو کر رہا تھا۔ روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ چند فٹ آگے دیکھنا بھی ناممکن تھا اس لیے وہ بہت احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ راستہ پھسلوں ہونے کی وجہ سے گاڑی کیلئے خطرناک ہے۔

چند منٹ بعد وہ شائق ہاؤس کے ڈرائیو دے میں داخل ہوا۔ گاڑی روک کر اس نے مکان کی طرف دیکھا تو وہاں مکمل اندھیرا دیکھ کر اسے اپنی حماقت پر ہچکتا ہوا ہونے لگا۔ اس وقت اوپری منزل بھی تاریک تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بجلی چلی گئی ہے مگر اس جھونٹ کے پاس یقیناً لیپ تو ہوں گے۔ اس موسم میں تو بجلی کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہوتا۔

اس نے سوچا، ممکن ہے جھونٹ سو گیا ہو اور اسے بجلی کے جانے کا پتہ ہی نہیں چلا ہو اور کیا پتا۔ فرض کر لو کوئی رومالوی چکر ہے۔ کوئی عورت جھونٹ کے پاس آئی ہو اور وہ نہیں چاہتا ہو کہ اس عورت کو کوئی دیکھے۔ یہ ناممکن تو نہیں۔ جھونٹ اکیلا آدی ہے۔ اور اکیلے آدی ایسے چکر چلاتے رہتے ہیں۔

یہ خیال اسے حقیقت سے بہت قریب لگا اور جھونٹ کو شرمندہ کرنا اچھا نہیں تھا۔ اس نے سوچا، حماقت کو آگے بڑھانے کے بجائے خاموشی سے واپس ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔

وہ گاڑی چلانے ہی والا تھا کہ اسے پیچے کے کچن کی کھڑکی میں روشنی نظر آئی پھر وہ روشنی حرکت میں نظر آئی۔ وہ ہال سے گزری۔ کوئی لیپ لے کر چل رہا تھا۔ ہزاری لال نے گھوڑ کھار گھنٹ سے بڑی تاج نکالی اور کار سے اتر کر تیز قدموں سے مکان کی طرف چلا۔

میں وہ کل نہیں سکے گا۔ پکڑا جائے گا۔"

"لیکن پرکاش بچوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

اسی وقت ایبور لال کمرے میں چلا آیا۔ اس کے پیچھے کرن بھی تھی۔ ایبور لال نے ساروہا کو بست خور سے دیکھا۔ "اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو بیٹی۔؟" اس نے پوچھا۔ ساروہا اسے بہتر لگ رہی تھی۔ بڑی حد تک اپنے قابو میں۔

"ٹھیک ہوں میں نے اشیش کے متعلق بہت باتیں کی ہیں؟"

"ہاں۔"

"ایک بات ہے جو میں یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوئی بہت اہم بات ہے جو میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔"

"یاد آئی وہ بات؟" ایبور لال نے پوچھا۔

"نہیں۔" ساروہا اٹھی۔ اس کے انداز میں بے چینی تھی۔ وہ کمزری کی طرف

بڑھ گئی۔ وہ اپنے دلخ پر چھائی ہوئی دھند سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے باہر جھانکا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ پارک زرد لباس پہنے ہوئے ہے۔ اسے سردی کا احساس ہونے لگا۔ "میں لباس تبدیل کروں گی۔" اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے اوپر چلی گئی۔ اجیت اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اوپر ساروہا نے سردی کے دھارے سے رخسار نکالا۔ اچانک دروازہ کھلا اور اجیت اندر آیا۔ "ساروہا۔ تم ٹھیک تو ہو؟" اس کے لیے میں پریشانی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ سچ سچ۔"

اجیت نے تیزی سے بڑھ کر اسے لپٹا لیا۔ وہ بھی اس سے لپٹ گئی۔

اجیت کے معاملے میں شروع ہی سے ایسا تھا۔ وہ اسے چاہتی تھی اس کا لمس اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کی قربت کی وہ خواہش کرتی تھی۔ بے چارہ اشیش، اس کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ اس سے تو وہ بچتی بچتی تھی اور تنہا کی پیدائش کے بعد تو وہ جتنی جتنی کی حیثیت سے کبھی ملے ہی نہیں۔ پتا نہیں اشیش نے ہی اس کا گریز محسوس کر لیا۔ وہ اس معاملے میں ہمیشہ خود کو مجرم محسوس کرتی تھی۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" اسے نہیں پتا تھا کہ یہ اس نے کہا ہے۔ یہ



ساروہا کاؤچ پر اٹھ بیٹھی تھی اور سامنے کی طرف مگور رہی تھی۔ اجیت نے آتش دان میں آگ جلا دی تھی۔ لکڑیاں جھنکے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور آتش دان میں شعلے ناچ رہے تھے۔

کل؟ ابھی کل ہی کی تو بات ہے؟ وہ نوین کے ساتھ باغیچے میں ٹہل رہی تھی۔ نوین نے ٹوٹا ہوا برش اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ آتش دان میں کام آ سکتا ہے نا مٹی؟"

نوین بہت پیارا بچہ تھا۔ بالکل اجیت کی طرح۔ ساروہا کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کیلئے یہ بات طمانیت بخش ہے کہ نوین ارطال کے ساتھ ہے۔ وہ بہت ڈسے دار بچہ ہے۔ حتی الامکان اپنی بہن کا خیال رکھے گا۔

"بے بیگوان۔"

اسے نہیں پتا تھا کہ یہ بلند آواز میں اس کے منہ سے نکلا ہے۔ اجیت بڑی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی آواز سن کر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر کرب تھا۔ پریشانی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ اس کا چھوٹا ساروہا کو اچھا نہیں لگے گا۔ وہ جانتا ہے کہ وہ سوچنا چاہتی ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ اسے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ بچے ابھی زندہ ہیں۔ وہ کیسے مر سکتے ہیں جبکہ اس کے دل میں امید کا ننھا سا دیا جل رہا ہے۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ صبح میں نے پرکاش متا کو دیکھا تھا؟" اس نے اجیت سے کہا۔

"ہاں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خواب ہو؟ ڈاکٹر ایبور لال کو یقین تھا میری بات کا؟"

"اس کا خیال ہے کہ تم نے جو کچھ بتایا، سب درست تھا۔"

اجیت نے کہا۔ "اور ساروہا، یہ حقیقت ہے کہ پرکاش کو اس علاقے میں دیکھا گیا ہے۔ وہ دار بلیک موٹیل میں پندرہ گھنٹے ٹھہرا بھی تھا۔ یہ طے ہے کہ اس موسم

نکل ہی نہ سکا اور جب اس نے چہرہ پانی میں سے اٹھایا تو اس کے منہ سے بلیغ رباہے
بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں اور جسم پر لرزہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھا
لیکن غصے سے کہیں زیادہ خوف کا شکار تھا۔

اس روز سادھنا کو پتہ چلا کہ اشیش پانی میں ڈبکی لگانے سے ڈرتا ہے
ہاں۔ یہ ہے وہ بات! اس نے سوچا وہ یہی بات کرنے کی کوشش کر رہی
تھی۔ یہ پانی کا خوف جسے وہ چھپا کر رکھتا تھا۔ ہے بھکوان۔ سادھنا نے شاور بند کیا۔
تو لمبے سے جسم خشک کر کے لباس پہنا۔ اور پھر بری طرح جینے لگی۔ اسے خود پر قابو
نہیں تھا۔

○

لفظ تو وہ سوسے میں بھی کہتی تھی اجیت سے۔

”میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں سادھنا۔ اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ تم کتنے
کرب میں تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں سمجھتا ہوں لیکن درحقیقت میں نہیں سمجھتا
تھا۔“

”اجیت۔ ہمارے بچے واپس آئیں گے نا؟“ سادھنا کی آواز لرز رہی تھی۔
جسم میں بھی لرزش تھی۔

اجیت کی ہانسیں کی گرفت میں گرم جوشی بڑھ گئی۔ ”کیا کہہ سکتے ہیں جان مگر جو
کچھ بھی ہو، ہم دونوں تو ہیں نا ایک دوسرے کے لیے۔ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ حقیقت
کبھی نہیں بدلے گی اور سنو، انہوں نے پرکاش کو جنگل سے گرفتار کیا ہے۔ ڈاکٹر
پاپیس اشیشن جا چکے ہیں۔ میں بھی جا رہا ہوں کرن کے ساتھ۔“
”میں بھی چلوں۔ شاید وہ مجھے بچ بتا دے۔“

”نہیں۔ کرن کا ایک آپنڈیا ہے جو کامیاب ہو سکتا ہے لیکن تم سامنے جاؤ گی
تو ممکن ہے کہ پرکاش زبان بند کر لے۔“

”اجیت۔“ سادھنا کے لہجے میں یاس تھی۔

”دیکھو جان۔ خود کو سنبھالے رکھو۔ بس اور تھوڑی دیر۔ مکھنٹام تمہارے
پاس رکے گا۔ میں جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

اجیت کے جانے کے بعد سادھنا ہاتھ روم میں چلی گئی۔ اس نے لبابہ آٹارا
شاور کو ایڈجسٹ کیا۔ شاور سے مناسب حد تک گرم پانی کا فوارہ چھوٹا۔ وہ اس کے
بچے کھڑی ہوئی تو اسے ایسا لگا جیسے اس کے جسم سے ٹھنکن اور اعصاب سے کشیدگی
دھل رہی ہے۔ اس نے چہرہ پانی کے سامنے کر دیا۔

اب تو اسے ٹب میں نہانے مدتیں ہو گئی تھیں۔ اشیش سے شادی کے بعد اس
نے ہاتھ ٹب کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس کے تصور میں ایک موہوم سی یاد ابھری۔
ٹب۔ اشیش اصرار کرتا تھا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے نہلانے کا اور اسے برا لگتا
تھا۔ ایک بار اس نے چڑ کر اشیش کو دھکیلا تھا۔ اشیش کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ منہ کے
بل پانی میں گرا تھا۔ اس کا چہرہ پانی کے اندر تھا۔ وہ اتنا بوکھلایا کہ چند لمبے خود کو باہر

چیف نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہات نہیں بنے گی وہ بہت کچھ وار ہے۔ اور بھگوا ہی سہی میرا حال فنی ہے۔ ہم اس پر قانون سے ہٹ کر سختی نہیں کر سکتے۔“

”ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے۔ دیکھیں نا، ایک ایک مل اہم ہے اگر اس کا کوئی شریک بھی ہے تو بچے اس کے پاس ہوں گے اور وہ شخص پر کاش کی گرفتاری کا سن کر نروس ہو سکتا ہے۔ اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”چلو۔ ہات کر دیکھو امید نہ باندھنا۔“

چیف کرن کو لے کر اندر جانے لگا تو بج پر بیٹھی ہوئی عورت مضطرب ہو کر اٹھی۔ ”چیف۔ مجھے ایک منٹ دے سکتے ہیں آپ؟“ اس نے ہچکچاتے ہوئے پکارا۔

چیف دیال نے پلٹ کر اسے بہت غور سے دیکھا۔ ”کوئی اہم بات ہے؟“

”ممکن ہے،“ اہم نہ ہو، اصل میں میرے بیٹے نے مجھے بتایا ہے کہ۔“

”آپ جیسے۔“ چیف نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ایک اہم معاملہ نمٹاتے ہی میں آپ سے بات کروں گا۔“

کول دوبارہ بیٹھ گئی۔ ہیڈ عمر نے اس کے انداز میں مایوسی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتائیں، میں کچھ کر سکتا ہوں؟“

لیکن کول کو اس پر بھروسہ نہیں تھا۔ جب وہ اور شوا آئے تھے تو انہوں نے اسے بتانے کی کوشش کی تھی کہ ان کے بیٹے کے پاس شاید ایک اہم اطلاع ہے جو اہیت پال کے بچوں کی گمشدگی سے متعلق ہے۔ ہیڈ عمر نے پریشان ہو کر کہا۔ ”آپ بیٹے جائیں آج ہم فون پر بھی دن بھر ایمری ہی کالیں بھیجتے رہے ہیں۔ چیف کو فرصت ملے تو ہی آپ سے بات کریں گے۔“

چنانچہ اب کول نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہیڈ عمر کی دیکھش مسترد کر دی مگر وہ تیرہ کر چکی تھی کہ بات کیے بغیر یہاں سے نہیں ملے گی۔

اسی وقت ایک اور جوڑا پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا۔ ”ہیلو مسٹر جارج۔“

جارج۔ ”ہیڈ عمر نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

”تمہیں بھی یقین نہیں آئے گا۔“ جارج نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

”اس موسم میں میری بیوی یی رپورٹ درج کرانے کے لیے یہاں آئی ہے کہ آج صبح

اجیت اور کرن پولیس اسٹیشن پہنچے تو ہیڈ عمر نے سراٹھا کر انہیں دیکھا۔

”آپ یہاں؟ مجھے آپ کے بچوں کی گمشدگی پر افسوس ہے جناب۔“ اس نے اجیت سے کہا۔

”یہ بتاؤ پرکاش متا سے کہاں پوچھ کچھ ہو رہی ہے؟“ اجیت نے پوچھا۔

ہیڈ عمر ایک دم چوکتا ہو گیا۔ ”آپ کا اس سے کیا تعلق؟“

”چیف کو بتاؤ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ فوراً۔“

ہیڈ عمر احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن اہیت کے لہجے کی سنگینی نے اسے روک دیا۔

اس نے قریب کمرے کا نشیل سے حسمانہ لہجے میں کہا۔ ”جا کر چیف کو بتاؤ کہ شری اجیت ان سے ملنا چاہتے ہیں۔“

اجیت نے ادھر ادھر دیکھا وہاں بج پر دو افراد بیٹھے تھے۔ وہ یقیناً جی اور جی تھے اور ان کی عمریں اجیت اور سادھنا جتنی ہی ہوں گی۔ پتا نہیں، وہ یہاں کس سلسلے میں بیٹھے ہیں۔ اجیت نے سوچا مگر کچھ جمل سا لگ رہا تھا جبکہ عورت ڈٹ کر بیٹھی تھی۔

ممکن ہے، دونوں میں لڑائی ہوئی ہو۔ اور عورت تھا نے پکری پر تکی ہوئی ہو۔

چیف دیال لپکا ہوا آیا۔ ”کیا بات ہے اجیت؟“

اجیت کے بجائے کرن نے پوچھا۔ ”پرکاش متا یہاں موجود ہے؟“

”ہاں اور ڈاکٹر ایڈور لال بھی میرے ساتھ ہیں۔ پرکاش کوئی جواب نہیں دے رہا ہے۔ کتا ہے وکیل سے بات کیے بغیر بات نہیں کروں گا۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا اس لیے ہم آئے ہیں۔“ کرن نے کہا پھر وہ دھیمی آواز میں اسے اپنی اسکیم بتاتے لگی۔

کسی نے ہمارے اسور سے بے بی پاؤڈر کا ایک ڈبہ چرایا ہے۔
رہا آپ سیٹ نظر آ رہی تھی۔" مجھے ہرگز پروا نہیں کہ یہ بات بظاہر کتنی
اعتقاد نگ رہی ہے۔ بہر حال مجھے چیف دیال سے بات کرنی ہے۔
"وہ ابھی آئیں گے آپ نہیں۔" بیڈ عذر نے کہا۔ اس نے بچ کی طرف
اشارہ کیا جہاں کول اور شرما بیٹھے ہوئے تھے۔

رہا اور جارج بھی بچ پر بیٹھ گئے۔ جارج غصے سے بڑبڑایا۔ "میری سمجھ میں
نہیں آتا کہ ہم یہاں کیوں خوار ہو رہے ہیں۔"
شرما نے اس کی ہاں ہاں ملائی۔ "یہی حال ادھر بھی ہے۔" کول نے تیز
لہجے میں کہا۔ "ہم ان بچوں کی خاطر یہ تکلف اٹھا رہے ہیں جو شاید اس سے بہت بڑی
تکلیف میں ہوں گے۔"



چیف کے کمرے میں پرکاش متا کرن کو معائنہ آنہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ
انداز ہی اندر خوف زدہ تھا۔ اجیت کے بچوں کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اسے ڈر
تھا کہ بچوں کو کچھ ہو گیا تو یہ لوگ اسے اس کے سر منڈھنے کی کوشش کریں گے لیکن
کسی نے بھی اسے سادھنا کے گھر کے قریب نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات اس کے حق میں
جاتی تھی۔

"تم بڑی دشواری میں پڑ گئے ہو۔" کرن اس سے کہہ رہی تھی۔ "تم فوج سے
بھاگے ہوئے ہو۔ اور اب پولیس کی تحویل میں ہو۔ اب بچوں کے معاملے میں تم
لوٹ ہو یا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری اس علاقے میں موجودگی ہے
معتی نہیں ہے۔"

پرکاش جانتا تھا کہ وہ بچ کہہ رہی ہے لیکن اس نے دل کڑا کر کہا۔ "دیکھا
جائے گا۔"

اجیت اس کی طرف بیٹھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "میری
بات غور سے سناؤ۔ میری بچی نے آج صبح تمہیں میرے گھر کے پاس جھگ

میں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ ہوا، تم اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ
جاتے ہو۔ اگر تم ہمیں سب کچھ بتا دو اور بچے ہمیں مل جائیں تو میرا وعدہ ہے کہ تم
پر بچوں کے اغوا کا الزام نہیں عائد کیا جائے گا اور یہ کرن شرما۔ یہ ملک کی ٹاپ کی
وکیل ہیں، یہ تمہاری سزا کم سے کم کرا دیں گی۔ کیا خیال ہے؟ منظور ہے کہ نہیں؟"
اجیت کا انداز اچانک جارحانہ ہو گیا۔ "اور اگر مجھے بعد میں پتہ چلا کہ تم تعاون کر کے
میرے بچوں کو بچا سکتے تھے۔ لیکن تم نے تعاون نہیں کیا اس صورت میں تم کسی
بھی جیل میں جاؤ، میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

"اجیت۔" چیف دیال نے اجیت کو پکڑ کر کھینچا اور پرکاش سے دور کر دیا۔
پرکاش نے سمجھ لیا کہ اب اس کے پاس کوئی پتا بھی نہیں رہا کہ کھیل سکے۔
اس نے کندھے جھک دیے۔ اس نے کرن سے پوچھا۔ "تم میرا کیس لو گی؟"
"ہاں۔ کیوں نہیں۔" کرن نے کہا۔

پرکاش اجیت سے نظریں چرا رہا تھا۔ "ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔ میں ہمیں
تھا۔"

وہ بڑی توجہ سے اس کا بیان سن رہے تھے۔ پرکاش نے بتایا کہ وہ سادھنا
سے کچھ رقم وصول کرنے کے ارادے سے آیا تھا تاکہ ملک سے فرار ہو سکے۔
"تمہارا سادھنا کے بارے میں کیا خیال ہے؟" کرن نے پوچھا۔

"میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ وہ اس
طرح کی ہے ہی نہیں۔ لیکن میرے وکیل نے مجھے سمجھایا تھا کہ میں سادھنا کو پھنسانے
کی کوشش کروں ورنہ وکیل استیفاء مجھے بھی لوٹ ثابت کر دے گا۔"
"آج صبح کی بات کرو۔" چیف دیال نے تندر لہجے میں کہا۔ "تم اجیت کے گھر
بکب بیٹھے تھے؟"

"وس بچے میں چند منٹ ہوں گے۔" پرکاش نے کہا۔ "میں گاڑی آہستہ چلا رہا
تھا۔ مجھے کچے راستے کی تلاش تھی پھر مجھے اس گاڑی کو راستہ دینے کیلئے اپنی گاڑی
روکی پڑی اور وہ دوسری گاڑی اس کے راستے سے ہی آئی تھی۔"
"دوسری گاڑی؟" اجیت کے لہجے میں بے تابی تھی۔ "کیسی گاڑی؟"

”وہ نوین ہی تھا۔“ سادھنا چلائی۔ اس نے ایکسچج کا نمبر ملایا۔ ”آپرینر“ تم بتا سکتے ہو کہ ابھی میرے فون پر کال کس نمبر سے کی گئی تھی۔ کہاں سے کی گئی تھی؟“

”سوری شریستی جی۔ یہ تو معلوم ہو ہی نہیں سکتا اور موسم بھی گزریا کر رہا ہے۔“

”یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ کال کہاں سے آئی تھی۔“

”رابطہ نوٹنے کے بعد یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا شریستی جی۔“

سادھنا نے تھکے تھکے انداز میں ریسور کریڈل پر رکھ دیا۔ ”کسی نے شاید ٹیلی فون بے کار کر دیا۔ شاید اس نے جس کے قبضے میں پہنچے ہیں۔“

”آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ کے بیٹے کی آواز تھی؟“ پولیس والے نے پوچھا۔

سادھنا نے خود کو سنبھالنے کیلئے میز کا سارا لیا۔ ”تم مجھے پاگل نہ سمجھو وہ نوین ہی تھا۔ کیا میں اس کی آواز نہیں پہچانوں گی۔ پولیس اسٹیشن کا نمبر بتاؤ۔“

پولیس والے نے ہچکچاتے ہوئے نمبر بتایا۔ اسے ڈر تھا کہ چیف اس کی کھچائی کریں گے فون پر اس کی ڈیوٹی تھی۔

سادھنا نے نمبر ملایا۔ دوسری طرف ہیڈ مرر نے فون ریسو کیا۔ سادھنا اس سے بات کرنے والی تھی کہ رابطہ منقطع ہو گیا۔ ”فون ڈیڈ ہو گیا ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

پولیس والے نے ریسور سے کان لگا کر سنا اور بولا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

”تم مجھے پولیس اسٹیشن لے چلو۔ نہیں۔ ایسا کہو تم چلے جاؤ کیا پتا فون ٹھیک ہو جائے اور نوین مجھے فون کرے۔ تم چیف کو جاکر بتاؤ کہ نوین نے فون کیا تھا۔ تم تھکے جاؤ ہم یہیں رہیں گے۔“ سادھنا نے کہا۔

”لیکن میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“ پولیس والا گھبرا گیا۔

”پلیز۔ دیکھو قائدہ دور نہیں اور تمہارے پاس گاڑی بھی ہے۔ تم پانچ منٹ میں جاؤ گے اور پانچ منٹ میں آؤ گے۔ دس منٹ لگیں گے۔ پلیز۔“

پولیس والا سوچتا رہا۔ چیف نے اسے یہاں رکھنے کو کہا تھا لیکن اگر بچے نے فون کیا ہے اور اس نے چیف کو اطلاع نہیں دی تو چیف اس پر غصے ہو گا۔ اس نے

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور ہیڈ مرر لپکا ہوا آیا۔ ”چیف میرا خیال ہے“ آپ باہر بیٹھے ہوئے لوگوں سے بات کر لیں۔ ان کے پاس آپ کیلئے بہت اہم اطلاعات ہیں۔“



سادھنا نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ بھگوان۔ نہیں۔ وہ بڑبڑاتی تھی۔ اس بار بھی وہی کچھ نہ ہونے دینا بھگوان۔

وہ کپڑے بدل کر تیزی سے پہنچ آئی۔ وہاں گمشدہ ڈانٹک روم میں سینڈویچ اور کافی کا پائ لے اس کا منتظر تھا۔ ”سنو سادھنا“ بیٹھو اور کچھ کھا لو۔ یہ ضروری ہے۔“

”مجھے چیف دیال سے ملنا ہے۔“ سادھنا نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

”مجھے اس کو ایک اہم بات بتانی ہے۔“ اس کی آواز میں ہلکا سی کیفیت ابھر رہی تھی۔ وہ فون کی ڈیوٹی پر موجود پولیس والے کی طرف مڑی جو دروازے میں کھڑا تھا۔

”پولیس اسٹیشن فون کر رہی۔“ نہیں، میں خود کرتی ہوں۔“ وہ فون کی طرف لپکی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ریسور اضافی فون کی کھنٹی بجی۔ اس نے ریسور اٹھا لیا۔ ”ہیلو۔“

اس نے کہا۔

دوسری طرف سے دلی دلی سی آواز ابھری۔ ”ممی۔ ممی۔ پلیز آجائیں اور ہمیں یہاں سے لے جائیں۔ اری کی طبیعت خراب ہے۔“

”نوین۔“ وہ ماتحتہ بیس میں چلائی۔ ”نوین، تم کہاں ہو؟“

”ہم۔“ نوین کی آواز اچانک دھنک گئی۔ لائن بے جان ہو گئی۔

اس نے فون کو جھنجھوڑ ڈالا۔ ”آپرینر۔“ وہ دیوانہ وار چلائی لیکن رابطہ نوٹ چکا تھا۔

”کیا بات ہے سادھنا؟“ گمشدہ اس کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔

”یہ نوین کا فون تھا۔ اس نے کہا کہ اری کی طبیعت خراب ہے۔“

”دیکھو۔“ وہ دیکھ کر بے چین ہو گیا۔

سادھتا نے اس سے دستاں بھپٹ لیا۔ ”یہ۔ یہ تمہیں کہاں سے ملا؟“
 ”میتا تو رہا ہوں شانتی ہاؤس کے گیران سے۔ آج میں ایک گاہک کو مکان
 دکھانے وہاں لے کر گیا تھا۔“

”شانتی ہاؤس جہاں وہ جسونت رہتا ہے۔ میں نے اسے ایک بار دیکھا تھا
 اور وہ بھی دور سے۔ ارے۔ نہیں۔ نہیں۔“ ایک لمحے میں سادھتا کی سمجھ میں
 سب کچھ آ گیا۔ بالکل صاف اور واضح اگرچہ وہ دیر سے سمجھتی تھی۔ ”سنو گھٹام میں
 شانتی ہاؤس جا رہی ہوں ممکن ہے“ ابھی دیر نہ ہوئی ہو۔ تم پولیس اسٹیشن جاؤ اور
 اجیت کو اور پولیس کو لے کر آؤ۔ میں مکان میں داخل ہو سکتی ہوں۔“

”میں شانتی ہاؤس چلا جاتا ہوں۔“
 ”نہیں۔ میں جاؤں گی۔“ سادھتا کا لہجہ ہشٹائی تھا۔ ”تم میرے سوال کا جواب
 دو میں مکان میں داخل ہو سکتی ہوں؟“

گھٹام کو اندازہ ہو گیا کہ اس کیفیت میں سادھتا سے بحث کرنا بے سود ہو گا۔
 ”میرے پاس سامنے کے دروازے کی چابی ہے۔“ اس نے جیب سے چابیوں کا کچھا
 نکالا۔ ”یہ شانتی ہاؤس کی چابیاں ہیں۔“

سادھتا نے چابیاں لیں اور عقبی دروازے کی طرف لپکی۔ گھٹام اس کے پیچھے
 تھا۔ سادھتا اپنی کار میں بیٹھی اور گھٹام نے اپنی ہانگ اشارت کی۔

برف باری تیز ہو رہی تھی۔ اس میں دیکھنا مشکل تھا لیکن سادھتا پوری رفتار
 سے گاڑی چلا رہی تھی۔ پانچ منٹ بعد وہ اس پہاڑی سڑک پر پہنچ گئی جو شانتی ہاؤس
 کی طرف جاتی تھی۔ برف کی دج سے سرک خطرناک ہو رہی تھی۔ گاڑی پھسل بھی
 رہی تھی۔ اور۔ نظر بھی کم ہی آ رہا تھا۔

وہ درخت سادھتا کو آخری لمحے میں نظر آیا جب گاڑی اس کے بہت قریب پہنچ
 چکی تھی۔ سادھتا نے اسٹیرنگ کا پھر بھی گاڑی درخت سے ٹکرائی۔

سادھتا گاڑی سے اتری اور پیدل ہی چڑھائی کی طرف لپکی۔ گاڑی پر وقت
 ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔

وہ پورچ تک پہنچی تو اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر گئی۔ اس کے گھٹنے میں درد کی

سوچا، یہ کام گھٹام کے سپرد کر دے اور خود میاں رکا رہے لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔
 بات دسے داری کی تھی اور جب فون ہی ڈیڈ ہو گیا تو اسے اپنی دسے داری پوری
 کرنے کیلئے خود ہی جانا ہو گا۔

”ٹھیک ہے“ میں جاتا ہوں۔ آپ دونوں یہیں رہیے گا۔“ اس نے کہا اور
 عقبی دروازے کی طرف لپکا۔

سادھتا نے کہا۔ ”گھٹام بھائی، نوین کو پتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ تاتے ہی والا
 تھا کہ لائن کٹ گئی۔ اب سوچو، وہ کسی سڑک پر تو نہیں ہو گا۔ وہ باہر نہیں ہے۔
 کاش۔ کسی طرح پتہ چل جائے۔ اندازہ ہی ہو جائے۔“

گھٹام اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔ اسے تو
 سادھتا کی دماغی صحت پر شبہ ہو رہا تھا۔

”اور نوین نے کہا کہ اری کی طبیعت خراب ہے۔ آج میں اسے باہر بھی نہیں
 جانے دینا چاہتی تھی لیکن پھر میں نے سوچا، اُدھا گھٹہ کھیلے دیا جائے کیا حرج ہے سو
 میں نے اسے سرخ دستاں پہنا دیے۔ وہ والے جن پر مسکراتا ہوا چہرہ ہے اور میں
 نے کہا۔ دستاں مت اتارنا۔ سڑی بہ تے مجھے یاد ہے، اس وقت میں نے سوچا تھا
 کہ شکر ہے آج اس کے پاس ایک جیسے دستاں کی جوڑی موجود ہے۔ لیکن جب میں
 انہیں ڈھونڈنے لگی تو ایک دستاں مجھے جھوٹے کی رسی سے الجھا ہوا ملا۔ ہائے۔ اب
 میں سوچتی ہوں، کاش میں نے انہیں باہر نہیں جانے دیا ہوتا۔“

اس نے گھٹام کے چہرے کو نہیں دیکھا جو بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ ”کیا کہہ
 رہی ہو تم سادھتا؟ میں تو سمجھا تھا کہ مسکراتے ہوئے چہرے والا ایک ہی دستاں ہے
 تمہارے پاس۔“

”ایک ہی قہار کل رات دو سرائی مل گیا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔“ گھٹام اچانک پھٹ پڑا۔ ”جھگوان“ میں بھی
 کتنا احمق ہوں۔“ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو سرائی نکال لیا۔ ”یہ
 مجھے شانتی ہاؤس کے گیران میں پڑا ملا اور میں نے سمجھا کہ یہ میری کار میں سے گرا
 ہے لیکن اگر آج دونوں دستاں موجود تھے تو یہ ممکن نہیں۔ اور وہ منحوس آدمی۔“

اس شخص نے پلٹ کر دیکھا تب سادھنا کو ارملہ بیٹہ پر پڑی دکھائی دی۔
ایک لمحے کو وہ شخص خانے میں آیا مگر فوراً ہی اس کے چہرے پر خفاست بکھر گئی۔ ”تم۔۔؟“ وہ جارحانہ انداز سے سادھنا کی طرف بڑھا۔
سادھنا کو اپنی کلائی پر اس کی گرفت محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے جھٹکا دے کر خود کو چھڑایا اور بیٹہ کی طرف لپکی۔ وہ فوین کے سر کو پلانک کے ٹیک سے ٹکرائے کی کوشش کر رہی تھی۔ فوین کے زخاں نیلے ہو رہے تھے۔ اسے اس کی سانسوں کی پشکار سنائی دی تو وہ مڑی۔ اشیش اس پر حملہ آور ہو رہا تھا۔
اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کا پاؤں ارملہ کے جسم سے ٹکرایا۔
ارملہ کے جسم میں حرکت تھی۔ وہ زندہ تھی۔
وہ بلا ارادہ چیختے لگی۔ وہ دھوکیلے بیچ رہی تھی۔ اشیش کا ہاتھ اس کے منہ پر آ جتا۔ وہ اس کی ٹانگ بھی دبا رہا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

اسی وقت ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ اس کو پسند اگ گیا۔ وہ سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی مگر سانس اس کے سینے میں نہیں ساری تھی۔ اس عالم میں بھی اسے احساس تھا کہ کوئی اس کا کام لے کر اسے پکار رہا ہے۔ شاید وہ اجبت کی آواز تھی۔ یقیناً وہ اجبت تھا۔ اس نے جواب میں اسے پکارنا چاہا لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ نکل ہی نہیں سکتی تھی۔
”می۔۔ می۔۔“ وہ اری کے لے کر جا رہا ہے۔“ فوین چلایا۔ وہ اسے جھنجھوڑ بھی رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھی۔ اشیش ارملہ کو اٹھا کر اس کے قریب سے گزر رہا تھا اور ارملہ رو رہی تھی۔

”اے چھوڑ دو اشیش۔ تم اسے چھوٹا بھی نہیں۔“
جواب میں اشیش نے اسے خون خوار نظروں سے دیکھا اور ارملہ کو اٹھائے ہوئے ساتھ والے تاریک کمرے کی طرف بڑھا۔
وہ اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے پیچھے چلی۔ وہ آنکھوں کے سامنے چھانے ہوئے اندھیرے کو جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ادھر بیڑھیوں پر کسی کے اوپر

لراٹھی مگر اس نے اسے نظر انداز کر دیا اور داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔ سن انگلیوں سے اس نے چابی ٹٹولی اور اسے دروازے میں لگایا۔ پہلے تو آتے نے مزاحمت کی۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ اس نے غلط چابی لگائی ہے مگر اسی لمحے چابی گھومی اور رنگ آلود تالا کھل گیا۔

اس نے دروازے کو دھکیل کر کھولا۔
اندھ اندھیرا تھا۔ اور موت کی سی خاموشی۔ وہ بیچ کر نوین کو پکارنا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔
گھنٹام نے بتایا تھا کہ وہاں دو زینے تھے۔ ایک سامنے اور دوسرا عقبی سمت۔ دونوں زینے ہال میں تھے۔ وہ بڑی بے یقینی کے ساتھ آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے۔ تاریکی ایسی تھی کہ اسے اپنے ہاتھ بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

وہ زینے تک پہنچی۔ اس نے اپنے سلیپر اتار دیے۔ وہ سکیے ہو رہے تھے جس کے نتیجے میں شور ہو سکتا تھا۔

ہر زینے میں تین فلائش تھے۔ پہلا زینہ چمکنے کے بعد وہ رکی۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ سامنے کھلا ہوا دروازہ تھا مگر اسے واضح طور پر نوین کی آواز سنائی دی۔ ”اے۔۔ یہ مت کرو۔ دور ہو۔“ آواز اوپر سے آئی تھی۔

وہ تیزی سے بیڑھیاں چمکنے لگی۔ وہ اپنی تسکین اور کمزوری بھی بھول گئی تھی۔ اوپر پہنچ کر وہ ہچکچائی۔ ہال میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ اب ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ محتاط انداز میں ڈرائنگ روم سے گزرتی ہوئی بیڈ روم کی طرف بڑھی۔ وہاں موسم خلی کی روشنی تھی۔

اسے ایک شخص نظر آیا۔ اس کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے بیڈ پر پڑے وجود کو سنبھال رہا تھا جو ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ ایک ننھے سے سر پر پلانک کا شاپر چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
سادھنا کو نوین کی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ چلائی۔ ”اے چھوڑ دو اشیش۔“ اسے خود بھی بعد میں احساس ہوا کہ اس نے کس کا نام لیا ہے۔

آتے ہوئے قدموں کی چاپ بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اندھیرے میں اشیش کو دیکھنے کی کوشش کی پھر کھڑکی کے سامنے اسے اس کا ہیولا نظر آیا۔ وہ بالا خانے کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

”اجبت۔ اوپر۔ وہ اوپر جا رہا ہے۔“ بالا خرا سے اپنی کھوٹی ہوئی آواز مل گئی۔ پھر وہ بھی اشیش کے پیچھے بالا خانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اشیش اس بالکونی کی طرف جا رہا تھا جہاں سے جمیل کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ تنگ بالکونی بے حد کزور اور محسوس تھی۔ ”اشیش“ وہاں مت جاؤ۔ واپس آ جاؤ۔“ وہ چلائی۔ ”یہ جگہ بہت خطرناک ہے۔“

اشیش آخری سیڑھی پر تھا۔ اس نے بالا خانے کی طرف کھلنے والے دروازے کو دھکیلا۔ ارطا خوف زدہ ہو کر بری طرح رو رہی تھی اور اسے پکار رہی تھی۔ ”می۔ می۔“

اشیش دروازے سے گزرا۔ وہ بالکونی کی طرف جا رہا تھا۔ سادھنا وجود کی پوری قوت جمیع کر کے اس کے پیچھے دوڑی۔ بالکونی کی ریٹک بہت نیچے تھی۔ سادھنا نے اشیش کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی۔ اسے ڈر تھا کہ ارطا نہ مگر جائے۔ ”اشیش“ رک جاؤ اشیش۔“ وہ چلائی۔

اشیش کے چہرے سے برف کے ذرات ٹکرا رہے تھے۔ وہ پلٹا اور اس نے سادھنا کو لات مارنے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھاتا ہوا پیچھے کی طرف ہٹا۔ اسے خود پر قابو نہیں تھا لیکن اس نے ارطا کو مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ لڑکھاتا ہوا ریٹک سے ٹکرایا اور اسے خود کو سنبھالنے کا موقع مل گیا۔ اس کی سانسیں اکڑی اکڑی تھیں مگر وہ اس عالم میں بھی ٹوٹے ٹوٹے ہدایتی حقے لگا رہا تھا۔

اب وہ ارطا کو ریٹک سے ٹکائے کھڑا تھا۔ ”آگے مت آنا۔ ورنہ میں بنی کو نیچے پھینک دوں گا۔“ اس نے سادھنا سے کہا۔ ”ان لوگوں سے کہو کہ واپس جائیں۔ ان سے کہہ دو کہ مجھے چھوٹنے کی بھی کوشش نہ کریں۔“

”تم ارطا کو مجھے دے دو میں تمہاری مدد کروں گی۔“ سادھنا کڑوا رہی تھی۔

”میں انہیں سمجھاؤں گی کہ تمہارے ساتھ نفسیاتی مسائل ہیں تم بیمار ہو۔“

”تم میری مدد نہیں کرو گی۔ تم تو چاہو گی کہ وہ مجھے تباہ کر دیں۔“ وہ ایک قدم اور ریٹک کی طرف بڑھا۔

”نہیں اشیش۔ یہ غلطی مت کرو۔ تمہیں تو پانی سے خوف آتا ہے تم پانی کے اندر اپنا سر گوارا ہی نہیں کر سکتے۔ جب تمہاری لاش برآمد نہیں ہوئی تو مجھے اسی وقت سمجھ لیتا چاہیے تھا کہ تم نے خودکشی نہیں کی ہے تم خود کو کبھی ڈبو نہیں سکتے مگر مجھے یہ بات یاد ہی نہیں رہی تھی۔“

اسی وقت اسے سینے کی آواز سنائی دی۔ ریٹک نوٹ رہی تھی۔ اشیش کا سر پیچھے کھینچ کر، طرف گیا۔ اس کے ہاتھ آگے کی طرف بڑھے۔ ارطا اس کے ہاتھ سے چھوٹی۔ سادھنا تیزی سے جھپٹی۔ اس کے ہاتھ میں ارطا کے بال آ گئے۔ اس نے مضبوطی سے پکڑ کر پکڑ لیا۔ اسی لمحے پیچھے کی طرف گرتے ہوئے اشیش نے چیخے ہوئے اس کی ٹانگ تھام لی۔

اسی لمحے دو مضبوط بازوؤں نے پیچھے سے سادھنا کو پکڑ لیا۔ گرفت بہت مضبوط تھی بھران مہیاں ہاتھوں نے ارطا سمیت اسے پیچھے کھینچ لیا۔

سادھنا اجبت سے لپٹی کھڑی تھی۔ اشیش کا بھاری بھرکم وجود ٹوٹی ہوئی ریٹک سے گزرتا دکھائی دیا اور پھر غائب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے پانی میں چمپا کے کی آواز سنائی دی۔

ڈراؤنا خواب ختم ہو گیا تھا۔



اسے اخبار نویسوں کو دینا تھا۔

پروفیسر اشیش کمار عرف جسونت کو پانی سے زندہ نکال لیا گیا تھا لیکن اس کی حالت بہت تباہ تھی۔ مرنے سے پہلے بہر حال اس نے اعتراف کر لیا کہ اپنے بچوں کو اس نے ہی قتل کیا تھا۔ اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ چودہ سال پہلے ساوہتا کی ماں انوراہا کی موت میں بھی اس کا ہی ہاتھ تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ انوراہا ساوہتا سے اس کی شادی نہیں ہونے دے گی۔ جس وقت انوراہا ریسٹورنٹ میں ساوہتا کے ساتھ تھی، اس نے جا کر اس کی گاڑی کے اسٹیرنگ میں گڑبڑ کر دی تھی۔

ہزاری لال اسپتال میں تھا۔ اس کا سر پھٹا تھا مگر اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ڈاکٹروں نے نوین اور ارملہ کا معائنہ کیا تھا۔ ان کے ساتھ کوئی جینی زیادتی نہیں کی گئی تھی۔ نوین کے رخسار پر نسل تھا جو اشیش کے تھپڑ کی نشانی تھا۔

چیف دیال کو لگ رہا تھا کہ تحسُن اس کی ہڈیوں تک میں اتر گئی ہے اور وہ شرمندہ تھا کہ اس نے اپنے تجربے کے باوجود ساوہتا کو سمجھنے میں غلطی کی۔ صرف اس لیے کہ وہ اس کی اصل کو نہیں پہچان سکا تھا اور وہ اپنے موقف پر اس طرح ڈٹ گیا تھا کہ اس نے کسی کی بھی نہیں سنی۔۔۔ نہ ساوہتا کی نہ اجیت کی اور نہ ڈاکٹر ایثور لال کی۔

گھنٹام نے کرن سے کافی کو پوچھا۔

”کافی۔“ کرن نے پر خیال لیجے میں کہا۔ ”اس وقت تو کافی ضروری ہے۔“ اس نے گھنٹام کو غور سے دیکھا۔ ”آپ بھی لی پیس۔“ کہتے تھے ہوئے لگ رہے ہیں۔“ گھنٹام نے جواب میں کچھ نہیں کہا اس کے چہرے پر اداسی پھیل گئی۔ کرن کے لیجے میں اسے معذرت محسوس ہوئی تھی مگر یہ اس کا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ کرن اس اداسی کی وجہ سمجھ سکتی تھی۔ اس نے معذرت خواہانہ لیجے میں کہا۔ ”یہ دن ہی ایسا تھا۔ ہر شخص نے حقائق کو نظر انداز کر دیا۔ آج صبح میں نے سوچا تھا کہ اجیت سے پوچھوں گی کہ شانتی ہاؤس کے کرائے دار کی کڑی سے چمک سی کیوں نظر آتی ہے اگر اس بات کی چھان بین کر لی جاتی تو بات اتنی آگے نہیں بوہتی۔“

”ہو تا ہے۔ ایسا بھی ہو تا ہے۔“ چیف دیال نے کہا۔

آتش دان میں لکڑیاں بیچ رہی تھیں۔ کمر خوب گرم ہو رہا تھا۔ اور کافی کی مہک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ریٹا اور جارج اپنا اسٹور کھول کر ڈبل روٹی اور گوشت لے آئے تھے۔ جس وقت اجیت اور ساوہتا اسپتال میں بچوں کے پاس تھے وہ ان کے گھر میں سینڈویچ بنا رہے تھے۔ گھنٹام ان کے ساتھ تھا۔

وہ بچوں کے ساتھ گھرواپس آئے تو بی وی والوں نے بچوں کے ساتھ کار سے اترتے ہوئے ان کی قلم پٹائی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اگلے روز وہ انٹرویو دیں گے۔ ”مگر میں ان سب لوگوں کا شکریہ ضرور ادا کروں گا جن کی دعاؤں نے ہمارے بچوں کو نقصان پہنچنے سے بچایا۔“ اجیت نے مایک میں کہا۔

اب ساوہتا ارملہ کو پلٹائے ہوئے کاؤچ پر بیٹھی تھی۔ بچی کیل میں لپٹی ہوئی تھی اور سو رہی تھی۔

نوین اجیت کی گود میں تھا اور ایثور لال سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے لیجے میں فخر تھا۔ ”جب اچھے آدمی نے بیچ کر مجھ سے کہا کہ میں بھاگ جاؤں اور مدد لے کر آؤں تو میں وہاں سے نہیں نکلا۔ وہ دونوں لڑ رہے تھے۔ میں اوپر ادری کے پاس گیا۔ وہاں سے میں نے می کو فون کیا مگر پھر فوراً ہی فون خراب ہو گیا۔ اور برا آدمی آ گیا۔“

”تم بڑے زبردست بیچے ہو۔“ اجیت نے کہا۔ اس کی نگاہیں ساوہتا اور ارملہ کے چہروں سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ ساوہتا کے چہرے سے پریشانی وصل گئی تھی اور وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔

چیف دیال نے کافی کی پیالی خالی کر کے رکھی اور اس بیان کا جائزہ لینے لگا جو

”مگر تم نے اہم کام کیا۔“ کرن نے گھٹشام سے کہا۔ ”اگر تم اس خریدار کو شانی ہاؤس دکھانے نہ لے جاتے تو ایشیش کمار ڈسٹرب نہ ہوتا اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے شیطانی منصوبے پر عمل کر گزرتا۔“

گھٹشام کے چہرے پر پہلی بار طمانیت ابھری۔ ”شکریہ کرن۔ ورنہ مجھے تو احساس جرم ستا رہا تھا۔ مجھے دستانے کے متعلق سادھنا کو فوراً ہی بتا دینا چاہیے تھا۔“

”ابھی مجھے موٹر سائیکل پر گھر چھوڑ دو گے؟“ کرن کی نگاہوں میں دعوت تھی۔

”ضرور۔“ گھٹشام کی نگاہوں میں وعدہ تھا۔ خوشی تھی۔ اس نے سوچا، ”آن وہ کرن سے کھل کر بات کر لے گا۔“

سادھنا سوچ رہی تھی وہ مطمئن تھی کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ بہت بڑی بات تھی کہ اس کا ماضی درست ہو گیا تھا۔ اب اسے دنیا سے چھپنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ قید سخت سے آزاد ہو گئی تھی۔ اس نے ارملہ کو سینے سے بٹھپتے ہوئے نوین کی طرف دیکھا جو اجیت سے لپٹا بیٹھا تھا۔

”مئی۔“ نوین نے مندا سی آواز میں کہا۔ ”میں آپ کا جنم دن کا تحفہ تو لایا تھا۔“

”نہیں۔“

”تم فکر نہ کرو بیٹے۔“ اجیت نے اسے دلاسا دیا۔ ”ہم مئی کا جنم دن منائیں گے اور مجھے معلوم ہے کہ تمہاری مئی کیلئے کون سے تحفے مناسب ہیں۔“

”ابا کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ اب وہ سادھنا کو دیکھ رہا تھا۔ ”اب تم اپنی مئی بالوں کا اصل رنگ دیکھ لیتا اور اب تمہاری مئی بہت اچھی تصویریں بنائیں گی۔“

لیکن نوین سوچا تھا اور سادھنا اور اجیت جاگ رہے تھے۔

ختم شد